ہر گھر کی زینت
ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی
December
2016
☆ نامور مصنفہ 'رفعت سراج' کا شاہکار ناول 'دامِ دل' اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

بانی
سہام مرزا

ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی

مدیرِ اعلیٰ ____ منزہ سہام
مدیر ____ زین شمسی
قانونی مشیر ____ جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)
انکم ٹیکس ایڈوائزر ____ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا
88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابان
جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7 کراچی
فون نمبر: 35893122 - 021-35893121
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

دسمبر 2016ء
جلد: 44 ☆ شمارہ: 12
قیمت: 60 روپے

☆ منیجر سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا / مرزا محمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

منی ناول

ناولٹ

مکمل ناول

افسانے

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی
Phone : 021-35893121 - 35893122
Email : pearlpublications@hotmail.com

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافاتِ جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز: 88-C II فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز-7، کراچی
فون نمبرز: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

الوداع 2016ء

اور 2016 بھی گزر گیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی اپنا بہت قریبی گزر جائے تو انسان تہی داماں رہ جاتا ہے اور اشک آنکھوں میں مستقل گھر کر لیتے ہیں۔ اسی طرح یہ سال بھی روتے اور رلاتے گزر ہی گیا۔ اگر بحثیت پاکستانی میں سوچوں کہ گزرنے والے سال میں کیا کھویا اور کیا پایا تو صرف خسارہ ہی محسوس ہوتا ہے۔ اگر بحثیت انسان اور مسلمان اپنا جائزہ لوں تب بھی رپورٹ کارڈ زندگی کے ہر مضمون میں لال روشنائی کی بھرمار ہی دکھاتی ہے۔ ہر طرح الٹ پلٹ کر دیکھ لیا مگر آخر میں نتیجہ وہی صفر' ناکامی اور مایوسی کی شکل میں منہ چڑاتا نظر آیا۔ اسلامی سال کی ابتداء میں بھی وہی اور انگریزی سال کا اختتام بھی وہی کرب' جھنجلاہٹ اور افراتفری...... لیکن ان تمام کلیجہ چیرتی سچائیوں کے باوجود ایک سچ ایسا بھی ہے جو بڑی تقویت دیتا ہے۔ آگے بڑھنے کی امید اور سب اچھا ہونے کی نوید سناتا ہے اور وہ 'سچ' ہے اپنے گناہوں، اپنی خامیوں کے باوجود رب کائنات پر یقین کہ وہ ہم پر بھی نظر کرم فرمائے گا۔ ہماری خطاؤں' ہمارے گناہوں کو معاف فرما کر ہمیں اپنے مقرب بندوں میں شامل کرے گا تب ایک نئی صبح نمودار ہوگی جس میں سورج کے مشرق سے اُگتے ہی چڑیوں کی چہچہاہٹ ہر سو ہوگی، سر پر نیلا آسمان ایستادہ ہوگا اور پیروں کے نیچے مخملی زمین بچھی ہوگی۔ چاروں جانب رنگ برنگے خوشنما پھول ہوں گے اور سارا عالم اُن کی مہک سے معطر ہو رہا ہوگا۔ میرے وطن کی ہر صبح اب ایسی ہی ہوگی۔ چاند کی چاندنی میں ہر شے نہا رہی ہوگی اور اس منظر کو دیکھنے کے لیے جو جہاں چاہے گا ٹھہر جائے گا۔ بلا خوف و خطر...... اپنے سائے سے بھی ڈر محسوس نہیں ہوگا۔ اس یقین کے ساتھ کہ 2017ء اور اس کے بعد آنے والے تمام سال ایسے ہی دلنشین اور دلفریب ہوں گے۔ آیئے مل کر 2016ء کو الوداع کہتے ہیں۔

منزہ سہام

الوداع...... الوداع...... 2016ء الوداع۔

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت
رابطوں کی دلفریب محفل

مدیرِ اعلیٰ

دوشیزہ کی محفل میں آپ سب کو خوش آمدید کہتی ہوں...... یہ شمارہ 2016ء کا آخری شمارہ ہے اب انشاء اللہ 2017ء میں آپ سے اس محفل میں ملاقات ہوگی اس دعا کے ساتھ کہ اللہ 2017ء اور اس کے بعد آنے والے تمام سالوں کو تمام انسانوں کے لیے محفوظ بنائے' ہر آنے والا دن خوشیوں سے پُر ہو اور کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو...... یہ ایک سال کس تیزی سے گزرا پتہ ہی نہیں چلا بلکہ سچ پوچھیں تو کچھ خوف بھی محسوس ہوا کہ سرمایہ زندگی میں سے ایک سال اور کم ہوا۔ بہر حال یہی حقیقت ہے۔ آپ لوگوں نے جس طرح میری محنت کو سراہا اور خامیوں کی نشاندہی کی اس پر میں سب کی بہت ممنون ہوں اور یقین کرتی ہوں کہ یہ تعاون آئندہ بھی جاری رہے گا۔ آیئے اب بڑھتے ہیں اپنے پہلے خط کی جانب کراچی سے تشریف لائی ہیں دوشیزہ کی سابقہ ایڈیٹر غزالہ رشید لکھتی ہیں ڈیئر منزہ سہام' السلام علیکم! امید ہے یہ خط تمہاری مصروفیات میں سے اپنے لیے لمحہ خود ہی نکال لے گا' اسے یہ فن آتا ہے دنیادار ہوگیا ہے۔ افسانہ لکھنے کا وقت تو تھا موڈ نہیں تھا جو تمہاری فرمائش نے بنا دیا۔ گھر کی مصروفیات اچھی تو لگتی ہیں مگر گمشدہ کر دیتی ہیں ناں خود کو بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے' مہمان رخصت ہوئے تو قلم بھی ساتھ رخصت ہونے لگا تھا کہ تم نے پکارا اور پھر دیکھو یاد کے موسم کو تحریر کرنے کا سارا سہرا تمہارے سر سروائیکل کی وجہ سے کمپوزنگ کرنے کا شوق بھی ختم ہوتا جا رہا ہے اور لکھنے کا۔ تم سے قریب ہر شخص کو سلام' دعا' یاد رکھنے کے لیے شکریہ بلکہ بہت شکریہ یہ ایک شعر ہمیشہ دسمبر سے یاد آتا ہے جانتی ہوں تمہیں اشعار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن مسکراؤ گی تو ناں...... بس کافی ہے۔

ذرا دیر دسمبر کی دھوپ میں بیٹھیں
یہ فرصتیں ہمیں شاید نہ اگلے سال ملیں

ﷲ: پیاری سی غزالہ! مجھے پتہ ہے آپ کو سابقہ کا لاحقہ اچھا نہیں لگے گا مگر جانتی ہیں نا میری مجبوری ہے پیش بندیاں کرنے کی عادت ہے مجھے...... افسانہ بھیجنے کا شکریہ اور جناب میری کیا جرأت کہ آپ کے افسانے کا نام تبدیل کروں ویسے آپ نے یہ راز عیاں کر دیا کہ مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں اور

اس بات کی سچائی کی گواہی عقیلہ حق سے لیجیے گا جب میں اور وہ ایک محفل میں موجود تھے۔ اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی...... غزالہ محفل میں شرکت کرتی رہا کریں۔ قلمکار کا قلم ہی تو اُس کا کل اثاثہ ہوتا ہے۔ خوش رہیے۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں ہم سب کی سنبل لکھتی ہیں' کیسی ہو' انشاء اللہ خوش باش ہو گی میری طرف سے تمام اسٹاف اور قارئین کو سلام' اور زین اور دانیال کو پیار' اقبال صاحب سے بھی ایک بہت بڑی شکایت ہے دو مہینے سچی کہانیاں ملتا ہے اور چار مہینے کے لیے غائب بتاؤ تبصرہ کیسے کروں' منزہ آپ نے محفل میں پکارا اور ہم نہ آئیں ایسے تو حالات نہیں۔ خولہ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے محفل میں میری غیر حاضری کو محسوس کیا۔ بس کبھی کبھی مصروفیات ایسے گھیر لیتی ہیں کہ ہم چاہ کر بھی ان سے دامن چھڑا نہیں پاتے ہیں۔ غیر حاضری کے دوران حالانکہ بہت دل دکھا دینے والی خبریں نظر سے گزریں جن میں مینا تاج کا جانا بھی شامل ہے۔ مینا سے میری صرف دو ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں ایک لاسٹ ایوارڈ کی تقریب میں اور ایک سچی کہانیاں کے ظہرانے میں' مینا بہت زندہ دل خاتون تھیں اور مجھے تو اُن کے بیٹے کا سوچ کر تکلیف ہوتی ہے میٹرک کا اسٹوڈنٹ تو ابھی خواب دیکھنا شروع ہی کرتا ہے اور اس عمر میں ماں جیسی محبت وشفقت کا ہٹ جانا اللہ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام اور لواحقین کو صبر عطا کرے (آمین) رضوانہ کوثر اور رضوانہ پرنس سے کہو کہ میسج اور FB پر تعزیت کر لی تھی مگر محفل میں بھی بتا رہی ہوں مجھے بہت دکھ ہے آپ دونوں کے بھائی بہن کا اللہ آپ کو صبر اور مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ اب آتے ہیں دوشیزہ کی طرف دوشیزہ میں (ٹائٹل کی) دوشیزگی کچھ کم تھی۔ آپ کا اداریہ لاجواب تھا واقعی خواب اور امید تو زندگی ہیں۔ ارے ہاں' منزہ یاد دلایا Hi Tea کا احوال دوبارہ لکھ کر بھیجا دونوں بار ہی ندارد' باقی خط لگ جاتے ہیں یہ بتاؤ ڈاکیہ کو یہ کون بتاتا ہے کہ اس میں Hi Tea کا احوال ہے کہ وہ مزے لینے بیٹھ جاتا ہے اس بار محفل میں کافی بھولے بسرے پیارے موجود تھے اچھا لگا۔ لائف بوائے اچھے بال سنوار رہا ہے اسماء اعوان کے ساتھ' دام دل تو ابتدا سے ہی میلہ لوٹ رہا ہے درِدانہ کا افسانہ اچھا تھا مگر ڈرامہ اگر حقیقت ہوتا تو مزہ آ جاتا۔ اپنے ناول کے لیے سب کی آراء کا انتظار ہے۔ نگہت جی واہ کیا دکھ بیان کیا ہے یہ تو عورت کا سب سے بڑا دکھ ہے۔ کافی بہتری کی گنجائش تھی۔ حبیبہ کا ناولٹ اچھا تھا یہ بچے سمجھتے نہیں کہ ماں باپ کسی بات کو منع کریں تو اس میں بہتری ہوتی ہے۔ آگہی اچھا افسانہ تھا واقعی مارننگ شوز اور کچھ سکھائیں نہ سکھائیں بدتمیزی کرنا خوب سکھاتے ہیں آسیہ نے مرد کی بے وفائی اور عورت کے جذبات پر خوب لکھا۔ مریم سمیہ کا ناولٹ بھی محبت کی شدتوں پر اچھا ناولٹ تھا۔ نسرین اختر کا ناول اچھا چل رہا ہے مکمل تبصرہ اختتام تک گگن کے پار بہت خوبصورت دل پر اثر کرنے والی تحریر تھی۔ ابھی امکان باقی ہے گو کہ ابھی ابتدا ہے مگر کہانی کی اٹھان اچھی ہے۔ دوشیزہ گلستان لاجواب تھا نئے لہجے نئی آوازیں میں شاعری اچھی ہو رہی ہے۔ ایک کہانی بہت پرانی تحریر ہاشمانی صاحب کی ہو اور مسکراہٹ لبوں کو نہ چھوئے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور سنائیں کیا حال احوال ہیں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ سچی کہانیاں ایوارڈ کی بھی بازگشت

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

نومبر 2016 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

"لگام" فرح اسلم قریشی

آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ — دسمبر 2016

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی
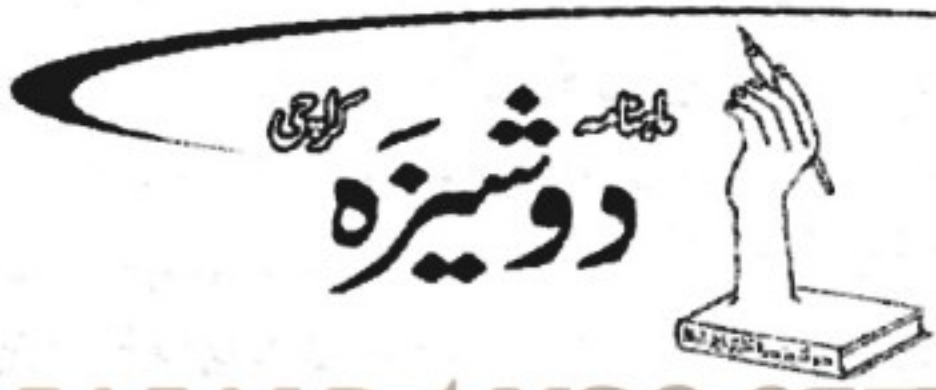
سنائی دے رہی ہے۔ مگر لاہور ' رخسانہ آنٹی کیسی ہیں ' منزہ کیا مجھے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ میری کتنی تحریریں ابھی آپ کے پاس ہیں تا کہ میں مزید روانہ کرسکوں اگر معلوم ہو جائے تو مہربانی ہوگی باقی ہماری طرف اللہ کا شکر ہے خیریت ہے اور آپ سب کو اللہ اپنی حفظ و امان و عافیت میں رکھے اب اجازت دیں۔

پیاری سنبل! تمہارا یہ خط بھی تاخیر سے ملا نومبر کا شمارہ جا چکا تھا اور دسمبر میں بہت وقت تھا مگر میں نے سنبھال کر رکھ لیا اچھا ہوا تم نے وضاحت کردی کہ تم خط وقت پر لکھتی ہو مگر یہ ڈاکیہ ظالم سماج بن کر تمہارے اور دوشیزہ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اُس کا بھی کچھ حل نکالنا ہوگا۔ اقبال صاحب سے مجھے بھی بہت شکایات ہیں مگر تمہاری شکایت پر ان سے ضرور باز پرس کروں گی۔ سچی کہانیاں ایوارڈز لاہور میں کرنے جا رہے ہیں یہ کاشی کی خواہش تھی لہٰذا بوجھ بھی وہی اٹھا رہے ہیں دوسرے شہر میں جا کر تقریب کرنا اتنا سہل نہیں لیکن نئے نئے کام کرنے کا مزہ ہی اور ہے۔ بس جناب اس سے ذرا فرصت ملے تو پھر دوشیزہ ایوارڈ کی تیاری کریں گے۔ اور ہاں محفل میں آنے کے لیے پکار کا انتظار مت کیا کرو ایسے ہی آجایا کرو دل میں تو تم ہمیشہ رہتی ہو۔ ہاں سنبل تمہاری اب کوئی تحریر میرے پاس نہیں لہٰذا جلدی جلدی لکھو اور مجھے بھیج دو۔

⋈: کراچی سے تشریف لائی ہیں فرح اسلم قریشی لکھتی ہیں۔ اس ماہ کا اداریہ پڑھ کر نہ جانے کیوں سوچ نے یادوں کی انگلی تھامی اور محو سفر ہوگئی اور میں سوچنے لگی کہ مجھ جیسے ناقص الذہن لوگ جو ہر وقت اپنی کمزور یادداشت کا رونا روتے ہیں ان کے لیے بھی یاد سے بھول تک کا سفر ممکن نہیں ہوتا۔ ماضی بہت سی محرومیوں کے باوجود بہت دلکش ہوتا ہے۔ ہمیں نیم کا بوڑھا درخت اور اس کی چھاؤں تو یاد رہ جاتی ہے لیکن جھولا جھولنے میں لگنے والی چوٹ ہم بھول جاتے ہیں۔ ہیں ناں حیرت کی بات.......... بہر حال...... اس بے ربط فلسفے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اتنا پیارا اداریہ لکھنے پر تمہیں مبارکباد دے سکوں ' بچھڑے دوست ' حقیقتاً دل کو چھو گیا۔ دل کو تو اس بار ماہِ نومبر کے رسالے میں شامل تحریریں بھی چھو گئیں خاص طور پر اُم مریم کا ناولٹ ' رسم محبت ' بہت پیارا لگا اور اس کی ہیروئن حرم کا نام بھی۔ علی شیر کے دیہاتی انداز کا ناول کے اختتام تک اتنا انٹلیکچوئیل ہو جانا ذرا بھی برا نہیں لگا اور یہ صرف اور ام مریم کے اندازِ تحریر کی بدولت ہوا۔ اپنی مٹی سے دور رہنے والوں کے دل ہمیشہ مٹی سے جڑے رہتے ہیں پھر وہ مٹی وطن کی ہو یا بشر کی کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ پڑھ کر دل کو بڑا سکون حاصل ہوا ورنہ تو یہ ایک عام تاثر ہے کہ بیرون ملک پلنے والی بچیاں عموماً گاؤں ' دیہاتوں میں شادی کرنے سے گریزاں رہتی ہیں بڑے دلنشین انداز میں مریم نے کہانی کا اختتام کیا۔ دلنشین تو فرزانہ نگہت کی کہانی کا نام بھی تھا جو یقیناً بہت اچھی ہوتی اگر اس کا اختتام فلمی نہ ہوتا۔ گو کہ کہانی کے دوران کچھ شک تو ہو گیا تھا کہ دلنشین نے بدصورتی کا بہروپ دھرا ہے لیکن وہ ہی ازلی حقیقت پسندی ' آخر تک کسی مثبت اور قابل قبول تبدیلی کا انتظار ہی رہا۔ اچھی کوشش تھی اگر انداز فلمی نہ ہوتا۔ سکینہ فرخ نے بالکل درست لکھا ہے کہ کہانیاں ڈھونڈنا ' اور انہیں احاطہ تحریر میں لانا ایک فن ہے۔ بس لکھنے والے کو پتہ ہونا چاہیے کہ کیسے لکھنا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اظہار کی دلکشی تحریر کا

بس دعا چاہیے

محترمہ منزہ سہام کی بڑی ہمشیرہ ان دنوں امریکہ میں شدید علیل ہیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز اپنے قاری اور لکھاری ساتھیوں سے محترمہ رعنا قیصر صاحبہ کی صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل کرتا ہے۔

حسن بڑھا دیتی ہے اور مصنف کیسے کہوں کی طرح قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے جس میں وجاہت علی نے خوبصورت جذبے کو خوبصورت الفاظ میں وخیالات سے ہمکنار کر کے قاری کو خوش کر دیا۔ ویلڈن وجاہت علی...... محبتوں کی راہ گزر' اگر مہتاب خان کی تحریر کی طرح آسان ہو جائے تو دربدری نفرتوں کا مقدر بن جاتی ہے۔ ہر ایک کے زخموں کو پھول بننا نصیب نہیں ہوتا مگر مہتاب خان نے خوشیوں کے در کھولے جن سے گزرنا بہت اچھا لگا۔ خوشگوار اختتام طمانیت کا باعث بنتے ہیں ورنہ اس حقیقت سے کون آشنا نہیں کہ جیون ایک خواب سفر ہے۔ جس کی راہیں نادیہ کی طرح دشوار گزار لیکن منزل سمیرا غزل صدیقی جیسی پیاری مصنفہ آسان بنا دیتی ہے۔ تکلیف کے بعد راحت کا احساس آسودگی دے گیا۔ بہت اچھا افسانہ تھا لڑکیاں موم کی گڑیا ہوتی ہیں ذرا سی آنچ پر پگھل جانے والی جیسے حنا اصغر کی مینا کی گڑیا تھی نازک سی' جلدی سہم جانے والی لیکن وہی نازک سی لڑکی جب ماں بنتی ہے تو سیسہ پلائی دیوار کی مانند مضبوط ہو جاتی ہے اپنی اولاد کے لیے ایسا سائبان جس کے تلے آ کر اولاد بالخصوص بیٹیاں اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتی ہیں بہت اچھے حنا اصغر ماؤں کو اتنا پیارا سبق دینے پر شاباش کہ عورت شاید اپنی زندگی کے تمام مقدمات ہار سکتی ہے لیکن اولاد کے حقوق کا مقدمہ کبھی نہیں ہارتی۔ فاطمہ خان کی تحریر کی مرکزی کردار امامہ منصور کی طرح کی خواتین بھی ہوتی ہیں جنہیں زندگی ایسے محاذ پر شکست دیتی ہے جہاں انہیں ہار کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ مقدمہ میں فاطمہ خان نے ایسی ہی ایک عورت کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ بھی بہت اچھا لگا۔ اچھا لگتا ہے خولہ عرفان کی شاعری کو پڑھنا جس میں محبت کے اَن گنت جذبے پوشیدہ ہوتے ہیں اور اسی محبت کو اگر خراج نہ ملے تو پھر فصیحہ آصف کے دکھوں سے چور الفاظ دل میں اتر کر نڈھال کر دیتے ہیں اور انسان کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب تو بچا کچھ بھی نہیں ایسے میں کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ حساب چکانا ہے وہ بھی اس صورت میں جب زندگی سے آشنائی بھی نہ ہو عائشہ نور عاشا کا خوبصورت اور اچھوتا خیال دل میں اتر گیا اور پھر ہم زندگی کے بھید پانے کے لیے ماریہ یاسر کے ہم خیال ہو گئے۔ غرض نئے لہجے نئی آوازیں میں بھی اس مرتبہ کانٹے کا مقابلہ رہا زبردست ساتھیوں' باقی دیگر رائٹرز زمر نعیم' نسرین اختر' سنبل اور رفعت سراج کے لیے صرف اتنا کہنا ہے کہ آپ کی تحریروں پر تبصرہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ہم تو اُن متاثرین میں سے ہیں جو آپ لوگوں کا نام پڑھ کر ہی سیر ہو جاتے ہیں۔ زمر نعیم اپنی صحت کا خیال رکھو تمہاری خوبیدہ آنکھوں کا سحر میں ابھی تک بھولی نہیں ہوں خوش رہو۔

بھ: ڈیئر فرح! ادار یہ پسند کرنے کا شکریہ بہت خوبصورت بات کہی تم نے کہ ماضی بہت سی محرومیوں کے ساتھ بھی بہت دلکش ہوتا ہے ہم سب کو ہی ماضی میں رہنا اچھا لگتا ہے خوبصورت اور لااُبالی بچپن اور لڑکپن بھی تو اسی ماضی کا حصہ ہے جس کا کوئی مول نہیں...... تمہارا شکریہ ادا کروں گی کہ مصروفیت کے باوجود مجھے محفل میں شرکت کر کے مان دیتی ہو۔ مصنفین تک تمہاری تعریف پہنچ گئی اور اُن کی طرف سے میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔ زمر سے کچھ دن قبل بات ہوئی تھی طبیعت بہتر تھی یہ جان کر مجھے بھی اطمینان ہوا۔ میں تو اُس کی آنکھوں کو ہرنی کی آنکھوں سے تشبیہ دیتی ہوں...... ایک بار بہت قریب سے ہرنی کو دیکھا اور اُس کی آنکھیں دیکھتے ہی مجھے صرف زمر یاد آئی...... اللہ اُس کی تحریر اور اُس کی آنکھوں کی خوبصورتی ہمیشہ برقرار رکھے آمین۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں روحیلہ خان، لکھتی ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے جب قارئین اور رائٹرز ایک مصنف کی کاوش پڑھنے کے بعد تنقید کرتے ہیں۔ سنہری بٹوہ پر جو کچھ لکھا گیا اچھا لگا کسی نے نہایت معصومیت سے پوچھا تھا کہ رانی بھابی کا بٹوہ دینے کا کیا مقصد تھا؟ کیا بتائیں کہ سارے افسانے کا وزن ہی اس مقصد پر تھا لیکن بہت اچھا لگا۔ ایک بات اور بھی محسوس ہوئی کہ مارکیٹنگ اور پبلسٹی کے جنجال نے بیچارے ادب کو بھی نہ بخشا اب اس کی توجیح کیا دیں کہ سوال چھوڑ دینے کی بھی عادت پڑ گئی ہے معاشی اور سیاسی صورتحال میں اتنے سوال ابھرتے ہیں کہ مجھ سمیت بہت سے لوگ سوال پوچھنے کے عادی بن گئے ہیں۔ ڈرامہ لکھنے کی تحریک بچپن سے تھی لیکن کچھ احمقانہ قسم کی سوچوں نے اُسے لکھنے سے ترک کرنے کی تحریر بنا ڈالا تھا۔ لیکن پھر سوچا ناشکری ہے اور میں کون سی اتنی بڑی رائٹر ہوں لہٰذا اُس پر بھی پریکٹس چل رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ یا ناول لکھنے کا اپنا ایک مزہ ہے کہ لکھی ہوئی تحریر کے بھی لنکس مانگتے ہیں خاص کر کالم کے حوالے سے یہ وبا عام ہے۔ آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا تھا یہ آپ کی ہی محبت ہے کہ جس نے مجھے 'سیلن' لکھنے پر مجبور کیا کہ خالی خط سے خود میرا بھی پیٹ نہیں بھرتا۔ سچی بات ہے یہ ہے کہ محبت دل سے ابھرتی ہے انسان کا اثاثہ یہ ہی ہے۔ بہرحال عام لکھنے والوں اور قارئین اور آپ سب کو بہت پیار اور دعائیں کہ آپ سب سچی خوشیوں سے مسکراتے رہیں آمین۔

بھ: سویٹ روحیلہ! کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی ہی ملتے ہیں مگر وقت اور فاصلے اس تعلق کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے جو ان لوگوں سے جڑا ہوتا ہے۔ تمہارا اور میرا تعلق بھی ایسا ہی ہے تم سے فون پر بات کر کے بہت اچھا لگا اور اس پیار بھرے شکوے نے تو دل ہی خوش کر دیا بس رابطے میں رہا کرو۔ اور کبھی وقت نکال کر آفس ضرور آؤ مجھے بہت اچھا لگے گا۔ مجھے بھی وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جو افسانے کے ساتھ خط ضرور لکھتے ہیں۔ تمہارا افسانہ سالگرہ نمبر میں لگاؤں گی انشاءاللہ......

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں وہ خاتون جن کا آپ سب کو شدت سے انتظار رہتا ہے عقیلہ حق لکھتی ہیں میری بہت پیاری سی منزہ اور ساتھیوں، سہیلیوں، بہنوں السلام علیکم امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے دو تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضر ہوں۔ سوچ رہی تھی غائب ہوں گی تو لوگ پوچھیں گے عقیلہ حق، نا حق کہاں کھو گئیں لیکن بھئی ساری خوش فہمیاں ہوا میں اڑ گئیں کہ کس

نئے برس میں دوشیزہ اور آپ ساتھ ساتھ

دوشیزہ نے نئے سال کے موقع پر سروے مرتب کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس سروے میں آپ بھرپور انداز میں شرکت فرمائیں۔ جوابات کے ساتھ اپنی ایک عدد تصویر بھجوانا نہ بھولیں۔ اس سروے میں مصنفین اور قارئین سب شامل ہو سکتے ہیں۔ دوشیزہ اپنے محبت کرنے والوں کے ساتھ نئے سال میں قدم رکھنے کا خواہاں ہے۔ آپ بھی دوشیزہ سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے ان مزے دار سوالات کے جوابات ہمیں فوری طور پر ارسال کریں۔

1) ایسی کوئی خوشی جو آپ کو گزرے سال میں ملی ہو اور جس کا آپ نے برسوں انتظار کیا ہو؟

2) کیا 2016ء کو پچھلے کئی برسوں سے مختلف پایا؟

3) دوستوں اور رشتے داروں نے دکھ دیے یا خوشیاں؟

4) گزرے ہوئے سال سے کوئی شکوہ اور آنے والے سال سے کوئی امید؟

5) اگر 2017ء میں آپ کو جادوئی چراغ مل جائے تو وہ کون سی 3 خواہشات ہیں جو پوری کریں گے؟

نے پوچھنا تو درکنار سوال بھی نہ پوچھا...... کچھ دن سے چہرہ کتاب (فیس بک) پر ایک شعر پڑھا تھا۔

کچھ دن چھپ کر دیکھو، دیکھنا
لوگ کیسے بھول جاتے ہیں

اچھا بھولے تو بھولے' میرے بغیر جب لنچ اور ڈنر ہونے لگے تو سوچا میں انٹری دینے ہی لگوں' حسینہ ماہ جبینہ مسکراتی ہوئی لنچ کر رہی تھیں سوچا میں نہیں ہوں تو کسی کرسی پر امجد صابری کی طرح تصویر رکھی ہوگی وہ بھی نہ تھی ...... یا اللہ ...... خبر یہ سب تو مذاق تھا۔ دراصل پچھلے دو ماہ میں، میں کافی پریشان رہی خیابانِ شہباز پر میری گاڑی کا ایک بڑا ایکسیڈنٹ ہوا میں بچوں کو اسکول چھوڑنے جارہی تھی۔ گاڑی بالکل تباہ ہوگئی الحمدللہ بہت معمولی چوٹیں آئیں لیکن کئی ہفتے میں اُس شاک کے زیر اثر رہی' جب میری گاڑی ٹکرائی تھی اور میرے بچوں کی چیخیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں' الحمدللہ ڈرائیور بھی سلامت رہا' لیکن...... وہ لمحہ آج بھی لرزا دیتا ہے...... پھر اسکول میں' میرے بیٹے وجیہہ کھیلنے کے دوران گر پڑے اُن کے دانتوں پر چوٹ لگی۔ ڈاکٹرز کے پاس لے کر گئے تو دو ماہ علاج ہے۔ روٹ کینال ہوئی Caping ہوئی بس پریشان کن مصروفیات میں پھنس گئی تھی۔ الحمدللہ اب سب خیریت ہے۔ اِس ہفتے ذرا بیرون ملک کا چکر لگانے جارہی ہوں' آج کل ٹپال چائے اچھی نہیں آرہی تو سوچا سری لنکا سے چائے اور مالدیپ سے کافی خرید لاؤں تو بس ذرا گروسری کا چکر ہے۔ انشاء اللہ دسمبر میں واپسی ہے اس امید کے ساتھ سب خیریت ہوگی۔ رسالہ میرے ہاتھ میں ہے' ٹائٹل خوبصورت ہے دلہن کا میک اپ شاید بیچاری نے خود کیا ہے اُس کے باوجود بہت اچھی لگ رہی ہے منزہ کا اداریہ میری طرح جاندار رہا اور بہنوں کی محفل کے کیا کہنے' بہت سارے نئے نام نظر آتے ہیں' اللہ پاک رسالے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔ نعمان اعجاز سے ملاقات اچھی لگی ویسے بھی وہ میرے موسٹ فیورٹ آرٹسٹ ہیں'

سنبل کا مکمل ناول بہت خوب ہے ویسے بھی سنبل جب بھی لکھتی ہیں شاندار ہی لکھتی ہیں۔ رفعت سراج ہمیشہ کی طرح رفعتوں پر ہیں اور میری بہت پیاری سی زمر نعیم کی تحریر میں ہمیشہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں اللہ کرے زورِ قلم ہو اور زیادہ...... فرح اسلم کا ناولٹ ہمیشہ کی طرح بہترین رہا' باقی تحریریں پڑھ نہ سکی اُس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اچھی نہیں ہوں گی یقیناً بہت اچھی ہوں گی۔ دراصل آج کل جانے کی تیاریوں میں لگی ہوں تو مصروفیت کے باعث نہ پڑھ سکی' انشاء اللہ سارے رسالے رکھ کر لے جارہی ہوں اطمینان سے پڑھوں گی۔ لیکن تحریر پڑھ سکی یا نہ پڑھ سکی منزہ ڈیئر چہرہ کتاب (فیس بک) پر لنچ کی تصویر ضرور دیکھ لی تھی۔ خوش رہو۔ زندگی کو انجوائے کرو نہ بلاؤ کوئی بات نہیں' گھر پر پارسل بھیج دیا کرو...... میں اِسی میں خوش ہوں۔ ایوارڈ کی تقریب کب ہو رہی ہے پلیز 15 دسمبر کے بعد رکھیے گا۔ بھائی کاشی چوہان کہاں ہیں؟ اُن کو بہت سلام' خط میں لکھنے کو بہت کچھ ہے لیکن افسوس' ٹائم کم ہے اور کام زیادہ...... انشاء اللہ آئندہ ماہ بھرپور تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

ج: میری بہت پیاری سی عقیلہ! بالکل ٹھیک کہا آپ کے بغیر لنچ میں کچھ خاص مزہ نہیں آیا تو بہن اس غلطی کے لیے رضوانہ پرنس سے باز پرس ضرور کرو یہ لنچ انہی کی جانب سے تھا۔ اور تم نے یہ کیسے سوچا کہ لوگ تمہیں بھول گئے بھئی میں تو ہمیشہ محفل میں پکارتی ہوں اب تم اسے نقار خانے میں طوطی...... چلو چھوڑو' گروسری ہو جائے تو تازہ چائے کی پتیوں اور خوشبودار کافی کے ساتھ چلی آنا آخر پڑوسیوں کے بھی تو کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اپنی نظر اتروا دیا کرو ویسے اللہ نے کرم کیا کہ بچے اور تم محفوظ رہے۔ اب اپنا وعدہ یاد رکھنا اور اگلے ماہ مکمل تبصرے کے ساتھ حاضری لگانا...... افسانہ سالگرہ نمبر میں شامل کروں گی۔ ایسے ہی ہنستی مسکراتی رہو۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں خولہ عرفان' لکھتی ہیں۔ امیدوں اور دعاؤں کے ساتھ کہ زندگی کا ہر لمحہ آپ کے دامن میں خوشیوں و کامیابیوں کے ہزاروں خوش رنگ و خوشبودار پھول کھلائے رکھے آمین۔ آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ دوشیزہ ہاتھ کو تازگی اور ذہن کو تراوٹ بخش چکا ہے آپ کا جواب پڑھتے ہی ذہن کی زرخیزی میں لگتا ہے اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہوتا ہے لفظوں کا اثر یا جادو...... اتنی دیر تو آپ کے ادارے کے سحر میں گم رہی۔ شاید وقت کی نبض بھی تھم گئی تھی ہزاروں یادیں اور باتیں ذہن کے پردے پر اپنے نقوش ابھارنے لگیں۔ منزہ کیا تحریر کیا ہے آپ نے واہ اور آہ...... قلم بھی آگے بڑھنے سے انکار کر رہا تھا لیکن قلم آگے بڑھے نہ بڑھے وقت ضرور بڑھ جائے گا اور چھٹیاں ختم ہو گئیں تو یہ فرصت کے لمحات بھی کسی کمفرٹر کے اندر دبکے نظر آئیں گے۔ اس لیے جانب محفل سفر شروع کرتی ہوں۔ زمر سے مودبانہ التماس ہے کہ محبتوں میں رسمی باتیں نہیں ہونی چاہیے شکریہ یہ کہہ کر نہ شرمندہ کریں آپ کی تحریر پر اگر میں تبصرہ نہ کروں تو مجھ سے بڑا کنجوس کوئی نہیں ہوگا۔ وہ بھی ایسے حوصلہ شکن دور میں جہاں افراتفری اور آپا دھاپی کا راج ہے۔ لوگ اندر سے بہت زخمی ہیں کوئی نظروں سے گھائل بیٹھا ہے تو کہیں لوگوں کے رویے اور الفاظ کے بم شخصیت کے پرخچے اڑا دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس دور میں ہمارا کام بڑی ذمہ داری کا ہو گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اینٹی بائیوٹک حوصلہ مند الفاظ کے کیپسولز بصورت

بازگشت

آپ کے پسندیدہ مصنفین کی تحریروں سے سجا ایک نیا سلسلہ‘ جن کی تحریریں امر ہیں۔ وہ تحریریں جن پر اردو ادب بجا طور پر فخر کرتا ہے۔ اچھی تحریر اپنی چاشنی ہمیشہ برقرار رکھتی ہے۔ وہ سلسلۂ خاص جس کا یقیناً آپ ہر ماہ انتظار کریں گے۔ ماہ جنوری 2017ء سے آپ کے اپنے ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ میں......

ناول‘ ناولٹ اور افسانے قارئین تک پہنچائے جائیں تاکہ اُن میں اِن رویوں اور الفاظ سے ہونے والے زخموں کی شدت کو کم کرنے کے لیے قوتِ مدافعت پیدا ہو سکے اور ان کیپسولز اور ٹیبلیٹس کی صرف قارئین کو ہی نہیں مصنفین کو بھی ضرورت ہوتی ہے۔ سوخولہ کی پوری کوشش اپنے پیارے پیارے مصنفین کی قوتِ مدافعت بڑھانے کی ہے۔ سوری زمر! اپنے طبی فلسفے میں آپ کا ناول درمیان میں رہ گیا تو جناب تمام جزئیات کو پیش کرنے میں ناول میں کبھی کبھی ٹھہراؤ سا محسوس ہونے لگتا ہے لیکن میں اسے خاص نہیں بلکہ تحریر کا تقاضہ سمجھتی ہوں اس لیے اگر کبھی میں لکھوں بھی تو تنقیدی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اپنی عجلت پسند طبیعت کے زیرِ اثر لکھوں گی اس لیے آپ کا اور رفعت سراج دونوں کا ناول جذبات نگاری اور منظر نگاری کی خوبیوں سے مزین ہے البتہ رفعت سراج کا خالص گھریلو متوسط سوچ کی عکاسی کرتے مکالمے ہوتے ہیں اور آپ کا بھی دو مختلف طبقوں کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہوتا نظر آ رہا ہے امید ہے آگے آپ کے جملے بھی کاٹ دار ہوں گے۔ ویسے منزہ جس طرح فرح نے دوشیزہ سے دوستی کرائی تو دوشیزہ نے بھی مجھے ایک دوست کا تحفہ دیا ہے وہ ہے فصیحہ‘ ادب کے میدان میں اُن کا قد مجھ سے کہیں بڑا ہے بلکہ مجھے تو مقابلہ بھی نہیں کرنا چاہیے ہے لیکن...... فصیحہ سے بات کر کے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ اور میں پہلی دفعہ ملے ہیں۔ مجھے لگا میری کوئی بچھڑی ہوئی سکھی سہیلی مل گئی ہے۔ میں واقعی اس کی بے ریا‘ بے تکلف اور پیاری سی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ خیر جزاک اللہ ان تمام قارئین‘ مبصرین اور مصنفین بشمول منزہ کے لیے جن کے الفاظ ہماری کسی نہ کسی سوچ کی بھرپور عکاسی کر کے ہمیں تقویت دیتے ہیں۔ ام مریم کا اسمِ محبت‘ سید وجاہت علی کا ناولٹ کیسے کہوں اچھی تحریر تھی۔ بس ایک نظریاتی اور قلمی اختلاف یہ ہے کہ محبت تو اندھی ہوتی ہے وہ صفائیاں کہاں سے مانگنے گی۔ صنفِ نازک کو جذباتی طور پر کمزور دکھانا ہی تھا تو بھی اس کی کمزوری کا واضح اظہار خود اس کی ہی زبانی بہت معیوب سا لگ رہا تھا۔ مہتاب خان کا محبتوں کی راہ گزر اور فرزانہ نگہت کا دلنشین بھی اچھا تھا لیکن جذبات نگاری کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ افسانوں میں سمیرا غزل کا جیون اک موضوع پرانا تھا لیکن کہانی کا آغاز اور انجام بمع اسلوب بیاں بہت اچھے تھے۔ حنا اصغر اور فاطمہ خاں کا موضوع کہانی بھی اچھے لگے۔ دو تحریروں نے اپنا لوہا منوایا ایک سنبل کی جو باقی آئندہ کے ساتھ صبر کا امتحان لے رہی ہے اور دوسری فرح اسلم کی لگام...... دونوں کا کم و بیش موضوع ایک جیسا ہے۔ یعنی صنفِ نازک کی حیثیت سے عورت کا مرد کے مقابلے میں استحصال یا ایک عورت کا اپنی ہی جیسی عورت پر رشتے و مرتبے کی بنیاد پر استحصال لیکن دونوں کے اندازِ تحریر اور انتخاب کہانی مختلف اور لاجواب رہے۔ سنبل کے لیے تعریفی مقالہ آخری قسط کے ساتھ

لکھوں گی البتہ فرح نے ہمارے عام معاشرتی مزاج کی جس میں رشتے دار سر بھی سہلاتے ہیں اور پیاز بھی کاٹ دیتے ہیں خوبصورتی سے عکاسی کی ہے کہ انصاف کرنے والا اوپر موجود ہے۔ فرح تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں اِتراؤ نہیں تحریر لکھتے لکھنا بھول گئی ہوں۔ منزہ مذاق کر رہی ہوں فرح کو تنگ کرنے کے لیے لکھا ہے۔ نسرین اختر کا منی ناول سپنے سہانے دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن انیلہ اور سکندر کے جذباتی حادثے نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں اپنے بعد جس شاعرہ سے متاثر ہوئی وہ فصیحہ ہے واہ! ویسے اب کی دفعہ مجھے لگتا ہے کہ کافی تنقیدی تبصرہ ہوگیا ہے لیکن امید ہے کہ یہی مصنفین اپنی زبردست سی تحریر بھی دوشیزہ کے ذریعے ضرور پڑھنے کا موقع دیں گے۔ آمین۔

ﷺ: پیاری خولہ! تمہاری اسی انصاف پسندی کی تو میں قائل ہوں فرداً فرداً ہر تحریر پر تبصرہ کرتی ہو۔ یقیناً یہ ایک مصنف اور اُس کی تحریر کے لیے بہت سود مند رویہ ہے۔ خط کی ابتدا میں جو دعائیں دیں ان کے جواب میں تو بس آمین ہی کہوں گی ادارہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ تمہاری غزل کاشی چوہان کے حوالے کردی ہے اور تمہاری تعریف بھی تمام لکھاریوں تک پہنچادی ہے۔ خوش رہو۔

✉: لاہور سے تشریف لائی ہیں نسرین اختر نینا' لکھتی ہیں۔ منزہ کیسی ہیں آپ یقیناً بخیریت ہوں گی آنٹی رخسانہ سہام مرزا کا کیا حال ہے؟ یہیں ہیں یا امریکہ واپس چلی گئی ہیں؟ میری طرف سے انہیں ضرور پوچھیے گا اور انہیں میرا سلام بھی کہیے گا۔ میں آپ کی ممنون ہوں کہ آپ نے میرے ناول کو دوشیزہ کی زینت بنایا اس سے مجھے بے حد خوشی اور اعتماد حاصل ہوا ہے۔ پہلے تین قسطیں تو ترتیب سے ہی شائع ہوئی ہیں مگر چوتھی قسط میں صفحہ نمبر 213 میں جو دوسرا پیراگراف ہے جو یوں شروع ہوتا ہے کہ ہانیہ اور شہاب کا رشتہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا اور آگے کے سارے صفحے جو ہیں یہ تو کافی آگے یعنی انہیں غالباً قسط نمبر 5 میں آنا تھا۔ اور اس طرح ایک دم سے ہی کہانی میں کافی گیپ آ گیا ہے۔ شاید کمپوزنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔ پلیز اسے چیک کر لیجیے گا شکریہ میں کافی دنوں سے آپ کو خط لکھنا چاہ رہی تھی۔ مگر پھر کچھ ایسی مصروفیات آن پڑیں کہ ایسا نا کر سکی' انشاء اللہ اب کوشش کروں گی کہ باقاعدگی سے اس خوبصورت محفل کا حصہ بن سکوں۔ میں اُن تمام دوستوں کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے سپنے سہانے کے بارے میں اپنی قیمتی آراء کا اظہار کیا جو میرے لیے انتہائی انمول ہیں کہ اسی طرح لکھنے والے کو نئی تحریک ملتی ہے۔ رضوانہ کوثر آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میں غائب نہیں ہوئی تھی۔ دراصل ایک اور ناول ہی کے سلسلے میں مصروف تھی۔ جو کہ جلد ہی مکمل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے لیے آٹھویں اور ساتویں کلاس کی انگلش کی رائٹر کی حیثیت سے ٹیکس بکس تحریر کیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ دونوں کتابیں Apporve ہوکر کورس کا حصہ بن گئیں اور آج کل اسلام آباد کے سرکاری اسکولز میں پڑھائی جارہی ہیں۔ یہ میرے لیے اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اعزاز ہے۔ منزہ آپ کی محنت کی داد دینا ناانصافی ہوگی آپ کی کوشش اور اَن تھک محنتوں کی وجہ سے دوشیزہ پہلے کی طرح ہی بہت آب و تاب لیے ہوتا ہے۔ اور سارے ہی ساتھی بھی بے حد خوبصورت تحریروں سے اس کو سجا رہے ہیں اللہ کرے یہ مزید بلندیوں تک پہنچے۔ آج ہی رسالہ مل گیا ہے اور میں فوراً آپ کو خط لکھ رہی ہوں اس لیے اس ماہ کی

تحریروں پر تبصرہ نہیں کر سکتی۔ ہاں منزہ میرا ایک ناول' من موجی آپ کے پاس موجود ہے۔ کیا آپ نے پڑھ لیا اُسے کاشی چوہان سے کہیے کہ میری دو کہانیاں اُن کے پاس ہیں وہ کب تک سچی کہانیاں کی زینت بن سکیں گی۔ میں دو نظمیں بھیج رہی ہوں۔

ﺟ: ڈیئر نسرین! محفل آپ لوگوں کی ہے اس کو سجاتی سنوارتی آپ لوگوں کے لیے ہی ہوں لہٰذا ایس میں شرکت ضرور کیا کریں۔ دوشیزہ کے پڑھنے اور لکھنے والوں کے دم سے ہی تو یہ ساری رونقیں ہیں۔ نسرین آپ نے درست کہا اصل میں' میں نے کہانی کو ایڈیٹ کیا ہے کہیں کہیں بے جا طوالت محسوس ہو رہی تھی۔ آپ کی کہانی سامعیہ' انیلا اور عالی کے گرد گھوم رہی تھی اسی لیے میں نے باقی کرداروں کو ذرا پیچھے ہی رکھا ہے اس طرح پڑھنے والے اصل کرداروں کے بارے میں جاننے میں ہی دلچسپی رکھتے ہیں جتنے زیادہ کردار ہوں گے کہانی کا پھیلاؤ بھی اسی قدر پھیلتا جائے گا بس اسی لیے ابتدا میں تو سب کا ذکر تھا مگر آئندہ قسطوں میں صرف خاص کردار ہی رہ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی پڑھ کر اچھا لگے گا۔ سپنے سہانے کے علاوہ میرے پاس آپ کی کوئی اور تحریر نہیں...... آپ کا سلام امی تک پہنچا دیا ہے وہ امریکہ میں ہیں اور میری طرف سے نصابی کتب تحریر کرنے پر بہت بہت مبارک۔

✉: لاہور سے تشریف لائی ہیں' راحت وفا راجپوت لکھتی ہیں۔ نومبر کا دلکش سرورق سے سجا ناول نمبر ملا۔ شکریہ سب سے پہلے دوشیزہ کی محفل میں جھانکا رنگ برنگے پھولوں سے سجا گلدستہ سامنے تھا۔ ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور نرم لہجے مین جواب دیتے ہوئے آپ بالکل اس شعر کی تفسیر لگتی ہیں

نہ جانے کون سی دولت ہے تمہارے لہجے میں
بات کرتے ہو تو دل خرید لیتے ہو

بہت طویل انتظار ہو گیا ہے میری کہانی کا نمبر بھی لگا دیں۔ ہر ماہ امید ہوتی ہے پھر رسالہ دیکھ کر مایوس ہو جاتی ہوں۔ مدیحہ زہرہ نقوی کی مسکراہٹ بہت خوبصورت ہے۔ نعمان اعجاز سے ملاقات اچھی لگی۔ اُن کا نام تو ڈرامے کے معیار کی ضمانت ہے۔ لائف بوائے اعتماد لائے' اسماء نے ہمیشہ کی طرح بہت اچھی کہانی لکھی اب تو اسماء اعوان کا نام لائف بوائے کے ساتھ جڑ گیا ہے۔ دام دل ہمیشہ کی طرح شاندار ماؤں کو آگاہی دیتی ہوئی حنا اصغر کی تحریر مینا کی گڑیا نے دل اُداس کر دیا۔ سنبل اچھا لکھ رہی ہیں سارے ناولٹ بہت اچھے ہیں پڑھ کر مزہ آیا ابھی امکان باقی ہے زمر نعیم کا ناول قدم بقدم دلچسپ ہوتا جا رہا ہے اور پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کر رہا ہے۔ اسماء اعوان نے دوشیزہ گلستان کو بہت خوبصورت سے سجایا ہے نئی آواز نئے لہجے میں فصیحہ آصف خان کی کچھ بھی نہیں اچھی لگی۔ چٹ پٹی خبریں پڑھ کر مزہ آ گیا سارے اسٹاف کو ہمارا سلام۔

ﺟ: بہت ہی اچھی راحت! تمہارا خط ملا اچھا لگا...... دوشیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ' انشاء اللہ جلد تمہارا افسانہ بھی شمارے میں شامل ہو گا اور ہاں اتنا خوبصورت شعر لکھنے کا بہت شکریہ۔

✉: لاہور سے تشریف لائی ہیں فریدہ فری لکھتی ہیں۔ نومبر کا دوشیزہ ملا پچھلے ماہ شدید بیماری کی وجہ سے تبصرہ نہ کر سکی۔ جب تک دوشیزہ نہ پڑھ لوں سکون نہیں ملتا۔ دوشیزہ میرا فیورٹ میگزین ہے۔ اس تحریریں بے حد معیاری ہوتی ہیں۔ مکمل ناول آنگن کی چڑیا سنبل جی نے کیا خوب لکھا۔ ناولٹ رسم محبت ام مریم اور لگام

فرح اسلم قریشی بھی بے حد پسند آیا فرزانہ نگہت کا دلنشین نے تو کمال کر دیا اتنا بہترین ناولٹ لکھنے پر مبارکباد، خوش رہو۔ افسانے مینا کی گڑیا...... مقدمہ، جیون اک خواب سفر بہترین افسانے لگے پڑھ کر بے حد مزا آیا۔ منزہ جی سردیاں ہمارا فیورٹ موسم ہے اب ہم پاگل پن سے ٹھیک ہو گئے ہیں ٹائٹل ڈبل مت لگایا کریں۔ فصیحہ آصف کا تبصرہ اور شاعری بے حد پسند آئی فصیحہ جی آپ کو بے حد سلام دعا' ابھی بھی بیماری کی وجہ سے کمزوری بہت ہے تبصرہ بھی مشکل سے لکھا ہے غلطی کی معافی چاہتی ہوں سب کو دعا اور سلام۔

☜: سویٹ فریدہ! یہ جان کر بہت اچھا لگا کہ اب طبیعت بہتر ہے۔ دوشیزہ اور اُس کی تحریروں کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ ٹائٹل ڈبل لگانا ہماری معاشی مجبوری ہے اور دعا کریں یہ مجبوری تا دیر قائم رہے۔ امید ہے سمجھ گئی ہوں گی۔

✉: ڈی جی خان سے تشریف لائی ہیں ام ایمان لکھتی ہیں۔ صوبہ پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان سے ام ایمان قاضی آپ سے مخاطب ہوں۔ 2013 سے تحریری سفر کا آغاز ہوا۔ پاکیزہ' شعاع' خواتین' کرن' حنا آنچل اور حجاب میں لکھ چکی ہوں۔ الحمدللہ پذیرائی بھی ملی۔ بک اسٹال پر اس بار دوشیزہ کا شمارہ دیکھ کر خرید لیا۔ فہرست میں رفعت سراج کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ وہاں دوشیزہ کی محفل میں آپ کا خوبصورت انداز متاثر کر گیا۔ زیر تحریر' تحریر جب مکمل ہوئی تو اسے دوشیزہ میں بھیجنے کا خیال آیا۔ اب آپ تحریر پر شفقت فرما کر شکریہ کا موقع فراہم کریں۔ انشاء اللہ آپ کا تعاون رہا تو یہ ساتھ قائم رہے گا۔

☜: بہت اچھی سی ام ایمان میں تمہیں دوشیزہ کی محفل میں خوش آمدید کہتی ہوں یہ محبتوں اور خلوص سے سجی محفل آئندہ بھی تمہاری منتظر رہے گی۔ افسانہ مل گیا ہے انشاء اللہ جلد اس کی قسمت سے آگاہ کروں گی۔

✉: لاہور سے تشریف لائی ہیں نزہت حسین' لکھتی ہیں۔ محترمہ منزہ صاحبہ حسبِ وعدہ اس ماہ پھر حاضر ہوں۔ عمومی طور پر شمارہ لاجواب ہے۔ نعمان اعجاز سے ملاقات نے تو بہت مزہ دیا۔ مجھے بے انتہا پسند ہیں وہ...... اس بار جس تحریر نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ فرح اسلم قریشی کا ناولٹ 'لگام' ہے۔ کیا خوبصورت تحریر تھی۔ اس کے علاوہ سپنے سہانے پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے، ہمارے شہر کی بھرپور عکاسی ہے اس میں، سید وجاہت علی کا 'کیسے کہوں' بھی لاجواب تحریر ہے۔ حنا اصغر کی 'مینا کی گڑیا، جیون اک خواب سفر' تو بالکل خوابوں جیسی تحریر تھی۔ اس نرم نرم سردی میں گرما گرم تحریریں پڑھنا بذات خود ایک بہت بڑی تفریح ہے۔ رفعت سراج اور زمر نعیم تو بہت کہنہ مشق رائٹرز ہیں ان کا لکھا تو ہمیشہ ہی بہترین ہوتا ہے۔ دوشیزہ گلستان بھی لاجواب تھا اور نئے لہجے نئی آوازیں میں بھی، تمام شاعری بہترین تھی۔ اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر منزہ میں آپ کو اور آ۔ ب۔ کے مصنفین کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

☜: اچھی سی نزہت! تم نے اپنا وعدہ وفا کر کے مجھے قائل کر لیا کہ خواتین بھی سچ بولتی ہیں...... خیر یہ بات ازراہِ تفنن کہی ہے۔ تمہاری پسندیدگی مصنفین تک پہنچا دی ہے۔ شمارہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے۔

خوش رہیے اور خوش رکھیے انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہو گی۔ اللہ حافظ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

☆☆......☆☆☆

اسد زمان خان

ابھرتے ہوئے خوبرو ماڈل

مونی خان

اسد زمان خان پاکستانی ماڈل جن کو دیپک پروانی اور عامر عدنان نے اپنا برانڈ ماڈل منتخب کیا۔ عمر 32 سال قد چھ فٹ 2 انچ ہے۔ اسد 5 جنوری 1986ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تعلق پختون فیملی سے ہے۔ اسٹار کیپری کورن ہے۔ اسد کی پہلی فلم ہجرت تھی۔ جس میں اُن کے کردار کو دیکھنے والوں نے بہت سراہا۔ اسد بہت اسمارٹ انسان ہیں اور خاص طور سے اُن کی سبز آنکھیں دیکھنے والوں کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔ اسد کو ٹریولنگ بہت پسند ہے۔ میوزک بھی بہت شوق سے سنتے ہیں۔ کھیلوں میں کرکٹ اور فٹبال بے انتہا پسند ہیں اور فارغ وقت میں ضرور کھیلتے ہیں۔ اسد نے کئی اشتہارات کیے ہیں

ریمپ پر واک کرتے وقت ہمیشہ خواتین پر بجلیاں گراتے ہیں۔ پاکستانی نوجوان انہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ اسد نے I.R میں ماسٹرز کیا ہے بہت انکساری ہے طبیعت میں اور یہی انکساری انہیں دوسروں سے مختلف رکھتی ہے۔ اسد کو

چٹ پٹے کھانے بہت پسند ہیں خاص طور سے گوشت کی ڈشز مرغوب ہیں۔ اپنے والدین سے بہت پیار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ وقت گزارنا سب سے اچھا محسوس کرتے ہیں۔

☆☆......☆☆

ڈاکٹر شائستہ لودھی

اینکر، ہوسٹ، اداکارہ

زیشان فراز

س: شائستہ شوبز میں آنا اتفاق تھا؟

ج: بالکل نہیں میں نے ریڈیو سے شروعات کی وہ ایسا میڈیم ہے جو آواز کے اتار چڑھاؤ اور تلفظ پر بہت کام کرتا ہے یوں میں سمجھتی ہوں کہ میری اردو کو بہت فائن ریڈیو نے کیا اور مجھے شوق تھا ہوسٹنگ کا اسکول اور کالج کے زمانے میں اکثر ایسے پروگراموں میں حصہ لیا کرتی تھی۔ والدین کی خواہش پر MBBS کیا اور اپنے شوق سے پھر اس فیلڈ میں قدم رکھا۔ دراصل مجھے عشق ہے ہوسٹنگ سے۔

س: آپ کی پیدائش کراچی کی ہے تو اردو تو ویسے بھی اچھی ہوگی؟

ج: ضروری نہیں کہ سب کراچی کے رہنے والے یا جن کے والدین اردو بولتے ہیں وہ سب اچھی اردو بولیں۔ عام انداز میں ہم جو بات چیت کرتے ہیں وہ مختلف ہوتی ہے کوئی آپ کی غلطیاں نہیں پکڑ رہا ہوتا مگر جب بطور ذمہ دار آپ کسی سے انٹرویو لے رہے ہوں یا لوگ آپ کی بات سن رہے ہوں تب ذمہ داری بڑھ جاتی ہے میں آج تک اپنی غلطیاں ٹھیک کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

س: آپ کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ آپ نے مارننگ شوز کو ایک نیا رنگ دیا اور نمبرون پر اپنے شوز کو لے کر گئیں چاہے وہ کوئی بھی چینل ہو کیسا محسوس کرتی ہیں؟

ج: (ہنستے ہوئے) مجھے بہت بھاری قیمت دینی پڑی اس نمبر ریس کی TRP کے چکر میں، میں چینلو کی لڑائی کا شکار ہوگئی۔ افسوس کی بات ہے کہ ہم سمجھتے ہیں بہت ماڈرن دور میں جی رہے ہیں اور آج کی عورت پڑھ لکھ گئی ہے تو مضبوط ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میں نے بہت محبت اور شوق سے اپنا کام کیا مگر صلہ نہیں ملا۔

س: اچھا کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں، کتنے بہن بھائی ہیں؟

ج: جی ہم 3 بھائی اور میں ہوں۔ پیدائش

26 نومبر 76ء کی ہے۔ پیدائش کراچی میں ہوئی پھر ہم لوگ حیدر آباد چلے گئے۔ بچپن کا بہت سارا

وقت حیدر آباد میں گزارا۔ والدین بہت لبرل اور بچوں کو سمجھنے والے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھی ہم پر بلاوجہ سختیاں نہیں کیں حالانکہ ہم بہن بھائی بہت شیطان تھے۔

س: ایک ذاتی سا سوال کہ آپ کی پہلی شادی بہت اچھی جا رہی تھی پھر اچانک سے علیحدگی کی کیا وجہ بنی؟

ج: دیکھیے اچھی شادی شدہ زندگی ہوتی تو یوں اچانک ختم نہ ہوتی۔ میں بہت Explain کرنے کی قائل نہیں لیکن اگر میں غلط ہوتی تو تینوں بچے میرے ساتھ نہ ہوتے۔ اس وقت تو وہ چھوٹے تھے اب تو ماشاء اللہ بیٹے بڑے ہیں وہ مجھے ہر معاملے میں سپورٹ کرتے ہیں تو I Guess کسی کے صحیح یا غلط ہونے کا سب سے بڑا ثبوت اولاد کی سپورٹ ہی ہوتی ہے۔

س: آپ نے کئی ایوارڈز بھی جیتے اس پر گھر والوں نے کیا ردِعمل دیا؟

ج: ظاہر ہے سب نے تعریف کی مجھے خوشی ایکسپرٹ مام 2009ء اور سٹی ٹیلنٹ وومن 2006ء حاصل کرنے کی بہت ہوئی اور ہر خوشی کئی گنا بڑھ جاتی ہے جب آپ کو گھر سے سپورٹ ملتی ہے۔

س: آپ کو بہترین ہوسٹ کا بھی تو ایوارڈ ملا اُس کی خوشی نہیں ہوئی؟

ج: ارے کیوں نہیں ہوئی بالکل ہوئی مگر اب میں نے اپنی ساری توجہ ایکٹنگ کی طرف کر لی ہے۔ جس فیلڈ میں رہ کر میں نے بے انتہا محنت کی ایک مقام بنایا وہاں سے بہت دکھ ملے اس لیے اب ذکر بھی نہیں کرتی

میرے والد ہمیشہ کہتے تھے کہ اچھی شکل بھی بڑی بری چیز ہے جو بھی نظر ڈالتا ہے بری ہی ڈالتا ہے۔ تو شاید اپنی فیلڈ میں اونچا مقام پانا میرے لیے تکلیف دہ ہی ہوگیا۔

س: آپ کی شخصیت اسکینڈل کی زد میں رہی کیا اُس کی وجہ آپ کا بے پناہ شہرت پانا تھا؟

ج: دیکھیے ہمارے معاشرے میں بے شمار خواتین ہیں جن کی شادیاں ختم ہو جاتی ہیں شوبز فیلڈ میں تو بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کی کئی کئی شادیاں ختم ہوئی ہیں مگر جو تماشہ میرا بنا وہ شاید بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے میں پھر کہوں گی یہ چینلز کی لڑائی تھی اور پروفیشنلی لڑنے کے بجائے انہوں نے سب سے آسان ہدف کو ٹارگٹ کیا خاتون کی کردار کشی کردو سب لوگ اس بے چاری سے دور بھاگنا شروع کردیں گے۔ میں نے بہت مشکل وقت دیکھا 2012ء میں بچوں کو لے کر ساؤتھ افریقہ چلی گئی کیونکہ یہاں جو کچھ کہا جارہا تھا وہ بہت تکلیف دہ تھا میرے والدین کس عذاب سے گزرے یہ میں ہی جانتی ہوں۔

س: ایک ایسی ہوسٹ جس کا زمانہ فین تھا مشکل وقت میں کیا اُس کو لوگوں کی پہچان ہوئی؟

ج: (ٹشو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے) جی اصل میں زندگی کیا ہے میں نے اس مشکل وقت میں ہی جانا جب ہاتھ میں پیسہ نہیں تھا، ایک ایک کر کے سب لوگ ساتھ چھوڑ گئے تھے مگر میں نے یہ مشکل وقت اپنے بچوں کے ساتھ بہت ہمت سے گزارا کئی بار سوچا کہ زندگی ہی ختم کرلوں آپ بتائیں ایک عورت کے پاس سوائے عزت کے اور ہوتا ہی کیا ہے مگر میرے بیٹوں نے مجھے بہت سنبھالا۔ میں جان گئی ہوں کہ آپ کے اصل ساتھی دکھوں کے بھی اور خوشیوں کے بھی صرف آپ کے بچے ہوتے ہیں۔

س: آپ کو لگتا ہے کہ میڈیا لوگوں کی زندگیاں برباد کردیتا ہے؟

ج: میں سب کو نہیں کہوں گی مگر بالکل غیر ذمہ دارانہ صحافت لوگوں کو خودکشیوں پر مجبور کردیتی ہے۔ Rating کمانے کے چکر میں اس قدر نہیں گرنا چاہیے کہ کل آپ اپنے آپ سے بھی آنکھیں نہ ملا سکیں۔

س: آپ لوگوں سے ڈر کر ملک سے چلی گئی تھیں؟

ج: میں خود تو نہیں جانا چاہتی تھی میرے گھر والوں نے فورس کیا میری والدہ شدید بیمار ہوگئی تھیں۔ میں ایک پڑھی لکھی عورت ہوں مقابلہ کرنا جانتی تھی مگر پھر مجبور ہو کر یہاں سے چلی گئی۔ لیکن دیکھیے آج پھر آپ کے سامنے ہوں۔

س: اچھا اب کچھ بات آپ کے ARY سے پیش کیے جانے والے ڈرامے 'وعدہ' کی ہو جائے۔ یہ آپ کا پہلا ڈرامہ ہے؟

ج: جی بالکل! اس سے پہلے میں نے میوزک ویڈیوز کی، اشتہارات بھی کیے اور ریمپ پر واک بھی کی، مگر ڈرامہ پہلا ہے۔

س: اس ڈرامے میں اپنے کردار کے بارے میں بتائیں؟

ج: اس میں میرا کردار ایک ہاؤس وائف کا ہے میرے مقابل فیصل قریشی ہیں اور صبور ہیں باقی لوگ ڈرامہ دیکھ کر بتائیں گے کہ انہیں میرا کردار کیسا لگا؟ پہلی قسط کے بعد تو بہت اچھا رسپانس ملا مگر سچی بات ہے کہ مجھے اس بات کی کبھی پرواہ نہیں رہی کہ لوگ کیا کہیں گے میں اپنا بیسٹ دیتی ہوں اور مطمئن ہو جاتی ہوں۔

س: آپ کو ہوسٹنگ کی ملکہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا آپ نے اس فیلڈ کو ایک نیا Trend دیا خود کس کی فین ہیں؟

ج: بس اللہ کا کرم ہے ہوسٹنگ ایک بہت مشکل کام ہے اور مجھے مشکل کام کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔ مجھے نعیم بخاری صاحب کا انگلش پنجابی مکس اسٹائل بہت پسند ہے اور اُن کے علاوہ Oprah Winfrey پسند ہیں۔

س: اچھا یہ بتائیں کہ اکلوتی بہن ہیں سب کی لاڈلی ہوں گی؟

ج: جی میں اپنے بھائیوں کی بہت لاڈلی ہوں۔ امی ابو بھی مجھے بہت

پیار کرتے ہیں اور کوئی بھی میری کوئی بات رد نہیں کرتا۔

س: دوسری شادی کب کی؟

ج: عدنان لودھی میرے کزن ہیں اُن کی وائف کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئیں تھیں۔ والدین اور بھابیوں کے کہنے پر میں نے 2015ء میں عدنان سے شادی کی اور پہلی شادی کی طرح یہ بھی ارینج میرج تھی۔

س: اپنے آپ کو اتنا فٹ کیسے رکھتی ہیں؟

ج: میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ جی نیچرل ہے بالکل نہیں ڈائٹ کا بھی خیال رکھتی ہوں تھوڑی بہت ایکسر سائز بھی کرتی ہوں اور یہ سب تو ہر انسان کے لیے ضروری ہے ایک عمر کے بعد اپنا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے اور پھر میں تو خود ڈاکٹر ہوں مجھ سے بہتر یہ کون جانے گا۔

س: شائستہ ایسی کوئی بات جو لوگ آپ کے بارے میں نہیں جانتے؟

ج: میں خود پرفیکشن کی قائل ہوں کوئی بھی کام کروں بہت محنت سے کرتی ہوں ہوسٹنگ کرتے وقت بھی اپنے مہمانوں پر بہت Home Work کرتی تھی مگر ایک چیز ایسی ہے جو میں آج تک نہیں سنبھال پائی اور وہ ہے ڈرائیونگ‘ میں شاید دنیا کی سب سے بری کار چلاتی ہوں اور وقت کے ساتھ ساتھ بہتری آنے کے بجائے وہ بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

س: کھانے کی شوقین ہیں؟

ج: میں Food Lover ہوں سب کچھ کھاتی ہوں بہت انجوائے کرتی ہوں مگر Limit میں رہتی ہوں ہاں پانی پوری اور چھولے وہ میں کبھی بھی اور کہیں بھی کھا سکتی ہوں۔

س: آپ کی طبیعت میں غصہ ہے یا بالکل غصہ نہیں آتا؟

ج: میرے بھائی یہ تو نارمل ہی نہیں کہ کسی کو غصہ نہ آئے ہاں غصہ آنے والی باتوں پر غصہ ضرور آتا ہے مگر اب دُکھ کے ساتھ آتا ہے پہلے دکھ نہیں ہوتا تھا۔

س: ایسے کون سے انسانی رویے ہیں جو دکھ دیتے ہیں؟

ج: مجھے کردار کشی کرنے والے لوگ اور غیبت کی قبیح عادت بہت بری لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو مختلف بنایا ہے ڈراموں میں کام کرنے والے لوگ کارپوریٹ ورلڈ کے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ استاد کا الگ مقام ہے ڈاکٹر کی اپنی جاب ہے بزنس کرنے والے الگ ہوتے ہیں۔ مگر یہ سب ضروری ہیں ایسا ہو نہیں سکتا کہ جو بہت اچھا ڈاکٹر ہو وہی بہت اچھا آرٹسٹ بھی ہو ہر فیلڈ کی اپنی ڈیمانڈ ہوتی ہے بڑا لکھاری اس وقت بڑا بنتا ہے جب اُس کو عام لوگ پڑھتے ہیں پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا ٹی وی پر آنے والوں کو آسان ٹارگٹ جان کر بدنام کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ اگر ہم لوگ نہ ہوں تو سارا دن چلنے والے اُن کے ٹی وی بند ہو جائیں۔

س: فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں؟

ج: بالکل! اگر موقعہ ملا اور اچھی فلم ملی تو ضرور کروں گی۔

س: شائستہ اپنے پڑھنے والوں کو کیا پیغام دیں گی؟

ج: پیغام دینے کی تو میں قائل نہیں بس ایک گزارش ضرور کروں گی کہ تھوڑی دیر کی ہنسی مذاق کے لیے کسی کا دل نہ دکھائیں اور خدارا غیبت سے بچیں یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

☆☆......☆☆

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

منی پاکستان سے نکل کر......

پاکستان کے دل میں......

زندہ دلانِ لاہور کے درمیان

ماہِ جنوری میں

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان وشوکت کے ساتھ منعقد کی جارہی ہے

کیا **لاہور**...... **کراچی** سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب...... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے......

آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں ناں؟

آپ کے جواب کا منتظر......

آپ کا اپنا......

کاشی چوہان

نوٹ: تقریب کی تاریخ اور مقام کا اعلان اگلے ماہ کے شمارے میں کردیا جائے گا۔

لائف بوائے... ہر مہم میں ساتھ نبھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

مجھے بچپن ہی سے ایڈونچر پسند رہا ہے۔ میرے ڈیڈی کوہ پیما تھے جبکہ ممی نے بھی ملکی سطح پر کئی کھیلوں میں سلور اور گولڈ میڈلز لے رکھے تھے۔ میرے لیے یہ سب باتیں خواب ناک تھیں۔ میں ہمیشہ خود کو ہواؤں میں اڑتا' پہاڑوں پر چڑھتا یا جنگل بیابانوں میں سفر کرتا محسوس کرتی تھی۔ ڈیڈی سے جب بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے ہمیشہ ہی مجھے ٹال دیا۔

''ننھی پری! تم ابھی چھوٹی ہو۔ تمہیں معلوم ہے پہاڑوں اور جنگلوں میں موجود تتلیاں اور جگنو چھوٹی چھوٹی پریوں کے بال لے جاتے ہیں اپنی ملکہ کے پاس۔'' ڈیڈی مجھے ڈراتے۔

''مگر میری ننھی پری کے بال کوئی بھی نہیں لے کر جاسکتا۔'' ممی مجھے گود میں بٹھا کر میرے بال سہلاتے ہوئے کہتیں۔

''کیوں بھئی! تم کیسے یہ دعویٰ کرسکتی ہو۔'' ڈیڈی بضد ہوجاتے اور عینک کی اوٹ سے انہیں گھورتے۔

''کرسکتی ہوں۔'' ممی ڈیڈی کو گویا چیلنج دیتیں۔

''راز بتاؤ۔'' ڈیڈی اب بھی اپنی بات پر قائم ہوتے۔

''مائی چیلنج از مائی نیو لائف بوائے شیمپو!'' ممی ڈیڈی کو چڑاتے ہوئے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتیں۔

''ہم م م! اتنا بھروسہ ہے آپ کو اپنے لائف بوائے شیمپو پر۔''

''بالکل! بلکہ خود سے بھی زیادہ۔'' ممی مسکراتے ہوئے یقین سے کہتیں۔

''چلو پھر ہم اپنی ننھی پری کے 10th اسٹینڈرڈ تک جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر آپ کے لائف بوائے شیمپو کو بھی آزمالیں گے۔''

''شیور! آئی ایکسیپٹ یور چیلنج، مسٹر ڈیڈی!'' ممی ڈیڈی کو چڑاتے ہوئے کہتیں۔ میں حیرت سے اُن دونوں کی تکرار پر انہیں ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہوتی۔

☆......☆......☆

''ممی! پاپا مجھے کوہ پیما کیوں نہیں بنانا چاہتے۔''
میں اُس وقت 3rd اسٹینڈرڈ میں تھی جب یہ سوال میرے منہ سے نکلا تھا۔

''تم سے بہت پیار جو کرتے ہیں۔''

''مطلب!'' میں اُن کی بات کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔ سو حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

''اِن کی کوہ پیمائی نے ان کے بالوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ تمہارے ڈیڈی کے بال بہت گھنے اور خوبصورت تھے مگر کوہ پیمائی کے شوق نے اُن سے اُن کے بال لے لیے۔'' ممی میرے بالوں کو سہلاتی ہوئی بولی تھیں۔

''مگر ممی......'' میں نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر ممی جیسے ٹرانس کی کیفیت میں تھیں۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

''میری ننھی پری کوہ پیما بنے گی، ریس میں بھی حصہ لے گی، سیاحت بھی کرے گی، کیونکہ اس کے بالوں کی حفاظت کے لیے میرے پاس لائف بوائے شیمپو جو ہے۔ اس کے استعمال سے بال دکھیں 30 فیصد زیادہ گھنے، مضبوط اور صحت مند۔''

''ممی...... لائف بوائے میں ایسا کیا ہے جو یہ اتنے سارے کام اکیلا کرلیتا ہے۔''

''میری ننھی پری' لائف بوائے شیمپو کا نیا اسٹرانگ اینڈ تھک شیمپو روغن بادام (Almond Oil) ملک پروٹین (Milk Protein) کی طاقت لیے بالوں پر اپنا کام کرتا ہے۔ اور بال ہوجاتے ہیں اس کے استعمال سے اور بھی گھنے اور بھی مضبوط اور بھی سلکی۔''

وقت کا کام گزرنا ہے آج جب میں 10th اسٹینڈرڈ کے پیپرز کے بعد گھر آئی تو سیاحت کے شوق نے مجھے بچپن کی وہی ننھی پری بنادیا تھا۔

میری وش پوری ہونے جارہی تھی۔ غیر متوقع طور پر ڈیڈی اور ممی نے مجھے اور رازی بھیا کو تایا ابا کے ہاں بھیج دیا۔ جہاں ہم دونوں بہن بھائی تین دن کے ہمالیہ فوریسٹ کی سیر والی مہم پر روانہ ہورہے تھے۔ ممی نے میرا بیگ تیار کردیا تھا۔ اور خاص تاکید کی تھی کہ بالوں کو کھلا نہ چھوڑوں اور جیسے ہی وقت ملے فوری طور پر نیو لائف بوائے شیمپو سے بال دھو کر انہیں فریش رکھوں۔ ممی نے رازی بھائی کو بھی لائف بوائے شیمپو کے استعمال کی تاکید کی تھی۔ شام کو ہم تایا ابا کے ہاں روانہ ہوگئے۔ جہاں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

☆......☆......☆

جوگرز کے تسمے باندھ کر میں اٹھی اور دبے پاؤں کمرے سے نکلی' سب گہری نیند سو رہے تھے۔ برآمدے میں تائی جان تسبیح لیے کھڑی تھیں مجھے دیکھ کر حوصلہ افزا انداز میں مسکرائیں اور کچھ پڑھتے ہوئے پھونکا، رازی بھی آن پہنچا اور مسکراتے ہوئے میرے ساتھ کھڑا ہوگیا تائی جان نے آیت الکرسی کا حصار باندھا اور دونوں کی پیشانی چومی۔

''میری جان! بہت دیکھ بھال کر احتیاط سے جانا بہت ہی گھنا جنگل ہے، اُدھر سانپوں کی بہتات ہے اور پہاڑ بڑے ڈھلوان ہیں۔'' کہتے ہوئے بڑی سی ٹارچ اور تھرموس پکڑادیا۔

''لو بھئی اس میں کافی ہے' تم لوگ تو پریوں کے دیس جارہے ہو' راستہ جتنا خطرناک ہے یادیں اتنی ہی حسین۔''

رازی نے ہنس کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

''چلو چلیں۔''

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں عجیب سنسناہٹ سی ہورہی تھی۔

''تائی جانی میں نہیں جاتی۔''

''اوہو...... اب ایسے بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں، چلو جلدی کرو۔'' وہ پلٹ کر چلی گئیں۔

گیٹ سے نکلے تو تایا جان کھڑے تھے۔ انہوں نے رازی کو ایک خوب مضبوط واکنگ اسٹک پکڑا دی۔

''پستول تو رکھ لیا ہے نا؟'' انہوں نے رازی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''جی...... '' رازی نے جینز کی پاکٹ تھپتھپائی۔

''فکر نہ کریں ہماری پری تو ویسے بھی بہادر ہے اور شیر دل رازی بھی ساتھ ہے۔'' رازی بھائی اکڑ کر بولے۔

تایا جان نے جھک کر میرے فق چہرے کو دیکھا اور ہنس دیے۔

☆......☆......☆

''بہادر لوگ ہی سر اُٹھا کر جی سکتے ہیں، اچھا میں تو مسجد جا رہا ہوں اذان ہونے والی ہے۔''

''میں نے بھی وضو کرلیا ہے تاکہ اس پُر خطر مہم میں اگر کوئی بات ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے پاس باوضو پہنچوں۔'' رازی کی آواز میں شوخی کا عنصر نمایاں تھا۔ لیکن میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''تایا جان اُدھر جنگل میں بڑے خوفناک سانپ ہوتے ہیں۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''رازی ساتھ ہے، فکر نہ کرو اللہ حافظ۔'' اور وہ مسجد کی سڑک پر چل دیے۔

''اور کیا! شیر دل رازی ساتھ ہو تو فکر کیسی؟'' کہتے ہوئے رازی نے مجھے کھینچا اور ہم سڑک چھوڑ کر کچے راستوں پر اتر گئے۔ اُس نے بائیں ہاتھ میں میری کلائی اور روشن ٹارچ تھامی ہوئی تھی اور داہنے ہاتھ میں واکنگ اسٹک، جس سے راستے کے جھاڑ جھنکار ہٹاتے ہوئے تیزی سے ایسے لمبے ڈگ بھر رہا تھا کہ مجھے بھاگنا پڑ رہا تھا، چند منٹوں میں ہم گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ رازی نے ٹارچ کی روشنی اور تیز کر دی۔ سامنے سے کچھ خرگوش بھاگ نکلے کچھ پرندے درختوں میں سے پھڑ پھڑاتے ہوئے نکل کر اڑتے چلے گئے دفعتاً رازی نے ٹھٹک کر مجھے کھینچ لیا اور ہاتھ بڑھا کر اوپر کی طرف زبردست وار کیا۔ ٹہنیوں سے لٹکتے ہوئے دو لمبے سانپ شڑاپ سے اچھل کر دور جا گرے اور درختوں میں غائب ہو گئے مارے خوف کے میری سانس رک گئی۔

''چلو کوئی بات نہیں۔'' رازی نے مجھے منجمد پا کر حوصلہ دیا اب ہم تیزی سے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اونچی نیچی گھاٹیاں، گھنے درخت اور گنجان جھاڑیاں کئی جگہ سانپوں کی پھنکار سنائی دی لیکن ہم بنا رُکے نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرتے چلے گئے۔ پھر چڑھائیاں شروع ہوئیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چڑھتے چلے گئے۔ دور سے اذان کی آواز آنے لگی پھر ایسے لگا کہ درخت اور جھاڑیاں چھٹ گئیں اور نسبتاً کھلی جگہ آ گئی، ہم سانس لینے کو رُک گئے۔ رازی نے ٹارچ اطراف میں گھمائی، ہم ایک چھوٹے سے سطح مرتفع پر کھڑے تھے جو اونچے پہاڑوں اور گنجان درختوں سے گھرا ہوا تھا کچھ دیر بعد سانس اور حواس بحال ہوئے تو محسوس ہوا کہ فضا میں پرندوں کی چہکار گونج رہی ہے، سرد ہوا کے جھونکے پسینے میں شرابور وجود کو حیات بخش رہے تھے ایک سمت آسمان پر صبح صادق کی دودھیا سفیدی ابھر رہی تھی۔ کچھ عجیب سحر انگیز ماحول تھا۔

''چلو نماز پڑھ لیں۔'' رازی نے آرام سے کہا اور دودھیا آسمان کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گیا اور نیت باندھنے لگا۔ میں نے وضو کیا ہوا تھا۔ جلدی سے دوپٹہ لپیٹا اور پیچھے کھڑی ہو گئی، پاکیزہ لطیف ہوا کے جھونکوں سے روح سرشار ہو رہی تھی۔ اور دوران نماز اللہ تعالیٰ کی قربت کا احساس اس قدر بھرپور

محسوس ہورہا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ سلام پھیر کر میں نے سر جھکا لیا' دست فطرت نے جیسے میرے دل پر ہاتھ رکھ دیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔

''پری! آنکھیں کھولو' دیکھو تو چڑیاں اور رنگین پرندے کس طرح اڑ رہے ہیں ذرا دیکھنا سورج کس شان سے طلوع ہو رہا ہے۔ تم ساری دنیا کو بھول جاؤ' بس یہ یاد رکھو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہو اسے کسی کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔''

اب میں نے دیکھا ہم پہاڑوں سے گھرے ہوئے کنوئیں نما گہری گھاٹی کے اندر ایک چوڑی چٹان پر بیٹھے تھے جس کے نیچے اتھاہ اندھیرا اور گہرائی تھی۔

''اُف کتنی خوفناک جگہ ہے۔'' مجھے جھرجھری آگئی۔

''خوفناک؟ یہ چٹان بہت محفوظ ہے۔ بھئی ذرا سر اُٹھا کر قدرت کے حسن کو تو دیکھو۔''

''اوہ' میرے خدا......'' میں مبہوت ہوگئی پہاڑوں کے کنارے سے نورانی کرنیں اُجالا بکھیرتی اُتر رہی تھیں۔ ہمارے اطراف سبزہ پوش پہاڑوں کا تنگ گھیراؤ جس کے وسط میں اَن گنت چھوٹی چھوٹی آبشاریں گر رہی تھیں' ہر طرف لمبی گھاس میں سے پیارے اچھوتے پھول سر ابھارے جھوم رہے تھے۔ کہیں کہیں کاسنی اور نیلی مارننگ گلوری کی بیلیں لہرا رہی تھیں۔ پھولوں کی مست خوشبو اور پرندوں کے نغمات نے عجب سماں باندھ دیا تھا۔ میں مسحور ہوگئی۔

''اب دیکھو۔'' رازی نے چپکے سے کہا اور گہرائیوں میں نیچے کی جانب پستول سے ایک فائر کیا۔

''ٹڑ......ٹڑ......ٹڑ...... اطراف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر دھماکوں کی طرح اس کی گونج سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اچانک جیسے جگنوؤں کے مرغولے قریب آتے گئے' ہمارے ارد گرد آگے پیچھے دائیں بائیں ہم اُن میں گھر گئے۔

''اُف میرے خدا......'' مارے حیرت کے میری سانس رک گئی۔

''یہ تو تتلیاں ہیں سینکڑوں ہزاروں۔'' بمشکل میرے لبوں سے نکلا وہ ہمارے آس پاس اڑتی ہوئی پوری فضا میں چھا گئیں۔ سورج کی کرنوں میں ان کے چمکدار پر رنگین ستاروں کی طرح چمچما رہے تھے۔ حیرانی اور خوشی نے مجھے بے خود کر دیا میں ہنس رہی تھی۔ کھلکھلا رہی تھی۔

''رازی' رازی کتنا حسین ہے یہ سب کچھ اتنا پیارا' اتنا انوکھا بالکل خوابوں جیسا۔''

''ہاں خوابوں جیسا' لیکن ہے تو حقیقت اس طرح خواب حقیقتوں میں ڈھلتے ہیں۔''

وہ میرے ہنستے چہرے کو دیکھ کر طمانیت سے مسکراتے رہے تتلیاں اڑتی رہیں بکھرتی رہیں' بالآخر ہماری نظروں کی حدود سے نکل گئیں۔

''یہ دراصل ایسی غار نما گھاٹی ہے جس سے نیم تاریک گہرائیوں میں پھولوں کی گود میں ہزاروں لاروے پیدا ہوتے ہیں اور نشوونما پا کر تتلیوں کا روپ دھار لیتے ہیں یہاں میٹھی خوشبو والے پھولوں کی افزائش ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ جگہ تتلیوں کا مسکن بنی رہتی ہے رات بھر یہ چٹانوں سے چمٹی رہتی ہیں' اگر سورج نکلتے وقت دھماکے جیسی آواز پیدا کی جائے تو اس کی گونج سے گھبرا کر تڑپ کر اڑتی ہوئی نکلتی ہیں اور یہ انوکھا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے یہاں آس پاس بکثرت سانپ پائے جاتے ہیں اس لیے یہ عام لوگوں کی گزر گاہ نہیں' اس گھاٹی کو تایا جان نے دریافت کیا۔ اور تتلیوں کی بہار دیکھنے کا طریقہ بھی اُن ہی کی ایجاد ہے' میں جب بھی اِدھر آتا ہوں یہ نظارہ دیکھے بغیر نہیں جاتا۔ کیوں کیسا لگا؟'' رازی

نے کہا۔

''اچھا اسی لیے تم اپنا گھر چھوڑ کرتا یا جان کے گھر بار بار جانے کی ضد کرتے ہو۔'' میں نے چہک کر کہا۔

''بالکل! لٹل سسٹر! یہی وجہ ہے۔ ڈیڈی کی کوہ پیمائی میرے خون میں شامل ہے۔''

''خدا میرے بھائی کو سلامت رکھے۔'' میں نے کہا اور کیپ کو مضبوطی سے سر پر جمالیا۔

''یہ رنگ برنگے پھول' یہ سبزہ زار' یہ آبشاریں اور تتلیوں کی بہار' کیسا انوکھا منظر تھا رازی! یہ جگہ واقعی پریوں کا دیس ہے، ہائے دنیا کتنی خوبصورت ہے۔'' میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے ماحول کو دیکھا۔

''پری! یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا بے حد حسین بنائی ہے ہر ہر قدم پر فطرت کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نعمتیں اور خوشیاں ہر گام پر نیم پوشیدہ ہیں۔ بات صرف سمجھنے اور قدر کرنے کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہزار آزمائشوں کے باوجود انسان دنیا چھوڑنا نہیں چاہتا۔''

میں اس کی شکل دیکھنے لگی۔ اُن کے لہجے کی نرماہٹ اور آنکھوں کی شفقت میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

''پری! کسی کی زندگی محض پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔ ہر ایک کو اپنے نصیب سے پھول بھی ملتے ہیں اور کانٹے بھی۔ بس ہمیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے' کانٹے ہٹا کر راہِ حیات کو گلزار بنانے کی سعی میں لگے رہنا چاہیے' یہ بھی تو دیکھو فطرت کے حسن سے ہمیں کس قدر راحت ملتی ہے۔ محنت کر کے تھک جائیں۔ جدوجہد میں ناکام ہو جائیں یا آزمائشوں سے گھبرا جائیں' تو فطرت کے حسن میں ماما جیسی راحت ملتی ہے۔''

میری آنکھیں رازی پر تھیں اور ذہن سوچ میں گم' رازی کا ایک ایک لفظ قطرہ شبنم کی طرح میرے دل پر گر رہا تھا۔

☆......☆......☆

تین دن کی اس خطرناک ایڈونچر سے بھرپور مہم جوئی کے بعد ہم دونوں بہن بھائی گھر آ پہنچے تھے۔

''میری ننھی پری!'' ڈیڈی نے مجھے اور بھیا کو گلے سے لگالیا۔

''یقین جانو تم دونوں کی غیر موجودگی میں گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم لوگوں میں ایک سیلانی روح پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔'' ممی ہماری نظر اتارتے ہوئے بولیں۔

''ممی! یہ دیکھیے آپ کے لائف بوائے کا کمال۔'' میں نے اپنا ہیٹ اتارا اور اس کے ساتھ ہی میری لائف' میرے بال چمکتے ہوئے لہرانے لگے۔

''اِٹس مائی چیلنج، مسٹر ڈیڈی۔'' ممی نے مجھے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے ...... میرا بھروسہ' میرا چیلنج، میرا اعتماد' میرا لائف بوائے شیمپو کا کمال، ہر سفر میں، بالوں کا محافظ' ہر مہم میں اپنے ملک پروٹین اور Almond Oil والے اجزاء کے ساتھ بالوں کی خوبصورتی اور نشوونما میں اضافہ کرتا ہے۔''

''سچ ہے لائف بوائے شیمپو ہم سب کے بالوں کا محافظ ہے۔'' رازی بھیا نے ہیٹ اتارا تو ان کے بال بھی شائن کر رہے تھے۔

''کاش میں نے بھی لائف بوائے شیمپو استعمال کیا ہوتا......'' ڈیڈی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو ممی نے اُن کی بات کاٹ دی۔

''تو پریاں کبھی آپ کے بال نہ لے کر جاتیں۔'' ممی کے اس جملے پر سب ہنسنے لگے تھے۔

☆☆......☆☆☆

دامِ دل

قسط 23

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

چمن نے بہت پُرسکون ہو کر ڈاکٹر علی کی کال ریسیو کی اور سیل فون کان سے لگالیا۔
وگرنہ سیل کی رنگ ٹون سنتے ہی اُس کا ذہن بانو آپا کی طرف گیا تھا۔
''جی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم!'' اُس نے عام سے انداز میں سلام کیا۔ عطیہ بیگم چمن کی طرف یوں

دیکھ رہی تھیں جیسے ڈاکٹر علی نے کوئی خوشخبری سنانے کے لیے فون کیا ہو۔ ایسی خوشخبری جس کا وہ مدتوں سے انتظار کر رہی تھیں، انداز ایسا ہی تھا۔

''وعلیکم السلام!'' دوسری طرف ڈاکٹر علی نے بڑے شگفتہ انداز میں جواب دیا تھا۔

''آپ سنایئے سب خیریت ہے آپ کی Mother In Law کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' وہ بہت شائستہ انداز میں خیر خیریت پوچھ رہے تھے۔

''Mother In Law......؟'' اُسے فوراً ہی کوئی جواب نا سوجھا پتہ نہیں کیوں یہ لفظ نامانوس اور اجنبی سا لگا تھا۔ یوں لگا جیسے کوئی زخم آنچ دینے لگا ہو۔

''جی اللہ کا شکر ہے ڈاکٹر صاحب...... پہلے سے کافی بہتر ہیں تو پھر اب آپ کہاں ہیں اپنے گھر میں یا اپنی Mother کے گھر میں؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔

اپنا گھر چمن پر پھر کوئی جیسے پہاڑ آن گرا جس کے بوجھ تلے دب کر اُس کی آواز بھی نہ نکل پائی۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے عطیہ بیگم کی طرف دیکھتی رہی۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور اپنی دانست میں اپنی آواز کو ہشاش بشاش بنانے کی ممکنہ سعی کی۔

''جی میں امی کے پاس ہوں...... میرا مطلب ہے اپنی Mother کے پاس......''

''Oh Thanks God میں بس یہی چاہ رہا تھا کہ آپ کسی طرح اپنی Mother کے گھر آئیں تو میں آپ سے Request کروں کہ پلیز تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی بچیوں کو ٹینا سے ملانے کے لیے لے آئیں...... وہ بہت ضد کر رہی ہے اب تو میں ہاسپٹل جانے لگتا ہوں تو بس...... بری طرح مچل جاتی ہے۔ کسی طرح سے قابو میں نہیں آتی...... ایک ہی ضد پکڑی ہوئی ہے کہ مہوش اور ماہ پارہ کو خود جا کر لے کر آئیں...... میں نے فون کیا تھا آپ کی والدہ سے بات ہوئی تھی۔ اب مجھے بتائیں کہ کب تشریف لا رہی ہیں۔''

ڈاکٹر علی درحقیقت ٹینا کی طرف سے بہت زیادہ Stress میں تھے اور اپنی عادت کے خلاف انہوں نے ایک ہی سانس میں پہلی بار اتنی ساری باتیں کیں تھیں۔

''جی...... میں ابھی تو کچھ بھی نہیں کہہ سکوں گی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے ہی پہنچی ہوں۔ ہاں...... جیسے ہی پروگرام ہوا میں فون کر کے آپ کو ضرور بتا دوں گی۔'' چمن نے اُلجھے اُلجھے انداز میں جواب دیا تھا۔

''Kindly آپ جلدی سوچ لیں اور میرے گھر جانے سے پہلے سوچ لیں ورنہ یوں سمجھ لیں کہ گھر پہنچ کر بس میری شامت ہی آ جائے گی۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا...... دیکھیں ایک دو بچے ہیں جن کے ساتھ ٹینا کی فرینڈ شپ ہو گئی ہے مگر کچھ اس طرح سے معاملہ ہے کہ وہ میرے فون کرنے سے فوراً نہیں آ سکتے بچے تو آنا چاہتے ہیں بس...... شاید اُن کے والدین نہیں چاہتے۔ میری بات کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں گی۔'' ڈاکٹر علی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنی بہن کی خوشی کی بھیک مانگ رہے ہوں۔

چمن عجیب گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ کبھی سوچ رہی تھی کہ اگر افشاں کا فون آ گیا اور اس نے اسپتال بلا لیا...... پھر کیا کہے گی...... کہ میں نہیں آ سکتی بچیوں کو اُن کی Mam سے ملانے کے لیے کہیں اور آئی ہوں......''

اتنی Serious Situation میں یہ بات بالکل بہانے بازی ہی لگے گی۔ اور پھر اُس کا اپنا دل بھی کہتا تھا کہ بانو آپا اُس سے معافی مانگ چکی ہیں اور اگر اُن کے بلانے پر نا گئی تو وہ کہیں کسی وہم کا شکار نہ ہو جائیں۔ اُن کے ذہن پر بوجھ نا پڑے اُن کی طبیعت پھر نا بگڑنے لگے۔

''جی...... پھر کیا کہتی ہیں......'' چمن کی طویل خاموشی نے ڈاکٹر علی کو امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب میں وعدہ نہیں کرتی لیکن آپ میری بات کا یقین کریں اپنی طرف سے میں پوری کوشش کروں گی۔ امی بتا رہی تھیں کہ مہوش اور ماہ پارہ بھی ٹینا کے پاس جانے کی بہت ضد کر رہی ہیں۔ انشاء اللہ جیسے ہی موقع ملتا ہے میں بچیوں کو لے کر ضرور آؤں گی۔''

''Thank You بہت بہت شکریہ۔ مجھے پوری امید ہے آپ اپنے وعدے کا پاس کریں گی۔'' ڈاکٹر علی کا انداز اور دنوں سے بہت مختلف لگ رہا تھا بہن کی ضد اور محبت نے انہیں جیسے معمولات کی زنجیر سے آزاد کیا ہوا تھا۔

''Sure ڈاکٹر صاحب انشاء اللہ تعالیٰ میں بہت جلد ہی آپ سے فون پر بات کرتی ہوں۔''

یہ کہہ کر چمن نے اپنی طرف سے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''بیٹا کیوں ڈاکٹر بے چارے سے خوشامدیں کرا رہی ہو شام کو بچیوں کو لے کر چلی جانا...... بہن کی محبت میں اصرار کر رہا ہے اللہ اُس کو جزائے خیر دے۔ کس طرح اپنی معذور بہن کا باپ بھی بنا ہوا اور ماں بھی......'' عطیہ بیگم بڑی دلسوزی سے کہہ رہی تھیں۔

''امی! وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کو پتہ ہے امی جان اِس وقت Hospitalized ہیں۔ کسی وقت بھی افشاں نے گاڑی بھیج دی تو جانا پڑے گا۔''

''بس بیٹا جتنا ہم کر سکتے تھے کر چکے اللہ آپا بانو کو صحت تندرستی دے وہ ساتھ خیریت کے اسپتال سے نکل کر اپنے گھر پہنچیں۔ افشاں سے کہہ دینا کہ اب تم وہاں نہیں آؤ گی۔'' عطیہ بیگم نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

''امی اتنا آسان نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا امی جان کی حالت کافی سنبھل گئی ہے۔ میری کوشش ہے کہ میری طرف سے انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے...... امی انہوں نے رو رو کر مجھ سے معافی مانگی ہے اب مجھے خیال تو رکھنا ہی پڑے گا۔ اور میری بات کا یقین رکھیں میں پرانے رشتے کی وجہ سے اُن کا خیال نہیں کر رہی ہوں۔ میں صرف اور صرف انسانیت کے ناطے اور اللہ کے خوف سے اُن کا احساس کر رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ عطیہ بیگم کے ہونٹوں پر قفل پڑ گیا تھا۔

''امی آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔'' اس نے گم صم تفکرات میں گھری ماں کو ایک نظر دیکھا تو ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

آخر اُس کی ماں اُس کی تکلیفوں کے احساس سے ہی تو اتنی بے قرار و بے چین ہے...... اس کے سُکھ کے لیے سوچتی رہتی ہے۔

''بیٹا...... بس میں نے تو زندگی سے اب تک یہی سیکھا ہے کہ آزمائے ہوئے کو آزمانا سب سے بڑی نادانی ہے...... مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا......''

عطیہ بیگم نے اپنی بات میں بھرپور اور کما حقہ وزن ڈالنے کے لیے دلیل سے کام لیا۔ یوں جیسے وہ اس کے پیروں سے لپٹ کر آگے بڑھنے سے روک رہی ہوں۔

''امی آپ جیسے کہیں گی...... میں ویسے کروں گی......'' چمن دوبارہ اُن کے پاس بیٹھ گئی اور اُن کے گلے میں پیار سے بازو حمائل کر دیا۔

''آپ یقین رکھیں...... مجھے کسی بھی قسم کی خوش فہمی نہیں ہے۔ ثمر میری یادداشت میں تو ہے...... میرے دل میں نہیں ہے۔'' بولتے ہوئے چمن کی آواز بھرانے لگی۔

عطیہ بیگم نے تڑپ کر چمن کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''بس بیٹا...... یہ سوچ کر بھول جاؤ کہ یہ ہماری تقدیر میں لکھی ہوئی آزمائش تھی۔'' انہوں نے چمن کی پیشانی چوم لی اور اپنے ہونٹوں میں اس کے آنسو جذب کرنے لگیں۔

چمن کو محسوس ہوا...... زندگی پانے کے بعد بس سب سے زیادہ ضروری ماں ہی ہے۔'' ماں کا لمس اسے کسی قلعے کی چہار دیواری محسوس ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

ثمر احتیاطاً الارم لگا کر سو گیا تھا۔ ماں اسپتال میں تھیں بے فکری سے لمبی تان کر تو نہیں سو سکتا تھا۔

الارم بجتے ہی وہ یوں ہڑبڑا کر بیٹھا جیسے صورِ اسرافیل سُن لی ہو۔ ایک جست میں بیڈ سے اُتر کر نیچے آیا تھا۔ اور اپنا...... سیل فون اُٹھا کر ٹائم دیکھا۔ کیونکہ اِسے خود بھی یاد نہیں تھا کہ کتنے بجے کا الارم لگایا تھا۔

ٹائم دیکھ کر ہی اُسے اندازہ ہوا کہ مسلسل چار گھنٹے سے گہری نیند سویا ہوا تھا۔

نیند کا پردہ ذہن سے ہٹتے ہی سب سے پہلا خیال اُسے ندا کا آیا۔ نیند پوری ہوگئی تھی اعصاب پُرسکون ہوگئے تھے اب اُسے ملال ستانے لگے کہ وہ کس طرح منہ پھیر کر چل دیا تھا اور گھر آ کر فون بھی آف کر دیا تھا۔ وہ بہت بے چین ہوگی۔

ساتھ میں اُسے یہ بھی خیال آیا کہ وہ دور دراز کا نیا نویلا مہمان اُس کے بارے میں جانے کیا سوچ رہا ہوگا یہ سوچتے ہی اُس نے فون کو آن کیا اور ندا کا نمبر ڈائل کیا۔

سیل کان سے لگا لیا اور کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

رنگ پاس ہو رہی تھی لیکن ریسیو نہیں ہوئی...... یہاں تک کہ ریکارڈنگ شروع ہوگئی کے آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔

''شاید واش روم میں شاور وغیرہ لے رہی ہو۔ تھوڑی دیر میں ٹرائی کرتا ہوں۔''

اُس نے یہ سوچ کر سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور کچن کی طرف چل پڑا۔

گھر لاک ہونے کی وجہ سے گھر میں کوئی نوکر نہیں تھا۔ فل ٹائم نوکر تو کئی مہینے پہلے گاؤں جا چکا اور آنے کا نام نہیں لیتا تھا اور وہ ملازمہ جو صبح آ کر مغرب کے بعد جاتی تھی۔ وہ آج کل گھر بند ہونے کی وجہ سے نہیں آ رہی تھی۔

اس لیے اُسے اپنے لیے ایک کپ چائے خود ہی بنانا تھی۔ کچن میں داخل ہو کر اُس نے کچن کا طائرانہ جائزہ لیا...... سامنے ہی اُسے Electric Kettle نظر آ گئی۔ Kattle میں پانی ڈال کر اُس نے

Plug لگایا پھر Tea Bag اور Sugar کی تلاش شروع کی دو تین کیبنیٹ کھولے ایک کیبنیٹ میں اُسے بہر حال اپنی مطلوبہ اشیاء دستیاب ہو گئیں۔

چائے بنانے کے دوران اُس کا ذہن اب چمن کی بجائے ارسلان کی طرف لگا ہوا تھا۔

وہ گھر سیل کرنے آیا ہے اِس کا مطلب یہ ہے کہ گھر بہت جلد ہی سیل ہو جائے گا اور اُسے ندا کے لیے فی الفور ایک گھر کا انتظام بھی کرنا ہے۔

وہ بوائل پانی کپ میں ڈالتے ہوئے آنے والے دنوں کی پلاننگ کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

ندا Lounge میں ایک فیشن میگزین لیے لیٹی ہوئی تھی۔

ارسلان کمرے سے نکل کر بڑا حیران حیران سا باہر آیا۔ ایک نظر ندا پر ڈالی اور دوسری Cell Phone پر ارے تمہارے فون پر کال آ رہی تھی تم نے اٹینڈ نہیں کی۔''

''آپ کو کیا پتہ میں نے اٹینڈ کی ہے یا نہیں کی ہے...... جائیں آپ جا کر آرام کریں۔'' ندا نے پھکڑ پن سے تکڑا توڑ جواب دیا۔

''بھئی میں تو اِس لیے آ گیا تھا کہ میں نے فون کی رنگ ضرور سنی لیکن تمہاری آواز نہیں سنی...... ہو سکتا ہے تمہارے Husband کا فون ہو...... دیکھ تو لیتیں۔''

''آپ کو بہت فکر ہے میرے Husband کی میں کہہ رہی ہوں نا کہ جا کر ریسٹ کیجیے آپ۔''

ارسلان اُس کے کہنے سے ریسٹ کرنے تو نہیں گیا بلکہ اُس نے ندا کا Cell Phone اُٹھا کر آنے والی Call کا پتہ چلانا ضروری خیال کیا۔

''یہ دیکھو میں پہلے ہی کہہ رہا تھا تمہارے Dear Husband کی Call آ رہی تھی۔ دیکھ تو لیتیں۔''

''اُفوہ...... کیا ہے آپ کو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے ہیں پتہ ہے مجھ کو اُن ہی کی کال ہو گی اور کون فون کرے گا۔''

''تمہیں پتا تھا پھر بھی تم نے کال ریسیو نہیں کی۔ Amazing......''

ارسلان نے حیرت سے کندھے اُچکائے۔

''اگر میں اُن کی کال ریسیو کر لیتی...... وہ میری خیر خیریت پوچھتے اور بہت سکون میں آ جاتے...... اب میں نے اُن کی کال ریسیو نہیں کی نا...... گرتے پڑتے آئیں گے اُس کی بات سن کر ارسلان نے بے ڈھنگے پن سے قہقہہ لگایا تھا۔

''اُف خدایا...... جب بندے کی نئی نئی شادی ہوتی ہے بیوی کی ایک آواز پر کیسا گرتا پڑتا آتا ہے اور جب شادی پرانی ہو جاتی ہے تو اُس کے کانوں پر ڈھکن لگ جاتے ہیں۔ پھر اُسے سب کی آوازیں آتی ہیں سوائے بیوی کی آواز کے......''

''آپ اپنے Experience اپنے پاس رکھیں۔ سارے Husband آپ جیسے نہیں ہوتے اور پھر آپ نے کون سا اپنی شادی پرانی ہونے دی ہے جو آپ کو اتنا Experience ہو گا...... بے چاری کو

آتے ہی چلا گیا۔''

''بے چاری! کون بے چاری..... تم کس کو بے چاری کہہ رہی ہو آپ کی Ex Wife کو اور کون بے چاری ہو گی بلکہ وہ تو Double بے چاری ہے..... ایک تو یہ کہ اُس نے آپ سے شادی کی سیکنڈ شادی کر کے اُس کو چھوڑ بھی دیا.....''

''ارے وہ بے چاری نہیں ہے..... بس یہ پہننے والے کپڑے بچے ہیں میرے تن پر..... سمجھیں.....''

''کیا مطلب.....؟''

ندا کے خاک پلے نہیں پڑا۔

''ارے بھئی امریکا میں جب کوئی شخص اپنی بیوی کو Divorce کرتا ہے نا تو وہ اتنا کچھ لے کر جاتی ہے کہ بس بے چارہ شوہر جو کپڑے پہنے ہوتا ہے وہ ہی اُس کے پاس بچتے ہیں۔''

''اتنے سخت Laws ہیں وہاں کے.....''

''ہائے اللہ کتنے اچھے Laws ہیں عورت کو کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ ارسلان بھائی پھر تو وہاں عورتیں یہی کرتی رہتی ہوں گی۔''

''کیا کرتی رہتی ہوں گی؟''

اب ارسلان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''بھئی جس سے شادی کرو بہت سارے Dollar Earn کرو پھر کسی دوسرے سے کر لو پھر کسی تیسرے سے کر لو۔''

''اب اتنا بھی آسان نہیں ہوتا۔''

ارسلان نے بیچ میں ٹوک دیا۔

''اگر کوئی عورت اس طرح سے ہر چار چار مہینے بعد Marriage Papers سائن کرتی رہے گی نا تو کرمنل ریکارڈ بن جائے گا۔ اتنی پاگل نہیں ہوتیں وہاں کی عورتیں..... ہاں یہاں سے کوئی جا کر وہاں یہ والی حرکتیں کرنے کی کوشش کرے تو پھر اُسے آٹے دال کا بھاؤ پتہ چل جائے گا۔ کم سے کم 18 سال تو Lockup میں رہے گی۔''

''یہ دیکھیں کہتے ہیں امریکا اور یورپ میں بہت..... انصاف ہے۔ قانون کی عزت کی جاتی ہے یعنی اپنی عورتوں کو..... لاکھوں ڈالر دلواتے ہیں۔ اگر یہی حرکت کوئی باہر کی عورت کرے تو 18 سال کے لیے Lockup میں چلی جائے گی۔''

''خیر چھوڑیں مجھے کیا لینا کوئی 18 سال کے لیے جائے یا 20 سال کے لیے جائے..... آپ تو یوں ہی فضول باتیں کر کے دماغ خراب کر دیتے ہیں۔ میں اتنے آرام سے Artical پڑھ رہی تھی لے کے.....''

ندا نے منہ بنا کر فیشن میگزین اپنے چہرے کے آگے کر لیا۔

ارسلان نے چند ثانیوں اُس کی طرف دیکھا۔ پھر دوبارہ اُسی کمرے کی طرف چل پڑا جو اُس کے آنے سے پہلے ندا اور ثمر کا بیڈ روم تھا۔ اور اِس وقت گیسٹ روم میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اُس کے وہاں سے ہٹتے ہی ندا نے میگزین بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیا اور اپنا Cell Phone اُٹھا لیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''بہت اچھا کیا میں نے......'' اُس نے خود کو شاباش دی ایک تو موڈ آف کر کے چلے گئے اور پھر جانے کے بعد ایک کال بھی نہیں کی۔

''اب میں بھی اُن کی call نہیں ریسیو کروں گی۔ اب جو بات بھی ہوگی آمنے سامنے ہوگی۔'' ندا اپنی دانست میں کوئی بہت عظیم فیصلہ کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

چمن نے بچیوں کے اسکول سے آنے تک ساری تیاری مکمل کر لی تھی۔ اُن کے Dress بھی Select کر لیے تھے اور Shose بھی......اُن کی پسند کا کھانا بھی بنا لیا تھا۔

عطیہ بیگم بھی آج کئی دنوں کے بعد آرام کر رہی تھیں۔ چمن کے گھر میں ہونے کی وجہ سے اب انہیں مکمل بے فکری تھی۔

بچیاں گھر میں داخل ہوتے ہی خالہ کو دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگیں تھیں۔

دور سے ہی بھاگتی ہوئی آئیں اور چمن سے لپٹ گئیں۔

''خالہ آپ آ گئیں؟''

چھوٹی ماہ پارہ نے بہت زور سے اپنے بازوؤں میں بھینچنے کی کوشش کی یہ الگ بات کہ اُس کے بازوؤں کا گھر اتنگ پڑ گیا تھا۔ وہ بھی بچیوں کو دیکھ کر خوش ہوئی تھی جیسے جانے کتنے برسوں کے بعد انہیں دیکھا ہو۔

بس اب آپ لوگ جلدی جلدی Uniform Change کریں Fresh ہو جائیں۔ میں نے آپ کی پسند کے Noodles بھی بنائے ہیں کٹلٹس بھی بنائے ہیں۔ فرائز بھی بنائے ہیں آپ لنچ کریں پھر ریسٹ کریں۔ اگر موقع ملا تو شام کو کہیں گھومنے پھرنے بھی جائیں گے۔''

چمن نے جان بوجھ کر ٹینا کا نام نہیں لیا کیونکہ ابھی اُسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ شام کو بچیوں کو لے جا پائے گی یا نہیں......بہر حال ابھی تک افشاں کی طرف سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ سب خیریت ہے۔''

''خالہ ہم کہیں بھی سیر کرنے نہیں جائیں گے ہم ٹینا کے گھر جائیں گے......آپ کو پتہ ہے ڈاکٹر صاحب نے نانو کو فون کیا تھا وہ کہہ رہے تھے ٹینا ہمیں بہت مس کر رہی ہے۔ خالہ ہم ٹینا کے گھر جائیں گے۔''

مہوش نے چمن کا ہاتھ پکڑ کر کوئی پکا وعدہ لینے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

''ہاں ہاں بیٹا دیکھیے اگر Possible ہوا تو ضرور جائیں گے۔'' آپ کو پتہ ہے نا کے ثمر انکل کی Mother......Hospital میں ایڈمٹ ہیں۔ ہوسکتا ہے مجھے تھوڑی دیر کے لیے وہاں جانا پڑے......انشاء اللہ وہ بہت جلد اپنے گھر چلی جائیں گی۔ اور میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ پھر تو ہم روزانہ ٹینا کے پاس جایا کریں گے۔''

''Promise'' ماہ پارہ کو مایوسی تو ضرور ہوئی لیکن آئندہ کے امکانات نے خالہ سے پکا وعدہ لینے کے لیے بھی اُکسایا۔

''Promise......'' چمن نے ماہ پارہ کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بہت پیار سے دبا دیا۔
ماہ پارہ وعدہ لیتے ہی مطمئن اور خوش نظر آنے لگی تھی۔ کیا افشاں کو خود فون کر کے کہہ دوں کہ میں امی کے گھر میں ہوں اور آج شاید Hospital نا آسکوں...... پھر دیکھتی ہوں وہ کیا جواب دیتی ہیں اُس کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب کے ہاں جانے یا نا جانے کا فیصلہ ہوگا۔'' وہ بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ثمر چائے تیار کر کے Lounge میں آ گیا تھا۔ خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ عجیب سی وحشت دل پر برسنے لگی۔
چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی اُسے پھر ندا کا خیال آیا چائے کا کپ رکھ کر اُس نے آگے بڑھ کر اپنا Cell Phone اٹھایا اور ندا کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔
نمبر ڈائل کر کے اُس نے سیل کان سے لگایا اپنا چائے کا کپ اُٹھا کر ایک گھونٹ بھرا...... Ring Pass ہو رہی تھی اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگلے ہی کسی پل ندا کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائے گی۔
سب سے پہلے تو وہ یہی پوچھے گا کہ اُس نے اُس کی کال ریسیو نہیں کی اور پھر خود کال بیک بھی نہیں کی۔ لیکن اِس بار بھی رنگ پاس ہوتی رہی۔ اس کے بعد ریکارڈنگ شروع ہوگئی۔ کہ جواب موصول نہیں ہو رہا' برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔
کیا مسئلہ ہے اُس نے چائے کا کپ Table پر رکھ کر Cell Phone کی طرف گھورنا شروع کر دیا تھا جیسے اُس کے سوال کا جواب وہاں سے آئے گا۔
اب اُس کا ذہن چائے کی طرف سے ہٹ کر ندا کی طرف لگ چکا تھا۔
''کال کیوں نہیں Pick کر رہی اب تو 15 منٹ ہو چکے ہیں۔ اب دل کو عجیب سی بے قراری لاحق ہوگئی تو اُس نے فوراً ہی ری ڈائل کر دیا۔ اور سیل فون کان سے لگا لیا۔
اس مرتبہ بھی رنگ پاس ہوتی رہی اور پھر ریکارڈنگ شروع ہوگئی۔ اب اُس پر جھنجلاہٹ سی طاری ہوگئی۔
اس بات پر تو اُسے کوئی شک ہی نہیں تھا کہ اعلیٰ درجے کی غیر ذمہ دار اور لاپرواہ ہے ہوسکتا ہے فون کہیں پڑا ہو اور خود کہیں ہو......
اُس نے پٹخنے کے انداز میں سیل فون رکھ دیا اور اس خیال سے چائے پینے لگا کہ تھوڑی دیر میں تو بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی۔
جلدی جلدی چائے پی کچھ اِس انداز سے جیسے نیلام گھر کے کسی کھیل میں حصہ لے رہا ہو۔ چائے کا کپ پہلے ختم کرنے پر کوئی انعام ملنے والا ہو۔
کپ خالی کر کے اُس نے ٹیبل پر رکھا اور اپنا سیل اٹھا لیا اور ندا کا نمبر ڈائل کیا۔ اس مرتبہ بھی پہلے ہی کی طرح کال پک نہیں ہوئی اور صرف ریکارڈنگ سننے کو ملی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ بری طرح جھلا گیا۔ ابھی گھر جا کر اس کی ٹھیک ٹھاک خبر لیتا ہوں۔
اتنا تو خیال کرنا چاہیے کہ کیا سچویشن چل رہی ہے بے وقوف ہے پاگل تو نہیں ہے...... اُسے ندا پر شدت سے غصہ آنے لگا۔ اور کون سا اُس کے ساتھ روحانی محبت کے سلسلے تھے...... ایک دم ہی مروتوں اور لحاظ کے پردے چاک ہو گئے۔
بہت بدلحاظی سے اُس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بڑے نامانوس سے الفاظ ذہن میں یوں بہنے لگے جیسے کسی شاعر پر شعر نازل ہوتا ہے۔
اس احمق سی لڑکی کی تو لاٹری نکل گئی ہے۔
''بیٹھی رہتی...... اپنے نانا کے ساتھ اس ویران سے گھر میں......''
''مجھے کوئی لڑکیوں کی کمی تھی...... امی جان کو ایک اشارہ کرتا...... پتہ نہیں کتنی لڑکیاں دکھا دیتیں...... میں تو اس ناشکری عورت پر وقت ضائع کر رہا تھا۔
میری زندگی میں تو عورت کا مطلب دولت کا نقصان ہے۔
لاکھوں اس 'کیکر' پر انگور کی طرح چڑھا دیے...... دو ڈھائی لاکھ اس بے وقوف عقل سے پیدل لڑکی پر خرچ ہو گئے۔
جلد ہی کوئی خوش خبری سنائے تو وصولی ہو...... ورنہ سمجھو یہ جواء بھی ہار گیا۔
ثمر بالکل دیوانہ وار کیفیت میں پہنچ کر اپنی زندگی کا تجزیہ کر رہا تھا۔
دیوانگی کا صرف ایک ہی مثبت پہلو ہے کہ دیوانے کی سوچ میں ارادے کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔

☆......☆......☆

''جی امی میں خود سوچ رہی ہوں کہ میں ماہ پارہ اور مہوش کو شام کو ڈاکٹر علی کے ہاں لے جاؤں گی...... ڈاکٹر علی بھی کہہ رہے ہیں ٹینا ان دونوں سے ملنے کے لیے بہت ضد کرتی رہتی ہے اور یہ دونوں بھی مجھے کہتی رہتی ہیں۔''
چمن Wardrobe کھولے اپنے لیے کسی مناسب لباس کا انتخاب کرتے ہوئے ماں سے کہہ رہی تھی۔
عطیہ بیگم جو اُسے یاد دہانی کرانے آئیں تھی کہ آج وہ کسی بھی طرح ان دونوں کو لے کر ڈاکٹر علی کے ہاں چلی جائے۔ لاشعوری طور پر جیسے وہ اُس کے تمام راستے مسدود کر رہی تھیں جو بانو آپا کی طرف جاتے تھے یا ثمر سے کوئی راہ و رسم پیدا کرنے کا بہانہ بن سکتے تھے۔
ہاں اسی لیے میں تمہیں کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر علی کئی مرتبہ یاد دلا چکے ہیں کہ جیسے ہی چمن کو وقت ملے تو وہ بچیوں کو لے کر آ جائے ٹینا بہت یاد کرتی ہے۔
''بیٹا ثواب کا کام ہے بے ماں باپ کی معذور بچی ہے۔ ہماری بچیاں بھی وہاں جاتی ہیں تو خوش ہو جاتی ہیں۔''
''جی امی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''
چمن اس وقت غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھی بہت کچھ اُس کے ذہن میں چل رہا تھا جو وہ عطیہ

بیگم کے ساتھ Share کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ کیونکہ اِس صورت میں اُن کی طرف سے جو ردِعمل آتا اُس ردعمل میں اُس کا کافی وقت خرچ ہو سکتا تھا۔

''بہت...... اچھا لڑکا ہے۔ بس ساری بات قسمت کی ہے کیسی عقل سے پیدل لڑکی تھی جو اُسے ٹھکرا کر چلی گئی۔

عطیہ بیگم خود کلامی کے انداز میں بولیں تو چمن نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔

اُسے کچھ سمجھ نا آئی کہ عطیہ بیگم اِس وقت ڈاکٹر علی کا ذکر لے کر کیوں بیٹھ گئیں۔

''جی امی...... بس جو ہونا ہوتا ہے وہ تو ہو ہی جاتا ہے......'' چمن نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ افشاں کو فون کر کے کہہ دو کہ بس اب وہ اپنی ماں کی دیکھ بھال خود کرے تمہیں اِدھر بچیوں کے بہت کام ہیں۔''

عطیہ بیگم نے تو اتنا دوٹوک اور واضح انداز اختیار کیا تھا کہ چمن لب بستہ سی اُن کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ بولنے کا یارا نا تھا اور الفاظ ایسے نہیں تھے۔ وہ ادا کرتی اور آناً فاناً عطیہ بیگم کے خیالات میں تبدیلی آ جاتی۔

اُس نے خاموشی ہی میں بہتری سمجھی...... دیکھیں کیا ہوتا ہے اب یہ سوچ رہی تھی۔

''میں کئی بار تم سے ایک بات کرنے تمہارے پاس آئی...... مگر پتہ نہیں کیوں رک گئی۔'' عطیہ بیگم اب بھی بولتے ہوئے جھجک رہی تھیں۔

چمن نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسی بھی کیا بات ہے امی...... جو آپ کو اتنی مشکل ہو رہی ہے۔ آپ میری ماں ہیں مجھ سے سب کچھ کہہ سکتی ہیں۔''

چمن نے اُلجھن، وسواس اور تفکرات سے پُر نظروں سے ماں کے چہرے کا جائزہ لیا۔

''دیکھو بیٹا...... زندگی ناقدروں پر قربان کرنا اللہ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرنا ہے جس کو خدمت' محبت' قربانی کی قدر کا اندازہ نہ ہو اس پر یہ قیمتی جذبات نچھاور نہیں کرتے چاہئیں۔''

''میری ایک بیٹی دنیا سے ترستی چلی گئی...... میں دن رات تمہاری خوشیاں دیکھنے کے لیے تڑپتی ہوں۔''

''یہ تو قسمت کی بات ہے امی...... کون انسان ہے جو خوش خوش زندگی گزارنا نہیں چاہتا؟'' چمن نے بے ساختگی سے ماں کی بات کاٹ کر اُداس سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''قسمت کس کو کہتے ہیں بیٹا......''

''زندگی میں ملنے والے موقع ہی قسمت کہلاتے ہیں۔''

چمن کو عطیہ بیگم کی بات ذرا سمجھ نہ آئی۔

''علی بہت اچھا ہے۔ اس کا گھر بھی ناقدری کے ہاتھوں ٹوٹا ہے۔ میں سمجھتی ہوں قدرت بلاوجہ علی کو تمہارے سامنے نہیں لائی...... بات آگے بڑھے تو روکنا مت۔ عطیہ بیگم کی شدید آرزو اب الفاظ میں ڈھل گئی تھی۔ چمن ششدر سی دیکھ رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

گیٹ ندا نے ہی کھولا تھا۔ ثمر نے اُس کا چہرہ دیکھتے ہی بھانپ لیا تھا کہ اُس کا موڈ بہت خراب ہے۔

''السلام علیکم!'' اُس نے بھی بہت سپاٹ انداز میں سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' ندا نے نظریں چراتے ہوئے گیٹ بند کر دیا تھا۔ پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے Lounge میں چلے آئے تھے۔ بہت خاموشی ہے مہمان شاید سیر سپاٹے کو نکلے ہوئے ہیں۔ نا چاہتے ہوئے بھی ثمر کے لہجے میں طنز چھپا ہوا تھا۔

سیر سپاٹے کر کے آگئے ہیں وہ گھر میں ہی ہیں۔'' ندا نے چیختے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

ثمر نے ایک گہری نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالی اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

''فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں۔ بلکہ میرا خیال ہے مجھے یاد ہے تم نے فون بند کیا ہوا ہے۔''

ثمر کی بات سن کر ندا نے بڑے شان بے نیازی سے ثمر کی طرف دیکھا اور ٹیبل پر پھیلے ہوئے اخبار رسالے سمیٹنے لگی یوں جیسے جواب دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی وہ کھلم کھلا اپنی خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا آخر موڈ خراب ہونے کی کوئی وجہ، تمہیں پتہ ہے نا کیا Situation چل رہی ہے۔ امی Hospitalized ہیں دن رات کا ہوش نہیں ہے۔ Office سے بھی فون آتے رہتے ہیں۔ 20'20 گھنٹے جاگنے کے بعد بندہ آرام کرنا چاہتا ہے اگر تم یہ بات نہیں سمجھوگی تو پھر مجھے بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

ثمر زیادہ دیر بدمزگی برداشت نا کر سکا۔ اُسے عادت ہی نہیں تھی۔ ایک ناز برداری کرنے والی عورت پانچ سال اُس کے ساتھ رہی تھی۔ ہمیشہ اُس کا موڈ دیکھ کر فیصلہ کرتی تھی کہ بات کی جائے یا خاموش رہا جائے۔ اور...... ندا اُس کا الٹ تھی۔ اُس کو صرف اپنی بات کہنے سے دلچسپی ہوتی تھی۔ سامنے والے کا ردِ عمل کیا ہے یہ اُس کا مسئلہ کبھی نہیں تھا اور نا ہو سکتا تھا۔

''لیکن آپ بھی غور کر لیجیے آپ کو میرا فون بند کرنے سے بہت تکلیف ہوئی ہے۔ ذرا سوچیے مجھے آپ کا فون بند ملتا ہے تو میری کیا حالت ہوتی ہے۔''

ندا نے اب باقاعدہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچاتے ہوئے کہا تھا۔

ثمر کو غصہ تو بہت شدید آیا تھا مگر اُسے یاد تھا کہ گھر میں مہمان ہیں...... یہ تھوڑی دیر پہلے ہی ندا اُسے بتا چکی تھی کہ مہمان گھر میں ہی ہیں...... اب یہ اُسے نہیں پتا تھا کہ مہمان اُسی...... بیڈ روم میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں جو عارضی طور پر اُس کی قیام گاہ بنا ہوا تھا اور جس پر قبضہ ہو چکا تھا۔

اِس سے پیشتر کے بات آگے بڑھتی...... ارسلان بڑے اسٹائل میں چلتا ہوا اُن کے درمیان آ کھڑا ہوا تھا۔

''Hello Every Body......'' اُس نے ثمر کی طرف مسکرا کر دیکھا قریب آنے کی بجائے بہت لمبا ہاتھ کر کے اُس سے مصافحہ کرنے کی کوشش کی...... ثمر ہی کو تھوڑا آگے ہو کر اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔

''How Are You۔'' ثمر کا انداز بہت سرد اور بہت پُر تکلف تھا۔

''I Am Fine...... آپ یہ بتائیں کے آپ کی Mom کی طبیعت کیسی ہے؟'' ارسلان نے

خالص امریکن اسٹائل میں ثمر کی ماں کی خیریت دریافت کی تھی۔
''Thank God پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ آپ سنائیں کیا چل رہا ہے؟'' پھر ندا کی طرف دیکھا۔
''ندا تم نے گیسٹ کو Lunch وغیرہ تو دے دیا تھا نا میرا مطلب ہے Lunch کر چکے ہیں۔''
''Oh Sure لنچ کر چکے ہیں۔'' ندا نے روٹھے روٹھے انداز میں ثمر کی طرف دیکھا۔
''اگر آپ نے Lunch نہیں کیا تو لے کر آؤں۔'' ثمر کی تو ویسے ہی جان جلی ہوئی تھی وہ بھوک پیاس کے احساس سے بہت آگے تھا۔ بہت مشکل سے اُس نے خود کو قابو کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔
''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ بھوک ہوگی تو میں خود ہی کہہ دوں گا۔''
اُس کا انداز ٹالنے جیسا تھا۔ پھر اُس نے اپنا رخ ارسلان کی طرف موڑ لیا۔
ندا نے مجھے بتایا تھا کہ شاید آپ یہ گھر Sale کرنے آئے ہیں۔ کچھ بات بنی...... کسی سے بات ہوئی؟''
ثمر چاہتا تھا کہ بدمزگی کے اِس ماحول کو ختم کر کے وہ تھوڑا سا وقت مہمان کو دے تا کہ اِس تکلف سے بھی جان چھوٹے۔ جو اُس کے حساب سے زبردستی مہمان ہونے کی وجہ سے گلے پڑ رہا تھا۔
''جی ہاں میری دو تین لوگوں سے بات ہوئی ہے دو تین Property Agencies میں، میں گیا تھا۔ لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کنڈیشن میں آپ کو وہ Rate نہیں مل پائیں گے جو آپ چاہ رہے ہیں۔''
ارسلان ثمر کو جواب دیتے ہوئے ساتھ ساتھ اُس کو غور سے دیکھ بھی رہا تھا۔ یوں جیسے اُسے کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ اور وہ اُسے سمجھنا چاہ رہا تھا۔ یا ثمر کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی جو اُسے ٹھنک رہی تھی چبھ رہی تھی۔
''میرا خیال ہے بالکل صحیح کہا ہے جس نے کہا ہے یہ پلاٹ کی قیمت پر ہی جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اِس کو White Wash کرائے ہوئے بھی 20 سال ہو گئے ہیں۔'' ثمر نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔
ارسلان کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔
''20 سال...... Twenty Years میرا خیال ہے جب اس گھر کی کنسٹرکشن ہوئی تھی First اور White Wash...... Last Time تب ہی ہوا ہوگا۔'' اُس نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔
''آپ لوگوں نے اپنے گھر کا بالکل بھی خیال نہیں کیا...... آخر یہ بات تو بہت پہلے سوچنا چاہیے تھی۔ اتنا بڑا گھر اِس کو...... Maintain بھی کرنا ہے...... ہوسکتا ہے کل کو Sale Out بھی کرنا پڑ جائے...... آپ لوگ تو شاید یہ گھر بنا کر بھول ہی گئے تھے۔''
ثمر نے ایک نگاہِ غلط ندا پر ڈالتے ہوئے ارسلان سے کہا۔
ندا اُن دونوں کی باتوں سے جیسے بیزار ہو گئی تھی۔ وہ تو شاید تنہائی میں دل کی بھڑاس نکالنے کی منتظر تھی۔
کچھ ارسلان کا Feed کیا ہوا پیٹ میں ابھارا پیدا کر رہا تھا کچھ اُسے ویسے ہی بدگمانیاں ستا رہی تھیں جن کی بنیاد بھی ارسلان ہی تھا...... کچھ آمیزش نرگس کی طرف سے تھی۔
اُس کے وہ چھوٹے چھوٹے طنزیہ جملے جو بظاہر اُس نے ہوا میں اڑائے تھے مگر وہ...... ندا کے دماغ

میں کسی کونے میں کانٹوں کی طرح گڑ چکے تھے۔

☆......☆......☆

شام کی نرم دھوپ لان میں بکھری ہوئی تھی ہر شے نمایاں تھی۔ ابھی گہری شام ہونے میں کافی وقت تھا۔ لیکن دوپہر کی تمازت آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر علی کے اس خوبصورت سے لان میں اس وقت بہت رونق تھی۔ چمن اور ڈاکٹر علی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ماہ پارہ، مہوش اور ثینا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

تینوں کی معصومانہ اور بے ساختہ حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر علی کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ اس وقت جیسے انہیں دنیا کی سب سے بڑی خوشی حاصل ہوئی ہو جسے وہ سمیٹ نا پا رہے ہوں۔

اپنی بہن کو خوش دیکھ کر اُن کی آنکھوں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اِس وقت انہیں سوائے اس خیال کے کہ اُن کی بہن بہت خوش ہے کچھ اور خیال نہیں۔

چمن نے ایک اڑتی پڑتی نگاہ میں اُن کی آنکھوں کو پڑھا تھا۔ اُس کے دل میں درحقیقت ڈاکٹر علی کے لیے بڑے نیک جذبات ابھرے تھے۔ آج کل کے زمانے میں تو لوگ اچھے بھلے رشتے داروں کو ٹائم نہیں دے پاتے اور خاص طور پر وہ بھی مرد...... چمن کو ثینا کی قسمت پر رشک آیا کہ وہ ماں باپ سے محروم ہونے کے باوجود بہت امان میں تھی۔ ایک ٹوٹ کر چاہنے والا بھائی...... اُس کے لیے بہت بڑی نعمت تھا۔

سوچتے سوچتے عطیہ بیگم کی باتیں اُس کے ذہن میں گونجنے لگیں اُس نے بلا ارادہ بہت بے ساختگی سے ڈاکٹر علی کی طرف دیکھا تھا۔

امی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں وہ لڑکی بہت بدنصیب تھی جو اتنے اچھے ساتھی کو چھوڑ کر چلی گئی۔ چمن کا ذہن اِدھر اُدھر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ...... ایک انجانا سا خوف بھی دل کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اُسے یوں لگ رہا تھا کہ ابھی افشاں کی کال آئے گی اور وہ پھر اُسے اصرار کر کے بلائے گی۔ اگر اُس کی کال آگئی اور اُس نے رات رُکنے کو کہا تو پھر اُس کو کوئی مناسب جواب تو دینا ہوگا۔ امی نے تو سختی سے منع کیا ہے۔ اور میں...... امی کی بات نظر انداز کر کے اب من مانی نہیں کر سکتی...... میں نے اپنی ماں کو کیا پہلے ہی کم دکھ دیے ہیں میں اُن کو اب مزید آزمائش میں نہیں ڈالوں گی۔''

''اللہ کرے امی جان بالکل ٹھیک ہو جائیں۔''

''آپ بہت گہری سوچ میں ہیں اور آپ کی چائے بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔''

ڈاکٹر علی کی مدھم سی آواز نے اُسے خیال کی گہرائیوں سے باہر نکال کھڑا کیا۔ اُس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ چائے کا کپ اٹھالیا۔

''نہیں بس...... کچھ ایسے ہی...... بس بچیوں ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

چمن نے اپنی دانست میں بات بنانے کی کوشش کی۔

''اتنا نا سوچا کریں۔ آپ یہ دیکھیے کے جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو ہی جاتا ہے۔ ہو کر رہتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے اِن بچیوں کو ماں کے بعد آپ جیسی خالہ دی ہے۔ یہی دیکھ لیجیے اُسے اپنی مخلوق کا کتنا خیال رہتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھیے کے بچیاں اس وقت کتنی خوش ہیں اور اُن کی اس خوشی کا ذریعہ آپ بنی

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں
آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو
زرمبادلہ بھیجیے
اندرون ملک =/890 روپے
ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے
زر سالانہ
کویت 55 امریکی ڈالرز
ایران 55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب 55 امریکی ڈالرز
سری لنکا 55 امریکی ڈالرز
یو اے ای 55 امریکی ڈالرز
جاپان 55 امریکی ڈالرز
مصر 55 امریکی ڈالرز
لیبیا 55 امریکی ڈالرز
یونان 55 امریکی ڈالرز
ڈنمارک 55 امریکی ڈالرز
فرانس 55 امریکی ڈالرز
جرمنی 55 امریکی ڈالرز
برطانیہ 55 امریکی ڈالرز
ہالینڈ 55 امریکی ڈالرز
ناروے 55 امریکی ڈالرز
پولینڈ 55 امریکی ڈالرز
امریکہ 65 امریکی ڈالرز
کینیڈا 65 امریکی ڈالرز
افریقہ 65 امریکی ڈالرز
آسٹریلیا 65 امریکی ڈالرز
آج ہی رابطہ کیجیے
88-C II - فرسٹ فلور - خیابانِ جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی
فون نمبر 021-35893121 - 35893122

ہیں۔"

"بہت ساری باتیں ایسی ہیں مسز چمن جو انسانوں کو بہت دیر میں سمجھ آتی ہیں۔ بعض اوقات جو موجود ہوتا ہے وہ ہماری خواہشات کے خلاف نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہم مطمئن نہیں ہوتے اور کبھی ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا جس کی ہم خواہش کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر بھی وقت آرام سے گزر جاتا ہے۔"

ڈاکٹر علی کو جانے کیا خیال آیا تھا...... وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔

چمن خود بھی غیر حاضر دماغی میں مبتلا تھی۔ کچھ سمجھی کچھ نہیں ٹینا کی ایک زوردار چیخ نے ماحول کا تاثر ہی بدل دیا۔

ڈاکٹر علی نے چونک کر ٹینا کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیے۔

ٹینا نے وہ چیخ خوشی کی انتہا پر ماری تھی۔ شاید ماہ پارہ کی کوئی بات اُسے اچھی لگ گئی تھی اور وہ جی بھر کر لطف اندوز ہو رہی تھی ساتھ ہی تالیاں بھی بجا رہی تھی۔

چمن بہت غور سے ٹینا کو دیکھ رہی تھی۔

اٹھارہ انیس سال کا جوان وجود اور آنکھوں میں پانچ چھ سال کے بچوں جیسی معصومیت اور بے ساختگی...... تالی بجانے کا انداز یوں جیسے ابھی دودھ چھوٹا ہو اور بچے نے تالی بجانا سیکھی ہو۔

خالہ ٹینا نے Five کا ٹیبل سنایا ہے اور وہ جیت گئی ہے۔ میں نے اُس کو فرائز کھلائے ہیں۔"

ماہ پارہ تیز تیز بھاگتے ہوئے چمن کی طرف آئی اور Running Comentary کرتی ہوئی اُسی طرح دوڑتی ہوئی ٹینا کے پاس چلی گئی۔

علی اور چمن بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے کہ ٹینا کو Table Five کا یاد ہو گیا۔" ڈاکٹر علی کی ساری توجہ ابھی بھی اپنی بہن کی طرف تھی۔

چمن کے ساتھ اُن کا ملاقات کا انداز بہت پُرتکلف اور شائستہ اور بہترین آداب میزبانی پر مبنی تھا وہ شاید ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں بھولتے تھے کہ چمن ایک شادی شدہ عورت ہے۔

"پھول اور بچے...... اس دنیا کا حسن ہیں...... علی' ٹینا' مہ وش و ماہ پارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ چمن نے تائید کے انداز میں سر ہلا دیا۔

"میں بھی اسی طرح سوچتی ہوں...... میرے پاس میری بہن کی یہ دو نشانیاں زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے کافی ہیں۔"

چمن آج علی سے بہت ہی مختلف انداز میں بات چیت کر رہی تھی۔ عطیہ بیگم نے اس کی سیدھی سادی سوچ کو آج ایک Turning Point دیا تھا۔ اسے آج اپنے اور علی کے درمیان ہلکا' مہین' خوش رنگ پردہ حائل محسوس ہو رہا تھا۔

ابھی تو اِس کے نام کے ساتھ ثمر کا نام پیوستہ تھا۔ اسے تو کسی اور مرد کے تصور سے ہی یہ سوچ کر خوف محسوس ہونے لگا گویا وہ کوئی انتہائی سنگین غیر اخلاقی حرکت کی مرتکب ہو رہی ہو۔ علی پر ارادے کے ساتھ نظر ڈالنا بھی اسے کوئی جرم محسوس ہو رہا تھا۔

آج کی ملاقات میں بے ساختگی اور بہاؤ نہیں تھا۔ بات بات پر لگتا تھا کہ روانی سے چلتی گاڑی کے سامنے بار بار اسپیڈ بریکر آ رہے ہوں۔

''آپ کی شادی کو غالباً زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یا شاید آپ نے بتایا تھا میں بھول گیا ہوں......''

علی نے 'بہن کی نشانیوں' پر توجہ کی تو خیال آیا کہ چمن شادی شدہ ہونے کے باوجود اولاد سے محروم ہے۔

''پانچ سال ہو چکے ہیں...... اکیس سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ اس بار 26th برتھ ڈے منا چکی ہوں۔''

چمن نے جان بوجھ کر ایک سنجیدہ موضوع کو بلبلے کی طرح اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے مزاحیہ انداز میں جواب دیا۔

علی نے چونک کر دیکھا تھا...... ''پانچ سال......!''

''پانچ سال ایک عرصہ ہوتا ہے۔ پانچ سال سے وہ ایک مرد کی زوجیت میں ہے۔ ایک مضبوط بندھن مزید مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔''

''Oh Good'' ...... علی کو بہرحال کچھ تو کہنا تھا۔

اب وہ یہ وضاحت تو کرنے سے رہا کہ وہ 'اولاد' کے ضمن میں اس سے یونہی برمحل سوالات چھیڑ بیٹھا تھا۔

''اوہ تو یہ بات ہے...... ابھی اولاد نہیں ہے...... اسی وجہ سے وہ مرحومہ بہن کی بچیوں کو اتنا وقت دیتی چلی آ رہی ہے۔''

اور یقیناً اس کا شوہر بھی ایک بہترین انسان ہے جو بیوی کی ان ذمہ داریوں میں اس کا ساتھ دے رہا ہے جو بہرحال اُس کی ذمہ داریاں ہرگز نہیں ہیں۔''

علی کے دل میں چمن کے شوہر کے لیے بھی نیک جذبات بیدار ہوئے۔

''آپ کی مدر اِن لاء انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی تو میں آپ کو اپنے گھر 'اسپیشل ڈنر' پر انوائٹ کروں گا۔''

''آپ اپنے ہزبینڈ اور مدر اِن لاء کے ساتھ آئیں گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اسی بہانے آپ کی فیملی سے بھی ایک اچھی سی میٹنگ ہو جائے گی۔''

ڈاکٹر علی بہت شائستگی سے آئندہ کی پلاننگ پر آ گئے۔ یا شاید لاشعوری طور پر وہ چمن کے جیون ساتھی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

''جی......!'' چمن نے چونک کر علی کی طرف دیکھا۔

''آپ میری بہن کی خوشی کے لیے اتنا کچھ کر سکتی ہیں...... تو میرا بھی کچھ فرض بنتا ہے اسپیشلی آپ کے ہزبینڈ کا تو بہت سارا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو آپ کو Allowed کرتے ہیں تو آپ ٹینا کے لیے وقت نکال کر آتی ہیں۔''

''اس کا ایک خوبصورت انداز یہ ہے کہ ہم کسی دن ساتھ بیٹھ کر اچھا سا کھانا کھائیں ایک دوسرے کے لیے وقت نکالیں۔''

ڈاکٹر علی بول رہے تھے۔ چمن کا دل کسی پاتال کی اتھاہ گہرائی میں اترتا جا رہا تھا۔

''Oh Sure......'' چمن کو بہر حال کچھ تو کہنا تھا۔

''میں سات بجے ہاسپٹل کے لیے گھر سے نکل جاؤں گا۔ مگر آپ اور بچیاں آج ٹینا کے ساتھ ڈنر کیے بغیر نہیں جائیں گی۔''

''اندر Cook بچیوں کی پسند کی چیزیں تیار کر رہا ہے۔ میں آپ کو انفارم کر رہا ہوں۔ آپ سے 'صلح' نہیں لے رہا۔''

ڈاکٹر علی عثمان کے حتمی و قطعی انداز پر چمن نے بڑی بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''پھر کبھی سہی......کل ویک اینڈ نہیں ہے......بچیاں لیٹ سوئیں گی تو صبح اٹھتے ہوئے بہت تنگ کریں گی۔ پلیز......ٹرائی ٹو انڈراسٹینڈ......'' چمن نے ایک انداز میں بڑے ملتجی انداز میں معذرت کی تھی۔

''میں کہہ دیتا ہوں کہ آٹھ بجے ڈنر Serve کر دیا جائے۔ نو بجے ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔''

''مسئلہ ڈراپ کا نہیں ہے۔''

''مسئلہ کوئی بھی نہیں ہے......بات تو بچیوں کی خوشی کی ہے......ایک نظر تینوں کی طرف دیکھ کر ایمانداری سے بتائیں......اس وقت زمین پر اس منظر سے زیادہ حسین منظر کوئی ہو سکتا ہے۔''

''نیچر اس وقت 'فل موڈ' میں ہے......میرے گھر میں سوائے خوشیوں کے اس وقت اور کچھ نہیں ہے۔''

ڈاکٹر علی عثمان کے انداز میں اصرار سے زیادہ بات منوانے کا مان تھا۔

چمن کی سوچ شکر کی انتہا پر پہنچ کر نئے سرے سے بانو آپا کی طرف مڑ گئی۔

''افشاں کا فون نہیں آیا۔''

''اس کا مطلب سب خیریت ہے......چلو یہ بھی شکر ہے۔''

وہ سکھ اور سکون کی اداکاری کرتے کرتے نڈھال ہوئی جاتی تھی۔ اور ڈاکٹر علی نے 'دورانیہ' بڑھا دیا تھا۔

''میں ایک دو ضروری فون کر کے ابھی آتا ہوں......'' ڈاکٹر علی کو معاً اپنے فرائض یاد آئے تو عجلت کے انداز میں کھڑے ہو کر گویا ہوئے۔

وہ سانسیں جو خشک سوکھی جھاڑیوں سے اٹک بھٹک کر پھیپھڑوں کو چھوتی محسوس ہو رہی تھی ایک دم ہموار ہو گئیں۔

ڈاکٹر علی کے اٹھتے ہی اس نے کھل کر سانس لیا تھا۔

☆......☆......☆

''آپ کا موڈ کیوں خراب ہے؟ میں نے تو آپ کی امی جان کو بیمار نہیں کیا؟ میں ان کی Take Care کر سکتی ہوں، آپ کا بر ڈن شیئر کر سکتی ہوں۔ اب آپ خود ہی ان سے چھپا رہے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' تنہائی اور موقع ملتے ہی ندا پھٹ پڑی۔

شادی شدہ زندگی کو اسی لیے پریکٹیکل لائف کہتے ہیں کہ دو گھڑی کے رومانس کے بعد آٹے دال کے بھاؤ شروع ہو جاتے ہیں۔

تصوف اور محبت کی پُراسرار دنیا کی کہانی

خانقاہ

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں کی حیرت ناک داستان

کاوش صدیقی ایک معروف لکھاری، جن کی تحریریں نگاہوں سے نہیں دل سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے قلم کا نوکیلا، کٹیلا نشتر، معاشرے کے ان پہلوؤں کو کھوجتا تراشتا ہے جو عیاں ہونے کے باوجود پوشیدہ رہتے ہیں۔ خانقاہ ان کی تیکھی اور چبھتی نشتر زنی ہے جو کہ ہمارے اطراف سے گندھی ہے۔ پیروں، وڈیروں، سیاسی کٹھ پتلیوں کے پراسرار معاملات، سچے، جھوٹے، مصلحت آمیز، دَروغ گو کے درمیان ایک ''مردِ درویش'' کی عجیب داستان جس کے افکار سے دنیا بدل گئی۔

ان کے لئے بطور خاص جو اچھی تحریریں پڑھنا جانتے بھی ہیں اور چاہتے بھی ہیں۔

ماہِ جنوری سے ماہنامہ 'سچی کہانیاں'
میں ہنگامہ خیز آغاز

نکاح کی قید سے آزاد رومانس کی گھڑیاں پُھر سے اڑ جاتی ہیں۔ چاہئے پانی بے بنیاد سہانے خواب دیکھ کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر چل پڑتے ہیں۔ ساری رات خواب ناک باتیں یاد کر کے جاگتے ہیں۔ اگلے دن پھر تصوراتی منصوبہ بندی شروع ہو جاتی ہے۔

شادی کے بعد پہلی صبح ہی واش روم میں ٹوتھ پیسٹ نہ ملے تو نئی نویلی دلہن 'شب زفاف' کے نشے میں دُھت دولہا کو دس باتیں سنا سکتی ہے۔ جواب میں وہ رات بھر جاگنے کی وجہ سے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ باپ کے گھر سے جہیز میں ٹوتھ پیسٹ بھی لے آتیں۔''

ایسا کچھ واقعتاً ہو جائے تو پہلے دن سے پتہ چل جاتا ہے کہ 'پریکٹیکل لائف' کا درحقیقت مطلب کیا ہوتا ہے۔

''ایک دم جاہل لڑکی ہو...... بولنے کی جلدی پڑی رہتی ہے۔ ماں مر رہی ہے میری سارے کام آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ تمہیں تمیز نہیں ہے کہ پریشانی میں شوہر کا کس طرح خیال رکھا جاتا ہے؟''

ثمر جوار سلان کے بے تکے اندازِ ملاقات پر تپا ہوا تھا۔ ندا پر چڑھ دوڑا موقع کی نزاکت' 'سچویشن' کسی بات کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔''

''نکاح کیا ہے تم سے خفیہ تعلقات نہیں ہیں...... امی کی بیماری کی وجہ سے احتیاط کر رہا ہوں۔''

''اور ہاں سنو...... اپنی ساری ضروری چیزیں اس گھر سے سمیٹ لو...... اب تم یہاں نہیں رُکو گی۔ چاہے میں تمہیں کسی گیسٹ ہاؤس میں کمرہ لے کر دوں بس تم یہاں نہیں رہو گی۔ اس گھر کی چابیاں گھر کے وارث کے حوالے کر دو۔ بیچے یا آگ لگائے اُس کی مرضی...... ہمارا کوئی Concern نہیں۔'' ثمر کا درحقیقت بی پی شوٹ کر گیا تھا۔

اس نے ایک سانس میں ندا کو ہزار سنادیں۔

لعن، طعن، تنقید، فیصلے...... تابڑ توڑ برس رہے تھے۔ ندا تو ہونق سی ہو کر بس دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

بڑی 'دل چڑھی' بیگم بن کر ثمر کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ الٹے لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

اس سے پیشتر کہ کچھ بات سنبھالنے کی کوشش کرتی ثمر کے سیل فون کی رنگ نے تعطل واقع کر دیا۔

ثمر نے سانسیں سنبھالتے ہوئے سیل فون اُٹھا کر دیکھا۔ افشاں کی کال آ رہی تھی۔ اس نے بہت متفکر انداز میں کال ریسیو کی تھی۔

''ہاں...... ہیلو...... افشاں؟''

''بھائی...... بھائی......'' افشاں کچھ کہنے کے بجائے بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ ثمر کے وجود میں روح جیسے شعلوں میں گھر کر راستہ ڈھونڈنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑتی محسوس ہونے لگی۔

''افشاں......'' اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

''بھائی...... امی...... امی...... چلی گئیں......'' افشاں نے بمشکل جملہ مکمل کیا۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون......''

ثمر کے منہ سے نکلا اور ندا دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

عالیہ حرا

صحرا کے مسافر

''میں تمہاری شادی ایسے شخص سے کروں گی جو تمہیں بہت چاہے۔ اُس کی زندگی میں تمہاری محبت کے سوا کچھ نہ ہو......اور جو صرف تمہارے لیے ہو۔'' میرے اندر کی محرومی......تمنا بن کر لبوں پر تھی۔'' خدا نہ کرے کہ تم عظمت کے مینار......

''ماما......محبت، اطاعت، فرمانبرداری...... پاپا کے ساتھ آپ کا اٹوٹ تعلق کون سا ہے؟'' عندلیب پہلے چونکی اور اقصیٰ کا پورا سوال سن کر ساکت ہو گئیں۔

اور......باہر چلتے قدم رُک گئے۔

''میرا خیال ہے آپ کو بابا کو 'محبت' دے کر ہنڈرڈ فی فیصد مارکس دینے چاہیے۔ آخر چوبیس سالہ ازدواجی زندگی کا سوال ہے۔'' اقصیٰ کی آنکھوں میں شرارت تھی وہ ایسے ہی سوالنامہ ترتیب دے کر سب کو امتحان میں ڈال کر اُن کا امتحان لیتی تھی۔

اقصیٰ کے سوال نے مجھے جھنجھوڑ دیا تھا۔

محبت، اطاعت، فرمانبرداری میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا......کتنا مشکل تھا اور اقصیٰ نے ازخود نتیجہ ترتیب دے لیا تھا۔

اب مسکراتے ہوئے میرا امتحان لے رہی تھی۔

''پتہ ہے ماما...... خالہ جان نے محبت کا انتخاب کیا وہ کہتی ہیں کہ اتنی لمبی ازدواجی زندگی کی خوشحالی کا راز تو صرف 'محبت' ہے محبت ہوگی تو اطاعت بھی ہوگی اور فرمانبرداری بھی......''

(محبت سے محبت ہو تو انتخاب محبت ہی ہوگا)

اقصیٰ عندلیب کے احساسات سے بے پرواہ رائے دے رہی تھی۔

میں نے خالہ جان سے کہا کہ ماما کا جواب بھی یہ ہوگا مگر......!'' وہ سانس لینے کو رُکی۔ میں نے بے چینی سے اُسے دیکھا۔

''مگر انہوں نے کہا......نہیں......عندلیب کا جواب یہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے ایسا کیوں کہا ماما''

میں اندر تک برف ہو گئی۔ اک وہی تو میری ہمراز تھیں۔

''اور پتہ ہے ماما دادا جان نے کیا جواب دیا۔'' پھر شرارتی سی چمک اٹھی۔ میں باقاعدہ گھوم گئی۔

''سوری ماما...... بڑوں سے ایسے سوال نہیں

پوچھتے مگر...... انہوں نے خود ہی جواب دیا۔ میں تو چاچو سے ممانی سے چھوٹی لالہ سے پوچھ رہی تھی۔"

دادا جان نے کہا بیٹا اس عمر میں زوجہ کی فرمانبرداری نہ کرو تو در پردہ محبت بھی نہیں ملے گی...... ہاہاہا......" میں مسکرا بھی نہ سکی۔

میرے اندر دھواں تھا۔ بعض جوابات روح کھینچ لیتے ہیں صدیوں کا حساب کتاب سامنے آجاتا ہے۔ سود و زیاں ...... یا پھر......"

اور چاچو قہقہہ لگاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اب تو بس...... حق...... یا...... اطاعت ہی اطاعت رہ گئی ہے، کیوں زوجہ؟" اور چاچی صرف آنکھیں دکھا کر رہ گئیں۔

"ماما...... کیا محبت وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے؟" اک اور سوال......

"آپ بول کیوں نہیں رہیں؟" میری خاموشی کو اب نوٹ کیا تھا۔

مگر اُس کے مطلب کا جواب میرے پاس نہیں تھا اور میرے مطلب کا جواب اُسے ہضم نہیں ہوتا۔

اور میں سوچتی ہوں کہ میرے سوال نے سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ

'' ہم محبت زیادہ کرتے ہیں یا فرمانبرداری......''

شتیاق احمد کا زاویہ بند کر کے میری جانب متوجہ ہوئی۔

'' بتائیں نا خالہ نے ایسے کیوں کہا اور آپ کا جواب کیا ہے؟''

'' تم نے اپنے پاپا سے پوچھا؟''

'' نہیں...... پتا نہیں ہے اُن سے، انہیں ویسے بھی میرے فضول سوالوں سے چڑ ہے۔'' عندلیب نے گہرا سانس لیا۔

اُن کی بیٹی جواب کی منتظر تھی اور اس سے زیادہ باہر کھڑا شخص......

اُسے بھی ہلکی سی آس تھی۔ عندلیب کا انتخاب 'محبت' ہوگا...... اُس کے منہ سے جواب سننا چاہتا تھا۔

'' تمہارے خیال میں پاپا کا جواب کیا ہوگا؟''

'' محبت......!'' کشن گود میں رکھ کر محبت سے کہا۔

'' اور...... آپ جیسی عورت قابل محبت بھی ہے، اُن کی دوسری شادی کو برداشت کرنا، اُن کے گھر والوں کو اہمیت دینا، باز پرس نہ کرنا، کوئی سوال نہ کرنا۔''

'' ماما......!'' یک لخت وہ سنجیدہ ہوگئی۔

'' کتنی عظیم ہیں آپ؟''

'' کیا میں عظیم بن سکوں گی...... اتنی...... اگر میرے ساتھ ایسا ہوا...... یا آپ......''

'' اللہ نہ کرے......'' میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

'' میں تمہاری شادی ایسے شخص سے کروں گی جو تمہیں بہت چاہے۔ اُس کی زندگی میں تمہاری محبت کے سوا کچھ نہ ہو...... اور جو صرف تمہارے لیے ہو۔''

میرے اندر کی محرومی...... تمنا بن کر لبوں پر تھی۔

'' خدا نہ کرے کہ تم عظمت کے مینار تعمیر کرو۔''

(ایک مینار تمہاری ماں نے بنا لیا وہ کافی ہے)

'' آپ بتائیں نا آپ کس چیز کا انتخاب کریں گی۔''

'' چلو جا کر کام کرو بند کرو یہ سوال نامہ......''

'' تو آپ کہہ کیوں نہیں دیتیں...... محبت......''

میں اُس کا چمکتا چہرہ دیکھتی رہی۔

'' میں سوچتی ہوں ماما عمر کے اس حصے میں آ کر محبت شدید ہو جاتی ہے۔''

'' محبت شدید نہیں ہوتی بلکہ...... تحمل مزاج ہو جاتی ہے۔''

آپ میرا سوال گول کیوں کر رہی ہیں؟'' پھر اُسے موضوع یاد آ گیا۔

'' دے تو دیا ہے تم نے جواب......'' اُس کے بال سنوارے۔

'' وہ تو میں نے اخذ کیا ہے؟'' میں ہنس دی۔

'' میرا جواب یہ ہی ہے۔''

'' پھر...... خالہ نے ایسا کیوں کہا؟'' میں چپ ہوگئی۔

اُس نے میرا گھونگھٹ اٹھا
کر
دھیرے سے کہا۔
میرا سب کچھ تمہارا ہے
سوائے دل کے
......اور
دل ہی نہ ہو تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔

'' اطاعت......!''

خاندان وقار کی بحالی کے لیے...... فرمانبردار عورت اپنی انا ہی ختم کر دیتی ہے۔

جسے بھرم کے سہارے میں نے زندگی گزار

دی۔
مگر یہ سب میں اقصیٰ سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ مگر اُسے میرا جواب بھی چاہیے تھا۔
میرے شوہر نے ساری عمر مجھے سب کچھ دیا...... بس اک 'محبت' ہی نہ تھی۔
پرائے دل کو محبت سے آباد نہ کرو تو محبت زدگان میں ہی شامل رہے گا نا......
اور اب وہ جتنی بھی محبت کرلیں۔ میرے لہو میں فرمانبرداری کا رنگ غالب ہے۔ تو محبت کیسے جئے گا۔
''ماما...... مردوں کو تو محبت ہی پسند ہوتی ہے۔ وہ محبت میں ہی اطاعت کرتے ہیں۔''
''نہیں بیٹا......!''
''محبت نہ بھی ہو تو...... فرمانبرداری کرنی پڑتی ہے۔ یہ مشرق کی ریت بھی ہے اور ہماری اقدار بھی ...... دل ٹوٹے، مسلے، لوٹے یا اُسے دھتکارا جائے......
خاندانی روایات کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے۔
''ماما...... محبت...... سمجھوتہ نہیں ہوتی۔''
''سمجھوتہ فرمانبرداری ہی تو ہے۔''
''مگر ماما......'' تذبذب کا شکار تھی۔
''یہ تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو چلو ہٹو...... بند کرو یہ سب...... نیا سوالنامہ ترتیب دو۔''
''مگر...... ماما...... میرا...... جواب؟''
''تمہیں سمجھ لینا چاہیے۔'' میں مسکرائی۔
''تو...... محبت!'' یقین سے مسکرائی۔
''نہیں......''
''محبت...... صرف محبت سے ہوتی ہے۔ جس شخص کو مجھ سے محبت نہیں۔ جب مجھے اُس کی ضرورت تھی خواہش تھی، اُن کی توجہ محبت کوئی اور تھی اب جب مجھے صبر آ گیا کہ ان کی محبت نصیب نہیں ہے تو وہ محبت دامن میں لیے آ گئے۔

''جب مجھے فرمانبرداری کرنا آ گئی۔ تو میں اُسے 'محبت' کیسے کہوں۔''
تمہارے پاپا اور میرا رشتہ اطاعت کا ہے جو انہوں نے کہا میں نے کر دیا۔ اُن کی خدمت میں فرمانبرداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔
اقصیٰ سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
''ما...... ما...... محبت...... پاپا کو تو ہے۔''
''نہیں ضرورت ہے اب میں ان کی ضرورت ہوں ان کے گھر کی نگہبان ہوں۔ محافظ ہوں، بچوں کی ماں ہوں۔''
''اور...... ماما......!'' اقصیٰ بے اختیار نزدیک ہوئی۔
''ہم سے آپ کا تعلق......؟'' اس کی نگاہوں میں خوف تھا۔
اُس کے لہجے میں اندیشہ......
''محبت......! محبت کا......''
میں نے اقصیٰ کو سینے سے لگا لیا۔ بے لوث بے ریا، منافقت، ریاکاری سے پاک......
میرے آنسو اُس کے بالوں میں گرنے لگے۔
حساب کتاب سے ماورا...... سود و زیاں سے دور...... باہر کھڑا شخص دیوار کے ساتھ ڈھے گیا۔
عندلیب کے صبر نے انہیں اُس سے محبت میں مبتلا کر دیا تھا اور...... وہ......''
''وہ ٹھیک تو کہہ رہی تھی۔ زندگی میں سود و زیاں تو ہوتا ہے۔ زیاں ہمیشہ عورت کے حصے میں آتا ہے۔ مگر آج...... آج اک مرد کا حصہ بن گیا تھا، زیاں......!''
جوانی میں جو فصل اپنے رویوں سے بوتے ہیں اُسی فصل کی کٹائی تو بڑھاپے میں کی جاتی ہے۔
اور شکست کے آنسو کسی کے دامن کو بھگوتے چلے گئے۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

احمد سجاد بابر

اماوس میں گھرا چاند

''یار بھاڑ میں جائے فائزہ اور پورا معاشرہ۔ ہم نے ٹھیکہ نہیں لیا ہوا کہ لٹھ اٹھا کر ہر کسی کے پیچھے دوڑتے پھریں، ہر کسی نے اپنا جواب خود دینا ہے، تم بھی اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ آئی سمجھ میں۔'' زارا کا سٹیمنا اتنا ہی تھا، لمبی بات اس سے برداشت نہیں......

''میں اندر آسکتی ہوں......؟''

بائیں ہاتھ سے دروازہ ذرا سا کھول کر زارا نے پوچھا، دائیں ہاتھ میں کاغذات کی فائل تھامے، آدھی دروازے سے باہر کھڑی، وہ دروازے میں جمی اجازت ملنے کی منتظر تھی۔

''جی جی کیوں نہیں، تشریف لایئے۔''

اندر سے آواز آنے پر وہ کمرے داخل ہو گئی۔ کمرے کا ماحول یخ بستہ تھا، باہر جون کی لو چل رہی تھی، اوپر سے ویٹنگ روم میں ایک چوں چوں کرتا پنکھا دل جلا رہا تھا۔ ایسے میں اسے لگا کہ جسم و جان کی ساری گرمی پل بھر میں کہیں غائب ہو چکی ہے۔ اندر کا ماحول روایتی انٹرویو والا ہی تھا۔ ایک بڑی سے میز کے پیچھے تین مرد اور ایک خاتون براجمان تھے۔ سپاٹ چہرے خود ہی بتا رہے تھے کہ وہ انٹرویو لے رہے ہیں۔

''تشریف رکھئے۔''

درمیان میں بیٹھے شخص نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ زارا نے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی سنبھالی۔

''میرا نام کرنل شیرازی ہے، برائٹ وے اسکول چین کا مالک ہوں میں، یہ احمد ہمدانی ہیں، پرنسپل آف دِس برانچ، یہ انصر صاحب ہیں، کو آرڈی نیٹر ہیں اسکول کے اور یہ شمسہ کنول ہیں، اسکول اکاونٹس کو دیکھتی ہیں۔''

درمیان میں کرّ و فر سے بیٹھے ادھیڑ عمر کے شخص نے سب کے تعارف کا فریضہ سرانجام دیا۔

''سر میں زارا سلیم ہوں۔''

زارا نے مختصر سا تعارف کراتے ہوئے بال واپس پینسل کی کورٹ میں پھینک دی۔

''مس زارا، ہم آپ کی سی وی ڈسکس کر رہے تھے، آپ ایم ایس سی میتھ تو ہیں مگر نہ آپ کے پاس سابقہ تجربہ ہے اور نہ ہی آپ نے بی ایڈ کیا ہوا ہے، ہم کیسے آپ پر ٹرسٹ کر سکتے ہیں، آپ میں ایسا کیا ایکسٹرا آڈنری ہے کہ آپ کو سلیکٹ کیا جائے۔''

کرنل شیرازی نے اس کی سامنے پڑی سی

وی پر نظر ڈالی جو اس نے اخباری اشتہار کے جواب میں روانہ کی تھی۔
''سر، میرے مارکس ہی میری شخصیت کا تعارف ہیں، رہی بات یہ کہ مجھے کیوں سلیکٹ کیا جائے، تو سر جاب مجھے ملے گی تو تجربہ آئے گا نا، آپ کی ایڈ میں تجربہ مانگا ہی نہیں گیا تھا، اور آخری بات یہ کہ مجھے خود پر اعتماد ہے کہ مجھے اپنا سبجیکٹ آتا ہے اور میں ڈیلیور بھی کر سکتی ہوں، جب انسان کے پاس نالج ہو، اپنے سبجیکٹ پر کمانڈ ہو تو باقی کمی بیشی پوری ہو ہی جاتی ہے۔''
زارا نے انتہائی اعتماد سے اپنی بات مکمل کی (نہ سلیکٹ کریں، بھڑاس تو نکال ہی لوں)۔
کمرے میں ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔
''اچھا آپ ذرا اس ڈیٹا کا گراف تو بنائیں۔''
احمد ہمدانی نے خشک انداز میں اس کی طرف رف پیڈ اور بال پوائنٹ بڑھائی۔ زارا کے لیے یہ معمولی سوال تھا جو اس نے لمحہ بھر میں حل کر دیا۔ اس کی تیزی پر احمد ہمدانی کے ماتھے پر بل سے پڑ گئے۔
''آپ ادارے کو کیا دے سکتی ہیں اور بدلے میں آپ کو کیا درکار ہے۔''
اسکول کے کوآرڈی نیٹر نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔
''سر میں ادارے کو اپنی صلاحیتیں، اپنی محنت دے سکتی ہوں اور بدلے میں ادارے سے توقع رکھوں گی کہ ادارہ مجھے معاشی بے فکری دے ورنہ معاشی فکر میرے ٹیلنٹ کو بھی زنگ آلود کر دے گی جو دراصل ادارے کا ہی نقصان ہو گا۔''
زارا نے آج سوچ رکھا تھا کہ وہ حقیقت پر مبنی جواب ہی دے گی چاہے کسی کو برا لگے، چاہے اس کی سلیکشن نہ بھی ہو۔
''ہونہہ۔ ٹھیک ہے مس زارا سلیم، آپ باہر تشریف رکھیں، ہم نے آج ہی ٹیچرز فائنل کرنے ہیں، آپ کو بتا دیا جائے گا۔''
کرنل شیرازی نے خشک لہجے میں اس کی فائل اس کی طرف بڑھائی اور وہ جلتی کڑھتی باہر آ کر بیٹھ گئی۔
ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ وہ گھر چلی جائے، یہاں دال گلتی نظر نہیں آ رہی تھی، ایک تو احمد ہمدانی کا خشمگیں انداز، دوسرے کرنل شیرازی کے سوالات، تیسرے امریکن لہجے میں انگلش بولتے امیدواروں کا جمِ غفیر، ہر سیٹ کے لیے سفارشی فون اور رقعے۔ اسے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ سلیکٹ ہو پائے گی۔
''زارا سلیم، گھر ہی چلو، ایک اور کڑی رات سہی۔''
زارا نے خود کلامی کی۔
اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ٹانگیں لمبی کر کے فائل گود میں رکھ لی۔ یہ ویٹنگ روم کا ایک تنہا گوشہ تھا، ساتھ ہی استقبالیہ کاونٹر تھا جس پر ایک الٹرا ماڈرن لڑکی بلاوجہ سمائل دے رہی تھی، اس کا ناکافی لباس اور عامیانہ انداز اسے مرکزِ نگاہ بنائے ہوئے تھا، ہال میں جگہ جگہ منتظر امیدواران امید اور ناامیدی کے درمیان ہلکورے لے رہے تھے، ان میں جدید تراش خراش کے ملبوسات میں مہکتی چہکتی لڑکیاں بھی تھیں اور سادہ اور سستا سا لباس پہنے، سادہ سے نقوش والی، بھاری بھرکم سا چشمہ لگائے، بالوں کو کس کر باندھے ہوئے زارا سلیم بھی تھی کہ جس کے گھر کا مستقبل اس کی ممکنہ نوکری سے جُڑا ہوا تھا، اپنی جگہ پر ہر امیدوار کسی نہ کسی وجہ سے پُر

امید تھا۔ ہال کا طائرانہ جائزہ لے کر زارا نے سر سیٹ کی پُشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔
''ہم کو جگنوؤں کے، تتلیوں کے دیس جانا ہے، ہمیں ماتھے پہ بوسا دو۔''
زارا نے خود سے سرگوشی کی اور تلخی سے مسکرانے لگی۔
''ایکسیوزمی۔''
ایک نسوانی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی جسے اس نے واہمہ سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا۔
''میں آپ سے مخاطب ہوں فرینڈ۔''
وہ نرم مہربان سی آواز دوبارہ اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو زارا نے کسلمندی سے آنکھیں کھولیں، اس کا سر اسی طرح کرسی کی پُشت پر دھرا تھا، نیم وا آنکھوں سے اس نے اُس لڑکی کو دیکھا۔
''جی فرمایئے، کرسی چاہیے آپ کو یا آپ نے مجھے مشورہ دینا ہے کہ میں چلی جاؤں گھر کیونکہ یہ سیٹ آپ کو پہلے ہی مل چکی ہے۔''
زارا نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔
''ارے ارے ایسی کوئی بات نہیں، اصل میں میں ابھی انٹرویو دے کر باہر آئی ہوں تو مجھے آپ کے پاس بیٹھنا اچھا لگا، اس وجہ سے۔''
جینز اور کُرتا زیبِ تن کیے، قیمتی گلاسز لگائے اُس لڑکی نے سادہ سے انداز میں کہا۔
''میں سارہ ہوں۔ سارہ ضیاء۔''
لڑکی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
''اور میرا نام میرے ماتھے پر چسپاں ہے، زارا سلیم۔ جو انٹرویو دینے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔''
دنیا جہان کا اجاڑ پن زارا کے لہجے میں سمٹ آیا تھا، اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس دنیا میں مِس فٹ ہے، اب وہ ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ سارہ بھی اس کے پاس کی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔
''آپ کے ماتھے پر تو روشن ستارے اور صبحِ نو کی تابانی چمک رہی ہے، تابانی بھی اندھیروں سے ہار نہیں مانتی زارا جی۔ فقط ایک روشنی کی کرن فصیلِ شب کی ہر دیوار گرا دیتی ہے اور آپ تو سراپا نور ہیں۔''
سارہ نے شوخی سے کہا۔
''لگتا ہے اردو کی سیٹ کے لیے آئی ہو۔''
زارا اس کے کمنٹس نظر انداز کرتے ہوئے اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔
''ٹھیک سمجھا تم نے، اردو میرا اپشن تھا، بہت دل سے پڑھا ہے میں نے اس سبجیکٹ کو۔''
سارہ نے سادگی سے کہا
''پھر تو تمہیں یہ نوکری ملنی چاہیے، حق ہے تمہارا، ہمیں تو کتابوں کے ہر ہر صفحے پر روٹی ہی کا گمان ہوا ہے۔''
اس بار زارا نے شگفتگی سے کہا، جانے کیوں سارہ اسے زندگی سے بھرپور لگی، ایسی لڑکی کہ جسے دیکھ کر جینے کو دل چاہے، اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ زیست کی ہر تلخی بھاپ بن کر اڑ چکی ہے اور وہ ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔
''کولڈ ڈرنک لو نا۔''
سارہ نے بیگ سے چپس کا پیکٹ اور کوک کا ٹن پیک اس کی طرف بڑھایا اور زارا نے بنا ہچکچاہٹ کے انہیں تھام لیا۔
''لگتا ہے آپ بھی پُر امید ہیں سیٹ ملنے کے لیے۔''
سارہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
''اس وقت تو میں صرف اس لیے یہاں بیٹھی ہوں تا کہ دھوپ کا دہکتا الاؤ ذرا دھیما پڑے تو باہر

نکلوں، جانے کتنی دور پیدل چل کر بس ملے گی، اتنے پیسے تو ہیں نہیں کہ نزدیکی اسٹاپ سے بیٹھ جاؤں۔''

زارا نے سادہ سا سچ بولا۔

''بہت تلخی ہے۔''

سارہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ببول پر گلاب تو نہیں لگتے مس سارہ۔ سو جو ہے وہ ہے۔''

زارا نے کندھے اچکائے۔

''سارہ ضیاء۔ زارا سلیم۔''

استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے فون رکھ کر پکارا۔

سارہ اور زارا اپنی بات بھول کر بے اختیار اپنی کرسیوں سے کھڑی ہو گئیں۔

''آپ سلیکٹ ہو چکے ہیں، اپائنٹمنٹ لیٹر ابھی آپ کو مل جاتے ہیں، آپ انہیں پڑھ لیں اور اگریمنٹ پر سائن کر دیں۔''

زارا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس ردِ عمل کا اظہار کرے، جیسے پورا ہال ایک دم سے خالی ہو گیا تھا، صرف وہ تھی اور خلا کا مہیب پھیلاؤ جس میں وہ کسی تنہا سیارے کی مانند چکرا رہی تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُسی کا نام پکارا گیا ہے، اس نے بے یقینی سے سارہ کی طرف دیکھا اور سارہ نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا، زارا دھم سے کرسی پر گر سی گئی۔!!

☆......☆......☆

سلمیٰ خاتون کچن کے ایک ایک ڈبے کو چھان پھٹک رہی تھی کہ تمام اناج، دالیں، چاول ملا کر کم سے کم ابال ہی لیں تو آج کی رات کٹے، اس کی آنکھوں سے آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔

''سوہنے رب، تو ہی غریب کی چادر کا محافظ ہے، تیرا شکر ہے مالک تو جس حال میں بھی رکھے۔''

اس نے یہ وقت نہ کبھی ماں باپ کے گھر میں دیکھا اور نہ ہی سلیم کے جیتے جی دیکھا، سلیم کا اپنا چلتا، پھلتا پھولتا جنرل سٹور تھا، گھر میں روپے پیسے کی فراوانی نہیں تو قلت بھی نہیں تھی، توکل اور صبر شکر کے سہارے زندگی اپنے ڈھب میں بہتی چلی جا رہی تھی جب ان کی پر سکون جنت میں بھونچال آ گیا، سڑک پار کرتے ہوئے سلیم کو ایک تیز رفتار ٹرک نے ہٹ کیا اور اس نے لمحہ بھر میں ہی جان دے دی، بچے اس وقت چھوٹے تھے۔

سب سے بڑی زارا، اس سے چھوٹا بنو، اور سب سے چھوٹا ٹیپو یہی اس کی کل کائنات تھی، سلمیٰ نے آنسو دل پر گرائے، آنکھیں پونچھی اور سلائی مشین کو سہارا اور اللہ کو نگہباں رکھ کر محنت مزدوری شروع کر دی، اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے گھر پر محلے کے بچوں کو قران پڑھانا شروع کر دیا، اسے اپنے گھر سے قران کی تعلیم ملی تھی، اس نے وہی تعلیم پھیلانی شروع کر دی، اس کے والد مرحوم دین کے مبلغ تھے، گھر میں جو سیکھا تھا، وہی کام آیا۔ تفسیر قران کچھ والد سے پڑھی تھی، کچھ مطالعہ کے باعث سیکھی اور تدریسِ قران کا سلسلہ شروع کر دیا، محلے میں اس کا نام احترام سے لیا جانے لگا، چھوٹا بڑا نہ صرف خالہ کہہ کر عزت دیتا تھا بلکہ اس کی چوکھٹ کی حفاظت بھی کرتا تھا۔ اس طرح اس نے بچوں کو پالا پوسا، وہ تو شکر ہے کہ چھت اپنی تھی ورنہ زندگی اور زیادہ مشکل ہو جاتی۔

زارا ایم ایس سی کر گئی، بنو ایف ایس سی اور ٹیپو میٹرک میں تھا۔ اپنے بچوں کی صورت میں اسے موسم بدلنے کی نوید تو نظر آ رہی تھی مگر ابھی وہ

بچوں کو ان کی ضد کے باوجود پڑھائی پر توجہ مرکوز رکھنے کا کہتی تھی۔ زارا نے باپ کی شفقت کے رنگ دیکھے تھے، اس وجہ سے اس کے اندر تلخی زیادہ تھی، بنٹو اور ٹیپو بہن کی نسبت کم حساس تھے، ویسے بھی لڑکے ہونے کی وجہ سے ان کا ماحول بدلتا رہتا تھا اور کتھارسس ہوتا رہتا تھا، زارا کی نظر ماں کے چہرے کی ہر ہر شکن اور تھکن پر رہتی تھی، سلائی مشین کی آواز اس کے کانوں پر ہتھوڑے کی طرح ٹکراتی رہتی تھی، وہ ماں کے روکنے کے باوجود غیر محسوس طریقے سے ماں کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھی، میٹرک کرنے کے بعد تو اس نے اپنے گھر پر ہی بچوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی، اس طرح گھر کے اخراجات میں آسرا لگنا شروع ہو گیا، اسی طرح زندگی ایک ہی رنگ اور ایک سے ڈھنگ سے بہتی جا رہی تھی، اس میں ایک ہی موسم آکر ٹھہر گیا تھا، نہ رُت بدلتی تھی اور نہ ہی شجرِ حیات پر نیا بُور اور نئے پھل پات آ رہے تھے مگر سلمٰی خاتون کو امید تھی کہ موسم ضرور بدلے گا۔

ماہِ رواں بنٹو اور ٹیپو کی فیس ادا کرنے کی وجہ سے گھر کا بجٹ قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ اوپر سے کئی گھروں کی طرف ادائیگی رکی ہوئی تھی، آج زارا کے جانے کے بعد ٹیپو راشن لینے گیا تو سٹور والے نے ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا، اسی وجہ سے سلمٰی خاتون کچن کی تلاشی لے رہی تھی اور آنسو بہائے جا رہی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ تھکی ٹوٹی زارا جب آئے تو گھر میں کھانے کو کچھ تو ہو، اسے پتہ تھا کہ اس کی خوددار بیٹی باہر سے بھوکی ہی آئے گی۔ بیرونی دروازہ کھلنے کی آہٹ سنائی دی تو اس نے جلدی سے آنسو پونچھے اور صحن کی طرف لپکی، یقیناً یہ زارا ہی ہو گی، ابھی وہ کچن کے دروازے میں ہی تھی کہ زارا آکر اس سے لپٹ گئی۔

''امّی، امّی، میری پیاری امی، میری راج دُلاری امی۔

''تو ہی میرا پیار ماہیا۔
یو شائن جسٹ لائک اے سٹار ماہیا۔
کازیو آر مائی اونلی پیار ماہیا۔''

زارا لہک لہک کر گا رہی تھی، آج وہ اتنی خوش دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی نے اس کے اندر نئی زندگی پھونک دی ہو۔

''ماروگی کیا، اتنی بڑی لم ڈھینگ ہو گئی ہو مگر رہی بچی کی بچی ہی۔ ہوا کیا ہے، کیا طوفان آگیا ہے۔''

سلمٰی خاتون بوکھلائی ہوئی زارا کی گرفت سے خود کو چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''مجھے نوکری مل گئی ہے امی آپ کی دعا سے، اب ہم پیٹ بھر کر روٹی کھائیں گے، اب آپ کو مشین کبھی نہیں چلانی پڑے گی، اب سٹور والا ہمیں دھتکارے گا بھی نہیں امی جی۔''

زارا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کرے، سلمٰی بھی خوشی کے مارے رونے لگ گئی تھی، وہ بے اختیار بیٹی کا ماتھا چومنے لگی۔

''آج برسوں بعد کوئی اچھی خبر سنی ہے میں نے، پیچھے ہٹ وضو کرنے دے مجھے، شکرانے کے نفل بول رکھے تھے میں نے، میرے مالک نے اپنا کرم کر دیا اس آنگن پر۔''

''امی یہ تو دیکھیں میں کیا لائی ہوں، ایڈوانس سیلری میں سے۔''

زارا نے ہاتھ میں پکڑے شاپرز کھولنے شروع کر دیے، گھر کا راشن، برگر، پیزا، سٹیم

روسٹ، کولڈ ڈرنکس، جوسز، ماں کے جوتے، بٹو کے جوگرز، بنٹو کا سائنٹفک کیلکولیٹر اور نہ جانے کیا کچھ سمیٹ لائی تھی وہ

''بیٹی کیا ضرورت تھی اتنے پیسے ایک ساتھ خرچ کرنے کی۔''

سلمیٰ خاتون نے محبت بھرے لہجے میں زارا کا ہاتھ تھاما۔

''امی آج مجھے نہ روکیں پلیز، آج ہمیں کھل کے جشن منا لینے دیں، بہت ترس ترس کے زندگی گزاری ہے ہم نے۔''

زارا نے آنسوؤں سے لبریز آواز میں کہا۔

''اور اپنے لیے کچھ نہیں لیا تم نے، دیکھو تمہارے کپڑے، تمہارے جوتے، چشمے کا فریم۔ سب کتنے خستہ ہو چلے ہیں۔''

اندر سے روایتی ماں نے انگڑائی لی۔

''امی، میری خواہشات، میری ضرورتیں، میرے خواب، سب کچھ، سارے کا سارا یہ گھر، اس کے باسی ہیں، میرے بھائی کچھ بن گئے تو میں سمجھوں گی کہ آج میرے مرحوم والد کے سب خواب پورے ہو گئے۔''

زارا رونے لگی۔

''نہ رو میری گڑیا، کیوں روتی ہو، تمہاری ماں زندہ ہے ابھی، تم کیوں اتنے روگ پال کر رکھتی ہو، چلو آنسو پونچھ لو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جاب کیا ملی ہے۔''

سلمیٰ خاتون نے بات کا رخ بدلا۔

''امی ایک چین اسکول ہے، اس میں ٹیچنگ کی جاب ہے۔ شاندار سیلری، گریجوایٹی، پرائیویڈنٹ فنڈ، فری میڈیکل، پک اینڈ ڈراپ، ہاؤس لون۔ سب کچھ ہے امی جی۔''

زارا جوش سے بتائے جا رہی تھی۔

''بیٹی، ذرا دھیان رکھنا، مردوں کے ساتھ نوکری کانٹوں پر چلنے کے جیسی ہے۔''

سلمیٰ خاتون کی آواز میں اندیشے چھلک رہے تھے۔

''امی، آپ کی بیٹی ہوں نا، تو تمام خوف دل سے نکال دیں۔''

زارا نے دُلار سے ماں کی گردن میں باہیں ڈال دی۔

''اچھا چل اب مجھے اپنے مالک کا شکر بھی ادا کر لینے دے، بہت دنیا داری کر لی، چلو تم بھی وضو کر لو۔''

سلمیٰ خاتون کا انگ انگ تشکر سے لبریز تھا۔

☆......☆......☆

برائٹ وے اسکول سسٹم کے اقبال کیمپس کی شاندار عمارت کے کانفرنس ہال میں نئے ٹیچرز کی بریفنگ جاری تھی۔ کرنل شیرازی اور سینئر ٹیچرز ہال میں موجود تھے۔ سامنے موجود ملٹی میڈیا پر اسکول سسٹم، برانچز، نصاب، ماضی کے نتائج، اصول وضوابط وغیرہ پر پریزنٹیشن دی جا چکی تھی، اب آخری خطاب اسکول کے ایم ڈی کرنل شیرازی کا تھا۔

''یاد رہے کہ برائٹ وے محض ایک اسکول نہیں بلکہ ایک تربیت گاہ ہے، ایک معیار ہے، ڈسپلن کا کوہ ہمالیہ ہے، شہر کی کریم یہاں کا رُخ کرتی ہے۔ یہ ادارہ میرا خواب ہے، آپ میرے خواب کی آبیاری کریں، برائٹ وے آپ کا خیال رکھے گا۔''

کرنل شیرازی کی گھمبیر آواز ہال میں گونج رہی تھی۔

''یہ بھی یاد رہے کہ یہاں کو ایجوکیشن نہیں ہے مگر اسٹاف میل فیمیل ہے، ہمارا بوائز کیمپس الگ

ہے۔آپ سب میچور ہیں، یونیورسٹی تک کی دنیا دیکھ چکے ہیں، امید ہے بچوں کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک دوسرے کی بھی۔''

کرنل شیرازی نے بات آگے بڑھائی، سینئر ٹیچرز سنجیدگی سے سر جھکائے بات سن رہے تھے اور تائید میں سر ہلا رہے تھے۔

''مجھے اپنی ٹیم پر اعتماد بھی ہے اور فخر بھی ہے، میری سلیکشن کبھی بھی غلط نہیں ہو سکتی، آپ سب میری فیملی ہو۔آپ کے لیے میرے دروازے دن رات کھلے ہیں، جب بھی کوئی مسئلہ ہو، میرا نمبر محفوظ کر لیں اور بلا جھجک رابطہ کریں، باقی معاملات متعلقہ کوآرڈی نیٹرز آپ کو سمجھا دیں گے۔''

کرنل شیرازی نے بات مکمل کی اور تالیوں کی گونج میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

''سر، برائٹ وے ہمارے لیے آج سے گھر کی طرح ہے، ہم اس کے نام کے لیے انتھک محنت کریں گے، ہم سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

زارا نے مستحکم لہجے میں کھڑے ہو کر تمام ٹیچرز کی نمائندگی کی، کرنل شیرازی کے چہرے پر مہربان مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مجھے معلوم ہے۔اینی کوئسچن۔''

کرنل شیرازی نے سب کو دیکھا۔

''سر، میں یہ پوچھنا چاہوں گی کہ آپ کے ادارہ نے ان بچوں کے لیے کیا کیا جو ذہین ہیں مگر برائٹ وے کے سامنے سے گزرنے کا خواب تک نہیں دیکھ سکتے۔''

زارا نے دوبارہ پھر کھڑے ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''ہم ہر سال میرٹ اور نیڈی سکالرشپ دیتے ہیں، جس کا اخبارات میں اشتہار دیا جاتا ہے، اور شاید یہی کام مری نجات کا ذریعہ بن جائے۔''

کرنل شیرازی کی آنکھیں ہلکی سی بھیگ گئیں۔

☆......☆......☆

زارا کلاس لینے کے بعد سٹاف روم میں پہنچی، اس کے اگلے دو لیکچرز آف تھے، سٹاف روم میں سارہ پہلے سے موجود تھی۔وہ حسب معمول جینز اور ڈھیلے ڈھالے کرتے میں ملبوس تھی۔

''آ گئی آئن سٹائن کی بدروح۔''

سارہ نے اپنے ٹیب پر انگلیاں گھماتے ہوئے نظر اٹھائے بغیر چٹکی لی۔اس نے یہ زارا کا نیا نام نکالا تھا ''آئن سٹائن کی بدروح۔'' جس سے زارا بہت چڑتی تھی۔

''اور تم کیا ہو، پروین شاکر کا ماڈرن ورژن یا پھر میر تقی میر کے مزار کی مجاور۔''

زارا نے چڑ کر کہا اور سارہ کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔

''اس کا مطلب ہے لگ گئی میری بات تمہیں، یہی تو میرا مقصدِ حیات ہے کہ تمہیں زندہ رکھوں۔''

سارہ نے اسے مزید تپایا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا، میں زندہ ہوں تبھی تو تمہاری بات تیر کی طرح لگی ہے مجھے محترمہ، کوئی ضرورت نہیں مجھے جیون دان کرنے کی۔''

زارا نے تنتناتے ہوئے کہا۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ کہ کیسا رہا کیریئر کا آغاز؟''

سارہ نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

''ٹھیک ہی ہے، فی الحال کوئی واضح رائے

نہیں دے سکتی۔"
زارا نے کندھے اچکائے۔
"ایف ایس سی سیکنڈ ائر میں کچھ لڑکیاں ایکسٹرا کلیور لگیں مجھے، خیر یہ تو ہوتا ہی ہے، ہر طرح کی ورائٹی موجود ہوتی ہے ہر ادارے میں۔"
سارہ نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔
"اس عمر کے بچوں کا ایکسٹرا کلیور ہونا تو قابلِ برداشت ہے مگر سازشی ہونا قبول نہیں مجھے اور اگر ایسا ہوا تو میں دیکھ لوں گی انہیں۔"
زارا کا پارہ دوبارہ پھر ہائی ہونے لگا، وہ ایسے ہی تھی، ذرا ذرا سی بات پر جذباتی ہو جانے والی، معمولی باتوں کو زندگی موت کا مسئلہ بنا لینے والی۔
"اچھا آنٹی کی طبیعت کیسی ہے اب۔"
زارا نے پارے کو ذرا نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔
"مام ٹھیک ہیں، ٹمپریچر تھا تھکاوٹ کی وجہ سے، آرام کیا ہے تو ٹھیک ہیں اب۔"
سارہ نے وضاحت کی۔
سارہ کے والد ضیاء الدین چوہدری آرمی سے ریٹائرڈ تھے، اس کی والدہ آرمی پبلک اسکول اینڈ کالج میں لیکچرار تھیں، سارہ سے چھوٹا حاشر تھا جو بی ایس کمپیوٹر سائنس کر رہا تھا، یہی مختصر سے فیملی تھی اس کی، جس کی جان اور مرکز سارہ تھی جس میں ان کے دل دھڑکتے تھے۔

☆......☆......☆

نیو فرسٹ ائر کا آج پہلا دن تھا، زارا کا لیکچر اینڈ ہوا تو وہ فائل اٹھا کر باہر نکلی۔ وہ لیکچرار گاؤن میں ملبوس تھی۔
"میم، ایکسکیوز می۔"
اس نے پیچھے سے آئی آواز پر مڑ کر دیکھا تو ایک سٹوڈنٹ کو پھولے سانسوں کے ساتھ اپنے پیچھے آتے دیکھ کر رک گئی۔
"جی بیٹا، وٹ کین آئی ڈو فار یو؟"
زارا نے شگفتہ لہجے میں کہا، لڑکی کے چہرے پر معصومیت اور بھولپن تھا، اس کا رنگ جیسے شہد اور دودھ کو ملا کے بنایا گیا تھا، کنچے جیسے نیلی آنکھوں میں زندگی ہلکورے لے رہی تھی، یہ وہ چہرہ تھا کہ جس کو دیکھ کر ماحول میں تازگی بکھرتی محسوس ہوتی ہے۔
"میم، میرا نام صبا ہے۔"
اس نے بے چینی سے ہاتھ ملے۔
"نائس نیم۔ کیا مسئلہ ہے صبا۔"
زارا نے ہلکی سے مسکان سے پوچھا۔
"میم وہ۔ دراصل۔"
صبا ہچکچائی۔
"میم۔ صبح بس پکڑنے کے لیے مجھے گھر سے بہت دور آنا پڑتا ہے، اسکول بس میرے روٹ سے نہیں گزرتی۔ اگر آپ کہہ دیں تو۔ مجھے ڈر لگتا ہے میم۔"
صبا نے سر جھکا کر ڈرتے ڈرتے بات مکمل کی۔ زارا کو بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ اچھا آؤ میرے ساتھ روم میں بیٹھتے ہیں۔ اپنے کیبن میں آ کر اس نے صبا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"ہاں تو صبا۔ ایسا کچھ تھا تو آپ ایڈمن سے بات کرتیں۔"
اس نے صبا سے استفسار کیا۔
"مجھے یہاں سب سے ڈر لگتا ہے، بس آپ۔ آپ سے نہیں لگا۔ جانے کیوں۔"
صبا اب بھی ذرا جھجک کر بات کر رہی تھی اور انگلیاں مروڑے جا رہی تھی، اس کا چہرہ سرخ ہوا ہوا تھا۔

''ارے۔ڈرتے نہیں ہیں، میرے بہادر بچے۔''

زارا نے صبا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور صبا سسک پڑی۔

''میم میرے ابو کا خواب ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں، بورڈ میں سیکنڈ پوزیشن ہے میری، چھوٹا بھائی بچپن میں ہی معذور ہو گیا تھا، ابو منڈی میں ہاکر ہیں، سکالر شپ مل گیا تو میں یہاں تک آگئی، ورنہ شاید گھر بیٹھنا پڑتا۔اب جانے کیا ہو گا۔''

صبا نے جیسے خود سے سرگوشی کی۔

''اوہ تم بورڈ پوزیشن ہولڈر ہو۔امیزنگ...... اچھا صبا دیکھو۔میری بات سنو، انسان کا کام محنت کرنا ہوتا ہے، اس محنت میں برکت اللہ تعالیٰ ڈالتا ہے، منزلیں ہمیں مل جاتی ہیں اگر پختہ عزم اور لگن کو سر پر سوار کر لیا جائے۔مرے بچے، کامیابی کے لیے اگر سو نمبر درکار ہوتے ہیں تو اس میں سے پچھتر نمبر پختہ عزم اور لگن کے ہوا کرتے ہیں جو اللہ ہمارا عزم چیک کر کے ہمیں دے دیتا ہے یا نہیں دیتا، اگر ہم اپنے مشن کے لیے سیریس ہوتے ہیں تو ہمارا رب بھی سیریس ہو جاتا ہے، پہلی شرط ہمارا سیریس ہونا ہے۔یاد رکھو جب ہم کسی کام کی ٹھان لیتے ہیں تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس کام میں ہمارے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اس لیے اپنے سر پر دھن سوار کر لو، منزل خود تمہیں مل جائے گی۔''

زارا نے تحمل اور رسان سے اپنی بات مکمل کی۔

''مگر میم۔بہت مشکل ہے۔مجھے ڈر لگتا ہے، میں کبھی اتنی دور پڑھنے نہیں آئی۔مجھے لوگوں سے۔بس ہے، آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔اگر میں ناکام ہو گئی تو۔جانے کیا ہو گا۔''

صبا بیٹھے ہوئے بھی پوری جان سے لرز رہی تھی۔اسے اپنی کیفیت بیان کرنی نہیں آ رہی تھی مگر زارا اس کے ان جانے خوف سمجھ رہی تھی، معصوم پرندہ پہلی بار اڑان بھرے تو یہی ہوتا ہے۔

''اچھا دیکھو۔میری بات سنو۔مجھ پہ اعتماد ہے نا۔''

زارا نے صبا کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''آپ پر ہی تو بھروسہ ہے۔جانے کیوں۔''

صبا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تو مجھ پر اعتماد کرو۔کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا، مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی ہمیشہ، روٹ بس کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، اور ہاں یہ لو میرا اسیل نمبر۔ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

زارا نے ایک کاغذ پر اپنا فون نمبر لکھ کر دیتے ہوئے کہا، اسکے اندر سے صبا کے لیے محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔اور پہلی بار اس نے صبا کے چہرے پر سکون اور آنکھوں میں تشکر دیکھا۔

☆......☆......☆

''یار تم نے فائزہ کو دیکھا ہے۔''

سارہ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اچانک زارا سے پوچھا، لنچ بریک میں وہ زارا کے کیبن میں آ جاتی تھی۔

''کون فائزہ۔ہماری ریسپشنسٹ۔اس کو دیکھنے کی کیا بات ہے، روز تو دیکھتی ہوں۔''

زارا نے سادگی سے اپنی ٹیبل سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا اندازہ ہے تمہارا اس کے بارے میں؟''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ، بات بتاؤ کیا ہے۔چڑ ہے مجھے تمہاری اس عادت سے۔''

زارا واقعی چڑ سی گئی۔

''غریب گھر کی ہے کچی آبادی کے دو کمروں کے مکان میں رہتی ہے، پے بیس ہزار ہے مگر سیل فون چالیس ہزار سے کم کا نہیں، خلعت فاخرہ دس ہزار کی زیبِ تن کر کے آتی ہے، نہ کوئی امیر منگیتر ہے اس کا۔''

''تم لباس کا لفظ استعمال کرلو تب بھی مجھے سمجھ آجائے گی تماری بات۔''

زارا نے سارہ کی بات کاٹی۔

''نہیں، یہاں خلعتِ فاخرہ سے ہی سہی عکاسی بنتی ہے۔''

سارہ اپنی بات پر مُصر تھی۔

''ہاں میں کہہ رہی تھی کہ خلعتِ فاخرہ دس ہزار سے کم کی نہیں ہوتی، شُوز برانڈڈ پہنتی ہے۔ کہاں سے آتا ہے یہ سب۔''

سارہ نے بھنویں اچکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''عورت ہونے کا ثبوت نہ دو سارہ۔ ہمیں کیا، جہاں سے بھی آتا ہو، جیسے بھی مینج کرتی ہو۔''

زارا کو وحشت ہوتی تھی سارہ کی ایسی باتوں سے۔

''اور تم نے نوٹ کیا کہ پرنسپل کے کمرے میں اس کی حاضری کتنی لمبی ہوتی ہے۔؟''

سارہ آج اپنی زنبیل سے تمام شعبدے نکالنے پر تلی ہوئی تھی۔

''یار بھاڑ میں جائے فائزہ اور پورا معاشرہ۔ ہم نے ٹھیکہ نہیں لیا ہوا کہ لٹھ اٹھا کر ہر کسی کے پیچھے دوڑتے پھریں، ہر کسی نے اپنا جواب خود دینا ہے، تم بھی اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ آئی سمجھ میں۔''

زارا کا سٹیمنا اتنا ہی تھا، لمبی بات اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔

''کیوں نہ غور کریں، ہم اس معاشرے کا حصہ ہیں، کیسے گونگے بہرے بن کر بیٹھ جائیں، کل کو کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو۔''

سارہ نے ہاتھ نچا کر لڑاکا عورتوں کی طرح بات کی، اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں، زارا سمجھ گئی کہ وہ اسے چھیڑ رہی ہے۔

''سر توڑ دوں گی تمہارا، میرا دماغ نہ کھایا کرو۔''

زارا نے سارہ کو گھورا۔

''بہرحال میں سیریس ہوں اب، کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے ضرور فائزہ اور پرنسپل کے درمیان۔''

سارہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی اور زارا کا دل کر رہا تھا کہ پیپر ویٹ اٹھا کر اس کے سر پر مارے۔

☆......☆......☆

آج سر شہریار کا پہلا لیکچر تھا، برائٹ وے میں ہر سبجیکٹ کے لیے دو ٹیچر رکھے جاتے تھے، اسے بھی اردو کے لیے رکھا گیا تھا۔

''اچھا یہ کون بتائے گا کہ مومن کا وہ کون سا شعر تھا جس کے بدلے غالب نے پورا دیوان دینے کو کہا تھا۔''

اردو کے نئے ٹیچر شہریار نے کلاس پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ایک سٹوڈنٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''سر، نہیں معلوم۔''

عیشا نے اپنی لمبی پلکیں جھپکتے ہوئے معصومیت سے جواب دیا۔

''ارے واہ۔ کمال ذہین لڑکی ہو، ویری

گڈ، چلو بیٹھ جاؤ۔''

شہریار نے مزاحیہ انداز میں کہا اور پوری کلاس میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

''اچھا کون بتائے گا۔؟؟''

کلاس میں خاموشی طاری تھی۔

''جناب آپ کا ڈریس بھی آپ کی طرح خوبصورت ہے مگر کام تو سوال کا جواب دینے سے ہی چلے گا۔''

شہریار نے نُمیرہ کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

اپنی تعریف سن کر نُمیرہ پھولے نہ سمائی اور اس نے نظر بھر کر سر شہریار کو دیکھا۔

شہریار نے باقی سٹوڈنٹس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''اینی ون ایلس۔کوئی اور۔؟''

کلاس میں صرف ایک ہی ہاتھ بلند ہوا، یہ صبا تھی۔

''تم مرے پاس ہوتے ہو گویا۔جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔''

صبا نے ڈرے ڈرے انداز میں جواب دیا، اس کی آنکھوں سے بے یقینی جھانک رہی تھی گویا جواب پر اسے خود بھی شک ہے۔

''ونڈرفل، زبردست، تالیاں ہو جائیں بھئی اس ذہین وفطین سٹوڈنٹ کے لیے۔''

پوری کلاس تالیوں کے شور سے گونج اٹھی، صبا کا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا، اسکی آنکھوں میں خوشی کی جھلملاہٹ تھی جو اس کے ہر مسامِ جان سے پھوٹ رہی تھی۔ایک دم سے اسے احساس ہوا کہ وہ بھی اہم ہے۔

''آپ کو کہاں سے پتہ چلی یہ بات صبا۔''

شہریار نے صبا سے تحسینی انداز میں پوچھا۔

''سر میں نے سنڈے میگزین میں پڑھا تھا۔''

صبا نے سادہ سے انداز میں کہا۔

''یعنی آپ اخبار بھی پڑھتی ہیں، ونڈرفل، امیزنگ' تشریف رکھیں۔''

شہریار نے مسرت اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں کہا۔

لیکچر جاری رہا، شہریار کا انداز کافی فرینک تھا، کسی سٹوڈنٹ پر جملہ کسا، کسی کو داد دی، درمیان میں کوئی قصہ کہانی سنا دی، باتوں باتوں میں کچھ اشعار بھی پڑھ ڈالے، پتہ ہی نہ چلا کہ کب پیریڈ اینڈ ہوا۔

''کسی بھی سٹوڈنٹ کو کچھ سمجھ نہ آئے تو بلا جھجک میرے کمرے میں آسکتا ہے۔''

شہریار نے کلاس کو پیشکش کی۔

کسی کو نہیں پتہ تھا کہ پورا لیکچر شہریار نمیرہ کو ہی تکتا رہا ہے، نمیرہ جب بھی نظریں اٹھاتی، سر شہریار اسے دیکھ رہے ہوتے تھے، آنکھوں کی یہ آنکھ مچولی نمیرہ کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کرتی رہی۔

شہریار ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک تھا، تازہ تازہ یونیورسٹی سے فارغ ہوا تھا، دیکھنے میں عمر سے کہیں کم دکھائی دیتا تھا، پرنسپل صاحب کی سفارش سے فوراً ہی برائٹ وے اسکول سسٹم میں اسے جاب مل گئی تھی۔اسکول میں بہت سی نظریں اس پر پڑنے کے بعد رستہ بدلنا بھول گئی تھیں۔

کلاس میں کچھ چہروں پر صبا کے لیے جلن اور

حسد کی پرچھائیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ایک ہی فلو میں دن رات ڈھل رہے تھے، جب اس دن ایسا کچھ ہوا جو زارا نے سوچا ہی نہ تھا۔

''مس زارا، آپ نے سیکنڈ ایئر کا لیکچر لیا۔؟''

ایک کرخت آواز کانوں میں پڑی تو زارا نے حیرت سے نظریں لیپ ٹاپ سے اٹھائیں۔ وہ ابھی ابھی سیکنڈ ائر کا لیکچر لے کر اپنے کیبن میں آئی تھی اور اگلے لیکچر کے پوائنٹس نوٹ کر رہی تھی۔ سامنے ماڈرن لباس میں ملبوس، ہاف سلیوو، دوپٹہ ندارد، شوخ میک اپ، پہلوؤں پر ہاتھ رکھے ایک لڑکی کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ زارا نے پہلی مرتبہ اسے اسکول میں دیکھا تھا۔

''جناب کی تعریف۔''

زارا نے غصے کا آتش فشاں قابو میں کرتے دھیمے انداز میں پوچھا۔

''میں زُنیرہ ہوں، نام نہیں سنا میرا۔''

لڑکی نے نخوت سے کہا

''مائنڈ یور لینگویج۔ تم زُنیرہ ہو یا غبارہ، مجھے اس سے کوئی کنسرن نہیں، میں نہیں جانتی تمہیں، بھاگو یہاں سے۔''

زارا پھٹ پڑی۔ اس لڑکی کا پر غرور انداز اسے تپا گیا۔

''شاید تم جانتی نہیں ہو کہ تم کس سے بات کر رہی ہو۔''

لڑکی نے نتھنے پھلائے۔

''ہاں نہیں جانتی، جاؤ ایف آئی آر کٹوا دو مجھ پر۔ صدرِ پاکستان ہو کیا تم۔''

زارا کی آواز بلند ہوتی گئی، اس موڈ میں وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

''میں دیکھ لوں گی تمہیں۔ سمجھتی کیا ہو تم، چھٹی نہ کروا دی تمہاری تو نام بدل دینا میرا۔''

لڑکی نے شاوٹ کیا۔

''نام بدل کر کیا رکھنا ہے یہ بھی بتا دو مجھے۔ اور سنو، ابھی دیکھ لو مجھے اچھی طرح، بعد میں کیا دیکھو گی۔ ابھی کیا چشمہ گھر بھول آئی ہو۔''

زارا نے اس کا تمسخر اڑایا۔

اتنے میں باہر سے ریسپشنسٹ دوڑتی ہوئی اندر آئی، اس کے ساتھ سارہ اور چند دوسری ٹیچرز بھی تھیں، وہ اس لڑکی کو کھینچ کھانچ کر ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئیں، وہ جاتے جاتے بھی اول فول بول رہی تھی۔

زارا اب پرسکون تھی، اس نے جو کہنا تھا، وہ دل کھول کر کہا تھا، اس کے اندر کوئی کسک نہیں تھی۔

''کیا ہوا زارا، کیوں منہ لگ رہی تھی اس فضول لڑکی کے تم۔''

سارہ نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''کون تھی یہ سارہ، پہلے مجھے یہ بتاؤ۔''

زارا نے اطمینان سے کرسی سنبھالی، وہ یوں پوز کر رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

''زُنیرہ نام ہے اس کا۔ بظاہر تو یہ کچھ بھی نہیں یہاں۔ مگر کہا جاتا ہے کہ یہاں اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔''

سارہ کی یہی عادت زارا کو بُری لگتی تھی کہ وہ کبھی ایک بات مکمل نہیں بتاتی تھی بلکہ بات کو قسطوں میں مکمل کرتی تھی۔

''آگے بکو۔''

زارا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کوآرڈی نیٹر کی منظورِ نظر ہے، آئی تو ٹیچر کے طور پر تھی، اب حکم چلاتی ہے سب پر، ہر روز صبح سویرے پہنچ جاتی ہے اسکول۔ سنا ہے کبھی کوآرڈی نیٹر اس کا دیوانہ تھا، اب صرف یہ کوآرڈی نیٹر کی دیوانی ہے اور اس سے شادی کی امیدوار ہے، وہ بھی دیتا ہے اس سے''

سارہ نے مفصل جواب دیا۔

''تو پرنسپل کچھ نہیں کہتا اسے، شیرازی صاحب بھی ہیں۔''

سارہ نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ پرنسپل اور کوآرڈی نیٹر ایک دوسرے کی کمزوریاں جانتے ہیں، اس وجہ سے ایک دوسرے کو تحفظ دیتے ہیں، اسی وجہ سے بات کرنل شیرازی تک نہیں جاتی۔ اور شاید تمہیں علم نہیں کہ پرنسپل، احمد ہمدانی کرنل شیرازی کا سالا ہے۔ ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف۔''

سارہ ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''خیر تم فکر نہ کرو، میرے ہوتے یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

سارہ نے جاتے جاتے اسے حوصلہ دیا۔

''آئی ڈیم کیئر۔ پروا نہیں مجھے ان کی۔ روزی رساں میرا رب ہے، بتا دینا ان کو۔ میں زارا سلیم ہوں، کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔''

زارا کا پارہ پھر ہائی ہو گیا۔

☆......☆......☆

برائٹ وے اسکول میں ایک شاندار کیفے ٹیریا بھی تھا، یہ اسکول شہر کی ایلیٹ کلاس کا نمائندہ اسکول تھا، اس وجہ سے یہاں سہولیات اور مشاغل بھی اسی لیول کے تھے۔ پہلے تین پریڈز کے بعد 11 بجے آدھ گھنٹے کی بریک ہوتی تو کیفے ٹیریا اور اس کے لان کے بینچ بھر جاتے، ہر طرف اسٹوڈنٹس کی چہکار گونجتی اور فضا زندگی سے معمور ہو جاتی۔ اس وقت ایک ٹیبل پر فرسٹ ائر کی عیشاء، نمیرہ اور سمیرہ سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ تینوں کا تعلق امیر کبیر گھرانوں سے تھا۔

''یار مجھے میم سارہ اور زارا بالکل بھی اچھی نہیں لگیں، ہر وقت یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ بس ٹوکتی ہی رہتی ہیں۔''

سمیرا نے کوک کا سپ لیا۔

''ایگزیکٹلی، میرے الفاظ چھین لیے تم نے۔''

نمیرہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اور ویسے بھی اب سر شہریار آ گئے ہیں اردو کے لیے تو میم سارہ کی کیا ضرورت ہے، میں ڈیڈی سے کمپلین کروں گی۔''

نمیرہ نے کہا۔

''اوہووو۔ تو یوں کہونا، اب ہم سمجھیں۔''

سمیرا اور عیشاء نے ہم آواز ہو کر نمیرہ کو گھیرا۔

''ارے ایسی کوئی بات نہیں۔ سر کی پرسنالٹی ہی ایسی ہے کہ ان کی طرف دل اٹریکٹ کرتا ہے۔ جسٹ کول۔''

You'rc my hcart, you'rc my soul

I'll kccp it shining cverywherc I go

You'rc my hcart, you'rc my soul

I will bc holding you forcvcr

Stay with you togcthcr

سمیرا اور عیشاء نے لہک لہک کر گانا شروع کر

دیا، سبھی لوگ ان کو دیکھنے لگے اور نمیرہ جھینپ سی گئی۔

"بس بھی کرو، کیوں تماشا بنواتی ہو۔"

نمیرہ نے ٹوکا۔

"ارے اب ڈرنا ورنا کیسا، اب تو نکال دو سارے خوف دل سے۔"

عیشاء نے نمیرہ کے گال پر چٹکی کاٹی۔

"معاملہ یکطرفہ ہے یا دوطرفہ ٹریفک ہے۔"

سمیرا نے شوخی سے نمیرہ کو دیکھا۔

"وہ تو ہر وقت مجھے ہی دیکھتے رہتے ہیں۔"

نمیرہ نے تفاخر بھرے انداز میں کہا اور سمیرا اور عیشاء نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

☆......☆......☆

آخر کار پرنسپل آفس سے اس کا بلاوا آ ہی گیا۔

"تشریف رکھیں مس زارا۔"

پرنسپل کی آواز میں تلخی چھلک رہی تھی۔

زارا خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ پہلے پرنسپل کو بولنے دیا جائے۔

"مس زارا، ہم نے آپ کو نوکری دی آپ کے اعتماد اور روشن کیریئر کی وجہ سے، مگر یہ معلوم نہ تھا کہ آپ اسکول ڈسپلن کی دھجیاں اڑا دیں گی۔"

پرنسپل نے آگے جھکتے ہوئے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

زارا نے سادگی سے سوال کیا۔

"آپ پوچھتی ہیں کہ کیا کیا ہے آپ نے، خود معلوم ہونا چاہیے آپ کو۔ آپ نے ہماری سینئر ٹیچر کی انسلٹ کی ہے۔"

پرنسپل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ زارا کو دھکے دے کر اسکول سے نکال دے۔

"کون ٹیچر۔ وہ مینڈک کی۔ جو برسات کے بغیر ہی ٹرا رہی تھی۔ کیا نام تھا اس کا۔ ہاں۔ غبارہ وغیرہ، ایسا ہی بھلا سا نام تھا اس کا۔ وہ ٹیچر تھی؟"

زارا نے مصنوعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"شٹ اپ۔ بہت ہو گیا مس زارا، یہ لاسٹ وارننگ ہے، اگر دوبارہ آپ نے زُنیرہ سے مس بی ہیو کیا تو وہ اسکول میں آپ کا آخری دن ہوگا۔"

پرنسپل پھٹ ہی پڑا۔

"ہمدانی صاحب۔ مجھے کرنل شیرازی نے منتخب کیا ہے، آپ مجھے ان سے کہلوا دیں، میں چھوڑ دوں گی اس ادارے کو، اور رہی بات زُنیرہ ٹائپ کے کریکٹر کی تو مجھے اسکول منیجمنٹ میں اس کی حیثیت واضح کر دیں پھر میں سوچوں گی کہ اس سے کیسے بات کی جائے مگر اس سے پہلے نہیں۔ انڈر سٹینڈ۔"

زارا دندناتی ہوئی پرنسپل آفس سے باہر نکل گئی۔ پرنسپل سوائے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے کے کچھ نہ کر سکا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام، قہر اور ایک غیض و غضب کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

زارا اپنے کیبن پہنچی تو سارہ پہلے سے ہی وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔

"سناؤ کیا رہا؟"

سارہ نے اتنے اطمینان سے پوچھا جیسے زارا شاپنگ کرنے گئی ہوئی ہو۔

"ہونا کیا تھا، سنا آئی کھری کھری اس مریل چوہے کو۔"

زارا نے کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔

"گڈ۔ کچھ نہیں ہوگا، دیکھ لینا۔ پرنسپل خود

غلطی ہے بہت سے معاملات میں، اسے تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔‘‘

سارہ کا اطمینان برقرار تھا۔

’’سارہ، تمہیں بہت کچھ معلوم ہے، مجھے کیوں نہیں بتارہی ہو تم پوری بات، کیوں چھپا رہی ہو۔‘‘

’’ابھی مجھے خود سچ کی تلاش ہے، سامنے آجائے گا جو بھی معاملہ ہوا۔‘‘

سارہ نے مبہم لہجے میں کہا اور باہر چلی گئی۔

اور پھر اگلے کئی دن سکون سے گزرے، یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا، نہ زُنیرہ دوبارہ نظر آئی اور نہ زارا کو کسی نے کچھ کہا، مگر زارا جانتی تھی کہ کوئی نہ کوئی کھچڑی ضرور پک رہی ہے۔

☆......☆......☆

’’امّی، دنیا سچ پر چلنے والوں کے لیے اتنی کٹھن کیوں ہے، کیوں جینا اجیرن کردیتی ہے ان کا۔‘‘

زارا کا دل اس دن خود بخود بھر آرہا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھی تھی اور سلمٰی خاتون چارپائی پر بیٹھ کر اس کے سر میں تیل ڈال کر مالش کررہی تھی۔ ماں کے قدموں میں بیٹھ کر وہ ہر ٹینشن بھول جاتی تھی۔ ایسے میں ماں بیٹی دنیا جہان کی باتیں شیئر کرتیں، زارا کو لگتا کہ وہ ٹھنڈی چھاؤں میں آگئی ہے۔

’’زارا، میری جان، کوئی دکھ ملے تو صبر کرنا چاہیے۔‘‘ ’’بیٹی، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، یہ میں نہیں کہہ رہی بلکہ یہ تو روشن کتاب کا کہنا ہے، تکلیف پر صبر کرنا پیغمبروں کا شیوہ رہا ہے زارا۔‘‘

سلمٰی خاتون نے بیٹی کی الجھن پڑھتے ہوئے کہا۔

’’امی اس کا تو مطلب ہے کہ سچ کو سچ نہ کہا جائے، حق بات نہ کی جائے، زیادتی پر آنکھیں بند کرلی جائیں۔‘‘

زارا کچھ اور الجھ چکی تھی

’’میں نے یہ تو نہیں کہا زارا۔ اللہ نے تو قرآن مجید میں واضح فرما دیا ہے کہ بے شک انسان نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، نیک عمل کرتے رہے، حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔ اس میں حق کے راستے، سچائی کی پگڈنڈی کو نہ چھوڑنے کا حکم ہے اور اگر اس راستے میں مشکلات آئیں تو پھر ان پر صبر کرنے کا حکم بھی ہے، نا صرف خود حق پر چلو بلکہ دوسروں کو بھی اس راستے پر چلنے کی ترغیب دو، اور صبر کرنے والے تو خود اپنے محسن ہوتے ہیں بیٹی۔ حق کے راستے میں تکالیف تو ضرور آتی ہیں مگر سچ اور حق کا راستہ ترک نہیں کرنا ہوتا میری گڑیا۔‘‘

سلمٰی خاتون کے لہجے میں قرآن کی معلمہ بول رہی تھی۔ ان کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

زارا کو یوں لگا جیسے ایک الجھن سلجھ گئی ہے، ایک بوجھ دماغ سے ہٹ گیا ہے، ایک سکون اس کے اندر سرایت کرگیا۔!!

اس نے ڈٹ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ’’دیکھا جائے گا۔‘‘

ہلکا ہوکر اس نے سکون سے اپنا سر ماں کے گھٹنوں پر ٹکا دیا۔

☆......☆......☆

زُنیرہ نے چاروں طرف دیکھا اور کوریڈور خالی دیکھ کر جلدی سے ٹیچرز ہال میں داخل ہوگئی، اس وقت صرف سر شہریار کا کیبن کھلا تھا۔

’’مے آئی کم ان سر۔‘‘

نمیرہ نے دھیرے سے کہا۔

شہریار چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔

''آؤ آؤ نمیرہ، بیٹھو۔''

اس نے نمیرہ کو اشارہ کیا۔

نمیرہ کرسی کے کنارے پر ٹک سی گئی۔

''اینی پرابلم نمیرہ۔''

شہریار نے نمیرہ سے پوچھا۔

''نو سر۔ وہ ایکچوئلی، ایک پرابلم تھی، میرا ایک لیسن مسنگ تھا۔''

نمیرہ نے گردن جھکائے ہوئے کہا۔

''دکھاؤ ذرا، کونسا لیسن ہے۔ بک دو مجھے۔''

شہریار اپنی کرسی سے اٹھ کر گھوم کر نمیرہ کی کرسی کے پیچھے آن کھڑا ہوا، اس کے دونوں ہاتھ نمیرہ کے کندھوں پر تھے۔ نمیرہ لرز اٹھی، اس کا جسم کانپ رہا تھا مگر وہ سر شہریار کو روک نہیں پا رہی تھی، اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ شہریار کے ہاتھ آہستہ آہستہ آگے سرک رہے تھے۔ اچانک باہر آہٹ ہوئی اور شہریار جلدی سے اپنی کرسی پر آگیا۔

☆......☆......☆

''آوٹ، آوٹ، یہ آوٹ ہے، میری باری ہے اب۔''

ٹیپو چیخا۔

''کیسے آوٹ ہے، گھر کے قانون ہیں کیا؟''

زارا نے تپ کر بلا لہرایا۔

''آپی، آپ کی شاٹ باہر گلی میں گئی ہے، یہ آوٹ ہوتا ہے۔''

ٹیپو نے پاؤں پٹخا۔

''آپی ٹیپو ٹھیک کہہ رہا ہے، آپ سیدھی طرح اسے باری دے دو ورنہ پچھلی بار کی طرح یہ سیدھی

آپ کے گلاسز پر بال مار دے گا اور بلاوجہ کا خرچہ ہو جائے گا آپ کا۔''

بنو نے لقمہ دیا، اسے معلوم تھا کہ اپنی ذات پر خرچ کرنا آپی کی کمزوری ہے۔

''آپ کا تو خرچ ہوگا ہی، ہماری ان قدیم گلاسز سے جان چھوٹ جائے گی، لگتا ہے ویلڈ کروالیا ہے آپ نے آپی۔''

ٹیپو نے زارا کو چڑایا۔ زارا جو گلاسز توڑ دینے کی دھمکی کے باعث بیٹنگ چھوڑنے پر نیم رضامند ہو چکی تھی، اپنے گلاسز کے بارے میں مزید ہرزہ سرائی برداشت نہ کر سکی اور بیٹ تھام کر دوبارہ کریز پر جم گئی۔

''ارے کیا اودھم مچاتے ہو تم لوگ ہر اتوار کی اتوار، بس کرو اب، میں نے کپڑے تار پر ڈالنے ہیں، کب سے دھو کر ٹب میں ہی ڈال رکھے ہیں۔''

سلمیٰ خاتون نے مصنوعی جھڑکی دیتے ہوئے کہا، اندر سے اس کا دل اپنے بچوں کی محبت پر واری صدقے جا رہا تھا۔ ہر اتوار کو بھائی بہن کا مل کر کرکٹ کھیلنا بہت پرانا مشغلہ تھا جس کا اختتام اکثر جھگڑے پر ہوتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا، گیم درمیان میں ہی ختم ہوگئی، ٹیپو کا منہ پھولا ہوا تھا کیونکہ اگلی باری اس کی تھی۔

باہر سے ہارن کی آواز پر ٹیپو دوڑا دوڑا گیا۔

''آپی آپی، کوئی سارہ آپی آئی ہیں، اتنی بڑی گاڑی میں۔''

ٹیپو کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''ارے سارہ یہاں کیسے آج۔ اچانک، اندر تو لے آتے احمق۔''

زارا بوکھلا کر دروازے کی طرف دوڑی۔ سلور ہنڈا سٹی کی ڈرائیونگ سیٹ پر سارہ

خود موجود تھی۔

''سارہ۔اندر آؤ، باہر کیوں کھڑی ہو، اپنا گھر ہے تمہارا، پلیز۔''

زارا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔اور پھر سارہ کے نانا کرتے بھی وہ اسے کھینچ کر اندر لے آئی، ٹیپو اور بنٹو شرما کر کہیں چھپ گئے تھے۔سلمیٰ خاتون نے سارہ کو محبت سے پاس بٹھایا اور اسے پیار کیا۔

''آنٹی وہ دراصل تھوڑی دیر کے لیے اسکول جانا تھا، میں سلیبز ا اپنے روم میں بھول آئی تھی اور کل مجھے پیپر سیٹ کر کے لے جانا ہے، ویسے تو کیمپس بند ہوگا آج مگر چوکیدار ہوگا، مام نے اس شرط پر جانے کی اجازت دی ہے کہ زارا کو ساتھ لے جاؤں۔''

سارہ نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''کیوں نہیں بیٹی، ایک سے دو بھلے، چلو زارا چینج کرو اور بہن کے ساتھ جاؤ فوراً۔''

سلمیٰ خاتون نے زارا کو گھورا جو ذرا متذبذب دکھائی دے رہی تھی۔

''اچھا امی، ابھی آئی۔''

مجبوراً زارا کو ہامی بھرنا پڑی۔

''غارت کر دیا چھٹی کا دن تم نے، ابھی یاد آنا تھا پیپر بنانا تمہیں، زیادہ ایفی شینٹ بننے کی کوشش کرتی ہو تو زہر لگتی ہو مجھے۔''

زارا نے ڈرائیونگ کرتی سارہ کو لتاڑا۔اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

جانِ بہاراں، رشکِ چمن

اے جانِ من۔!!

کار کی بند فضا میں سلیم رضا کی مدھر آواز گونج رہی تھی۔سارہ نے زارا کی بات سنی ان سنی کر دی۔اسے پتہ تھا کہ زارا بھی اسے اکیلا نہ جانے دے گی۔

''بند کرو اس تان سین کو اور میری بات کا جواب دو۔''

زارا نے جھلا کر آڈیو پلیئر بند کر دیا۔

''یار مجھے کام مکمل کر کے دینا ہے، سر انصر کا آرڈر ہے یہ، اچانک فون آگیا ان کا، تو کیا کرتی میں۔''

''تم زیادہ ہی آج کل اس انصر کی چمچی نہیں بن رہی ہو؟۔''

زارا نے ٹٹولنے والے انداز میں سارہ کو دیکھا۔

''لیو واٹ یار۔وہ کوآرڈی نیٹر ہے تو بات تو ماننی پڑے گی اس کی۔''

سارہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔اس کے ماتھے پر تفکرات کی پرچھائیاں تھیں۔

''مجھے تو لگتا ہے تم کوئی ٹوہ لینے آئی ہو یہاں۔''

زارا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔سارہ خاموش رہی۔وہ اقبال کیمپس پہنچ چکے تھے۔

☆......☆......☆

گیٹ پر پہنچ کر سارہ نے ہارن دیا تو چوکیدار نے اندر سے گیٹ کھولنے کی بجائے اپنے کمرے کی چھوٹی کھڑکی سے جھانکا جس پر گرل لگی تھیں۔پوری عمارت پر ہُو کا عالم طاری تھا۔

''میڈم صیب، خیریت تو ہے نا، آج تو چھٹی وٹی ہے نا، آپ کدھر گھومتا ہے۔''

''گل خان، ہم ضروری کاغذات لینے آئے ہیں، گیٹ کھولو ذرا۔''

سارہ نے سنجیدگی سے شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا جبکہ زارا لاپروائی سے ونڈ سکرین کو گھور

رہی تھی۔

''میڈم صیب، ام کو چھٹی والے دن آڈر ہے بڑے صیب کا کہ کوئی اندر نہ جائے۔''

گل خان نے پنڈولم کی طرح گردن ہلائی۔

''گل خان بحث مت کرو، ہمیں بس پانچ منٹ کا کام ہے، کھولو ورنہ میں شیرازی صاحب کو فون ملاتی ہوں۔''

زارا نے تپ کر کہا، اس نے سیل فون ہاتھ میں لیتے ہوئے گل خان کو ڈانٹا۔

''اچھا میڈم صیب، آپ کے لیے کھول دیتا ہوں میں گیٹ میٹ، مگر ہماری نوکری کو خطرہ ہوا تو آپ کا نام لے دینا ہے گل خان نے۔''

چوکیدار نے ہچکچاتے ہوئے داخلی دروازہ کھولا۔

''فکر مت کرو، ہم کوئی بم رکھنے نہیں آئے ہیں اسکول میں، اسکول کا ہی کام ہے جو ہمیں آنا پڑا اپنی چھٹی غارت کر کے، چل یار جلدی کر۔''

زارا نے کوفت بھرے لہجے میں کہا تو زارا نے گاڑی آہستہ سے آگے بڑھائی۔

''بی بی صیب، آپ بس اپنے کمرے وِمرے تک ہی جانا اور کام کر کے فوراً واپس آجانا، گل خان کی چھوٹی چھوٹی بیوی بچے ہیں۔''

گل خان نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔

''فکر نہ کرو گل خان، ہم یوں گئے اور یوں آئے۔''

سارہ نے چٹکی بجاتے ہوئے اشارہ کیا۔

''اور سنو۔ دماغ کو حاضر رکھا کرو، بیوی چھوٹی چھوٹی نہیں ہوتی بلکہ بچے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔''

گاڑی اندر لے جاتے جاتے سارہ نے بریک لگاتے ہوئے گل خان کو کہا اور گاڑی اندر داخل کر دی، گل خان کے چہرے پر بوکھلاہٹ اور زارا کے ہونٹوں پر بے اختیار قہقہہ تھا۔

''گل خان اب سوچتا رہے گا کہ اس سے غلطی کیا ہوئی ہے۔''

زارا نے ہنستے ہوئے کہا۔

فیمیل سٹاف کے لیے فرسٹ فلور پر الگ ہال میں کیبن سیٹ کیے گئے تھے جہاں ان کو لیپ ٹاپ، پرنٹر، انٹرنیٹ، واٹر ڈسپنسر اور آہنی الماری دی گئی تھی۔ سارہ نے جلدی جلدی اپنی الماری کھولی، سامنے ہی سلیبس والی فائل پڑی ہوئی تھی، سارہ نے سکون بھرا سانس لیا۔

''شکر ہے، آسانی سے مل گئی، مجھے تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا کہ میں نے رکھی کہاں تھی۔''

وہ بڑبڑائی۔

''دماغ کو حاضر رکھا کرو، کسی دن بڑا اپھڈا ہو جانا ہے تمہاری اس غائب دماغی کی وجہ سے۔''

زارا نے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

''فائل کے لیے آیا کون تھا۔ سنو۔ میرے ساتھ آؤ۔''

سارہ نے اسے دھکیلا۔

''کیا مطلب......''

زارا بوکھلا گئی۔

''خاموشی سے میرے ساتھ آؤ بس۔''

سارہ باری باری تمام کمروں کے دروازے چیک کر رہی تھی، سبھی کمرے لاک تھے، عمارت میں سناٹا طاری تھا۔ سارہ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔

''تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟''

زارا نے اسے جھنجھوڑا۔

''مجھے نہیں معلوم مگر شاید کچھ مل جائے۔''

سارہ نے سرگوشی کی۔

''مگر جلدی کرو، گل خان اوپر نہ آجائے۔''

زارا نے پریشانی سے کہا۔

کوریڈور میں آتے ہی وہ نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھے کہ اچانک زارا رُک گئی۔

''یار یہ آواز سنی تم نے۔''

ہر طرف گہری خاموشی کا راج تھا۔ سارہ نے ہر طرف کان لگائے مگر اسے کچھ نہیں سنائی دیا۔

''مجھے تو کچھ نہیں سنائی دیا۔''

سارہ نے الجھے انداز میں اسے گھورا۔

''نہیں یار مجھے ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی، کیا پتہ کس طرف سے آئی تھی مگر مجھے دھوکہ نہیں ہوا۔''

زارا ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھی، اس نے کافی دیر انتظار کیا کہ وہ آواز دوبارہ سنائی دے مگر صرف گہرا سناٹا ہانپ رہا تھا۔ وہ اوپر چھت کی طرف بھی گئے مگر سیڑھیوں کا دروازہ بند تھا۔

''زارا تمہیں پرفیوم کی مہک محسوس ہو رہی ہے؟ کوئی آیا ضرور ہے یہاں جن میں سے کم سے کم ایک فیمیل ہے۔''

سارہ نے فضا میں محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''مگر ہے کہاں، سارے کمرے تو لاک ہیں۔ جو بھی ہے، یہ گل خاں کے علم میں آئے بغیر تو ممکن نہیں۔''

زارا بدستور الجھی ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے یہاں کوئی خفیہ کمرہ بھی ہے۔ چلو فی الحال تو ہم نکلتے ہیں یہاں سے۔''

سارہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سارہ نے دوبارہ زارا کا ہاتھ تھاما جس کے چہرے پر ہلکا سا خوف کا تاثر بھی تھا۔ زارا سر جھٹکتے ہوئے اس کے ساتھ چل دی مگر وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ نیچے سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئے تھے، گل خان نے ان کے لیے گیٹ کھولا اور وہ سوچوں میں گم باہر نکل آئے۔

''کیا واقعی کوئی تھا؟؟؟ یا یہ اس کا واہمہ تھا۔''

زارا سوچوں کے سمندر میں غلطاں تھی۔

☆......☆......☆

پھر اچانک فائزہ کے انداز بدلے بدلے نظر آنے لگے، وہ خزاں کی رُت دکھائی دینے لگی، ملگجا، شکن آلود لباس، چہرے پر تھکن اور سوچوں کا جال۔ وہ اکھڑی اکھڑی اپنے ڈیسک پر بیٹھی رہتی، پرنسل آفس میں جانا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔ زارا سے رہا نہ گیا تو اس نے فائزہ کا حال احوال دریافت کیا مگر فائزہ نے اسے ٹال دیا، صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہی ہے، چٹان کے اندر تبدیلی آئے تو وہ بھی اسے چھپا نہیں پاتی اور دراڑیں پڑ جاتی ہیں، وہ تو جیتا جاگتا انسان تھی۔ پھر اچانک معلوم ہوا کہ فائزہ نے جاب چھوڑ دی ہے، اگلے دن اسی کاونٹر پر ایک نئی لڑکی موجود تھی، تازہ گلاب جیسی، کھلی کھلی، چہکتی، مہکتی، لچکتی، مچلتی ہوئی۔ جس کا لباس، آنکھیں، جسم، انداز سب بولتے تھے۔ سارہ اور زارا اسی پہیلی کو بوجھنے میں لگی تھیں کہ فائزہ کہاں گئی۔

''کل اسکول ٹائم کے بعد ہم نے کہیں جانا ہے، آنٹی کو بتا کر آنا۔''

سارہ نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سرگوشی کی۔

''زیادہ شرلاک ہومز نہ بنو، یہ بات تم آرام

سے بھی کہہ سکتی تھیں، یہ جاسوسانہ انداز اپنا کر تم کوئی بڑی شے نہیں بن جاؤ گی۔''

زارا حسبِ معمول تپ گئی، اسے یہ سب کام بونگیاں لگتے تھے۔ سارہ بس مسکراتی رہی۔

اگلے دن وہ سارہ کی گاڑی میں ایک کچی آبادی کے خستہ حال مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ فائزہ کا پتہ سارہ نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ گلی میں ٹخنے ٹخنے پانی تھا، یہ علاقہ اپنے مکینوں کی زندگی کا تعارف تھا۔ یہاں زندگی سسکتی، ہانپتی اور کانپتی ہر دیوار سے جھانک رہی تھی۔ دستک کے جواب میں جس لڑکی نے دروازے سے جھانکا، وہ پہچان ہی نہ سکے کہ وہ فائزہ ہے، زندگی سے بھرپور فائزہ اس وقت خستہ دیوار کی مانند نظر آرہی تھی جو سہارا دینے سے بھی گر جاتی ہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ جیسے ششدر رہ گئی، اگلے ہی لمحے اس نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر سارہ نے دروازہ تھام لیا۔

''پلیز فائزہ، پلیز۔ ہم ہمدرد ہیں تمہارے، اعتماد کرو ہم پر۔''

سارہ کو معلوم تھا کہ اس وقت فائزہ یقینی اور بے یقینی کے واہمے بیچ جھول رہی ہے۔ سارہ نے تھکے ہارے انداز میں انہیں رستہ دے دیا، گھر میں صرف اس کی بوڑھی بیمار ماں تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے، صرف خاموشی بول رہی تھی، فائزہ کا جسم لرز رہا تھا، آنسو اس کے چہرے سے پھسل رہے تھے، بغیر کسی میک اپ کے اس وقت وہ ایک چھوٹی سہمی چڑیا دکھائی دے رہی تھی۔ اسے بنا سنے بھی معلوم تھا کہ سارہ اور زارا کی آنکھیں کیا پوچھ رہی ہیں۔

''غریب اور یتیم پیدا ہونا اس معاشرے کا سب سے بڑا جرم ہے، میں بھی زندگی کا نیا منظر نامہ تراشنے نکلی تھی، بی اے کرنے کے بعد مجھے ایسا لگتا تھا کہ محنت کی بدولت میں سب کچھ بدل دوں گی، اپنی ایک دوست کے ریفرنس سے میں برائٹ وے اسکول پہنچی، وہاں پر استقبالیہ کاؤنٹر پر مجھے جاب مل گئی، مجھے یوں لگا کہ زندگی کے بوسیدہ پنے پلٹ رہے ہیں، اب اچھے دن آنے والے ہیں، در و دیوار سے لگی دیمک اب جھڑنے والی ہے۔''

فائزہ ہانپنے لگی، کمرے میں صرف اس کی آواز گونج رہی تھی یا ساتھ والے کمرے سے اس کی ضعیف ماں کے کھانسنے کی آواز۔ سارہ زارا گردن جھکائے چپ بیٹھی تھیں۔

''مجھے آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ پرنسپل مجھے الگ سی نظروں سے دیکھتے ہیں، مجھے عجیب تو لگا مگر اچھا بھی لگا، کچی مٹی پر بارش برسے تو وہ مہکے نا تو اور کیا کرے۔؟؟؟۔ یہی میرے ساتھ ہو رہا تھا، میں اس دن بھی مزاحمت نہ کر سکی جب احمد ہمدانی نے پہلی بار فائل دیتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا، میں اس دن بھی بہتی چلی گئی جب اس نے مجھے کام کے بہانے اسکول ٹائم کے بعد روکا۔ پرنسپل مجھے جس رستے پر لے جانا چاہ رہے تھے میں اس پر دوڑ رہی تھی، جن کے آنگن میں کبھی جگنو بھی نہ اترے ہوں وہ بھلا سورج سے نظریں کیسے ملا سکتے ہیں زارا۔ میں رکنا چاہتی تھی مگر جتنا پیچھے ہٹتی، دیوار سے ٹکراتی ربر کی گیند کی طرح اتنا ہی زور سے آگے کی طرف جاتی۔ میرے لاشعور میں اپنا کچا مکان، بیمار ماں بھی تھی، نوکری چھوٹ جانے کا خوف بھی تھا اور کسی بھنور کی طرح اپنی جانب کھینچتا شادی کا وعدہ بھی تھا۔ میں اس وعدے کے آسرے پر اپنا سب کچھ احمد ہمدانی کے حوالے کرتی چلی گئی، یہ بھول گئی کہ تجوری خالی ہو جائے تو پھر چور بھی اس کا رخ کرنا چھوڑ دیتے

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ہیں، میں نے پوری تجوری اس کے حوالے کر دی۔ اور آج خالی گھر کی طرح ہوں جو دستک کو بھی ترس جاتا ہے۔''

کمرے میں صرف سسکیاں گونج رہی تھیں۔!!

☆......☆......☆

گھر واپس آکر زارا سستی سے کمرے میں لیٹ گئی، بنو اور ٹیپو نے اودھم مچایا ہوا تھا، کمرے میں گہرا اندھیرا تھا، زارا کا دل لائٹ آف کر کے لیٹنے کو کر رہا تھا، باہر شام کے سائے لمبے ہو کر رات اتر آئی تھی، اس کے دل و دماغ میں فائزہ کے جملے کسی ویران کھنڈر میں چیختی چمگادڑوں کی طرح ٹکرا رہے تھے۔کیسی ہے یہ بے بسی، انسان انسان کا شکاری ہے، عورت محض جنس کی طرح تلتی اور بکتی رہی ہے، آج بھی وہ ضرورت کی منڈی میں کبھی دانستہ کبھی نا دانستہ اپنے دام لگواتی ہے۔ فائزہ مکمل بے قصور تو نہیں تھی مگر بچپن کی محرومیاں اور مستقبل سے بے یقینی اسے ڈگمگا گئی، اس نے آسمان سے گرتے تارے کو سورج سمجھ کر جھولی میں اتارنا چاہا اور بصیرت، بصارت دونوں ہی گنوا بیٹھی، جانے برائٹ وے میں کیا ہو رہا تھا، ایک طرف کرنل شیرازی کی بظاہر شفاف ذات تھی تو دوسری طرف مشکوک فضا تھی، در پردہ بہت کچھ تھا جو فی الحال نظروں سے اوجھل تھا، ایک بات تو طے تھی کہ وہ میدان چھوڑ نہیں سکتی تھی، یہ اس کی سرشت میں ہی شامل نہیں تھا، اسے بہت سی زندگیاں بچانی تھیں۔ وہ جب بھی برائٹ وے چھوڑنے کا ارادہ کرتی، ایک من موہنی بھولی سی صورت اس کی آنکھوں میں چھم سے اتر آتی۔

''میم۔ مجھے ڈر لگتا ہے، مجھے لوگوں کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔''

اور زارا کا اسکول چھوڑنے کا ارادہ بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتا۔

''میں لڑوں گی۔ آخر تک لڑوں گی۔'' زارا نے ایک نئے عزم سے خود کو سمیٹا۔

اس دن زارا کلاس روم میں تھی اور سارہ چھٹی پر تھی، اچانک استقبالیہ لاؤنج سے عجیب سا شور سنائی دیا، گل خان کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، زارا گھبرا کر باہر نکل تو لاؤنج میں میلہ لگا ہوا تھا، دوسری ٹیچرز بھی وہاں موجود تھیں۔ تین ادھیڑ عمر دیہاتی دکھائی دینے والے سادہ سے مرد اور دو دیہاتی خواتین گڑگڑا رہی تھیں، ایک بزرگ جس نے چشمہ لگایا ہوا تھا اور کچھ پڑھا لکھا نظر آتا تھا، وہ بات کر رہا تھا۔ گل خان انہیں وہاں سے کھینچ رہا تھا مگر وہ جمے کھڑے تھے، خواتین رو رہی تھیں۔ غربت ان کے انگ انگ سے جھانک رہی تھی، احمد ہمدانی اور انصر کے علاوہ کچھ اور ٹیچرز بھی وہیں موجود تھے۔

احمد ہمدانی ان کو وہاں سے جانے کا کہہ رہا تھا، ساتھ ساتھ وہ گل خان پر بھی برہم ہو رہا تھا کہ ان کو اندر کیوں آنے دیا ہے، اس کے جواب میں گل خان اپنی صفائی بھی پیش کر رہا تھا اور ان بے چاروں پر گرم بھی ہو رہا تھا۔ زارا کو معاملہ سمجھ نہ آیا تو ذرا اور قریب آگئی۔ احمد ہمدانی کی پوری کوشش تھی کہ جلدی سے ان کو چلتا کر دے۔

''بزرگو، ہم آپ کے ساتھ ہیں، ٹینشن کی کیا بات ہے، وہ ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔''

احمد ہمدانی مبہم سی بات کر کے انہیں ٹالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

''میری بیٹی ایک ہفتے سے گھر نہیں آئی ہے، نہ کوئی رابطہ ہے، تین دن کے لیے تقریری مقابلے پر گئی تھی۔''

پہلے ادھیڑ عمر دیہاتی نے بے چارگی سے کہا۔

''او انکل جی، میں نے عرض تو کی ہے کہ وہ مقابلہ جیت کر صوبائی لیول پر چلی گئی ہیں، آجائیں گی۔''

انصر نے مداخلت کی۔

''ان کو میرٹ وظیفہ دیا تھا کرنل صاب نے، ورنہ ہماری کیا اوقات تھی کہ اتنے وڈے اسکول میں آتے، کرنل صاب سے ملاقات کرادو ہماری۔''

دوسرے شخص نے درمیان میں بات اچکی۔

''کرنل صاحب کوئی فارغ نہیں بیٹھے، ان کا ایک پاؤں پاکستان اور ایک فارن ہوتا ہے، آپ ہم سے بات کریں۔''

اکاؤنٹس آفیسر نے ڈپٹ کر کہا۔

''پتر، میری بکڑی نے تو ساری حیاتی کبھی تقریر نہیں کی، مجھے تو اس مقابلے کی سمجھ نہی آندی۔ مت ہی وج گئی ہے میری تو۔ ہائے نی میری شازو۔''

دیہاتی خاتون نے روتے ہوئے بے چارگی سے کہا

''اماں جی، آپ کی بچی بھی خیریت سے ہے، آجائے گی جلدی۔''

احمد ہمدانی نے سمجھایا۔

''اماں جی، کس نے بتایا ہے آپ کو کہ وہ تقریر کرنے گئی ہیں۔''

زارا نے مداخلت کی۔

مس زارا، آپ پلیز اپنا کام کریں، مین برانچ نے سلیکشن کی تھی، انٹر برانچز مقابلہ تھا، سٹوڈنٹس کو سٹیج پر آنا بھی تو سکھانا ہے کہ نہیں۔''

احمد ہمدانی نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔ اس کی وضاحت پر وہاں موجود ٹیچرز یقین کرنے میں متذبذب نظر آ رہی تھیں۔ کیونکہ مقابلے شروع ہوتے تھے تو ہر ٹیچر کو اس کا پتہ ہوتا تھا، یہ کون سے مقابلے تھے جو بالا ہی بالا ہو رہے تھے۔

''بابا جی، ہم شام کو آپ لوگوں کے گھر آئیں گے، پلیز یہ سٹڈی ٹائم ہے، جائیں آپ لوگ، لے جاؤ گل خان انہیں۔''

احمد ہمدانی نے سخت لہجے میں کہا۔ چشمے والے ادھیڑ عمر مرد نے کچھ کہنا چاہا مگر گل خان نے اسے بازو پکڑ کر کھینچا اور وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

زارا سوچوں میں گم تھی!!

☆......☆......☆

''میم! سر نے تو یہ پرابلم کسی اور طریقے سے کرایا ہے۔''

عیشا نے آنکھیں ادا سے گھمائیں۔

''کس سر نے؟''

زارا وائٹ بورڈ پر پرابلم حل کرتے کرتے ایک دم سے مڑی۔ اتنے میں پاس بیٹھی نمیرہ نے عیشا کو زور سے کہنی ماری۔

''نہیں نہیں۔ کچھ نہیں میم۔ وہ دراصل۔''

عیشا گڑبڑا گئی، نمیرہ کے اچانک ٹوکنے پر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ بات کیسے سنبھالے۔

''نمیرہ کھڑی ہو جاؤ۔''

زارا نے ڈپٹ کر کہا۔

''جی۔ فرمایئے۔''

نمیرہ شانِ بے نیازی نے طنزیہ انداز میں کہا اور بے نیازی سے کھڑی ہو گئی جیسے اسے زارا کی ذرا بھی پروانہ ہو، زارا کے تن بدن میں اشتعال کی ایک لہر اٹھی۔

''کس سر کی بات کر رہی تھی عیشا، جسے تم نے کہنی مار کے روکا ہے۔''

زارا نے ضبط کی آخری حدوں کو چھوا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ طمانچہ مار کے منہ ہی توڑ دے اس بدتمیز لڑکی کا۔

''میں نے۔ کب؟۔ میں نے کب روکا عیشا کو۔''

نمیرہ ایسے بن گئی جیسے وہ ابھی کلاس روم میں آئی ہو۔

زارا اگر اس لمحے کلاس روم سے نہ چلی جاتی تو شاید اس کا ہاتھ اٹھ جاتا نمیرہ پر۔!!

''اتنی بدتمیز، اتنی مغرور، اتنی مکار۔''

زارا مٹھیاں بھینچے اپنے کیبن میں ٹہل رہی تھی۔

''میم۔''

زارا نے کیبن کے باہر صبا کو کھڑے دیکھا، اس کا غصہ ذرا دھیما پڑا۔

''آؤ آؤ صبا، خیریت تو ہے۔''

زارا نے ایک لمبا سانس لے کر اندر کی آگ کو ذرا ٹھنڈا کیا۔

''میم وہ بس میں یہی بتانے آئی تھی کہ سر شہریار شام

کو ایک اکیڈمی رن کرتے ہیں، میرے گھر سے قریب ہی ہے۔ فیضِ عام کے نام سے، سنا ہے عیشا اور نمیرہ وہاں بھی جاتی ہیں، سر کوئی ایکسٹرا چارج بھی نہیں کریں گے۔"

صبا نے جلدی جلدی بات مکمل کی۔

"میں چلتی ہوں، اُن کو پتہ چل گیا تو میرے ہی پیچھے نہ پڑ جائیں۔ پلیز میم آپ غصہ تھوک دیں، کوئی کہاں جاتا ہے، آپ کو کیا۔"

صبا نے ادھر ادھر دیکھا اور ہال سے باہر نکل گئی۔

زارا سوچوں کے بحر الکاہل میں غوطے لگا رہی تھی۔

☆......☆......☆

آدھی پنڈلیوں سے اوپر شروع ہوتا انتہائی چست پاجامہ، فٹنگ والی شرٹ، سیدھے بالوں کو برش کر کے کندھوں تک کھلا چھوڑے، دوپٹے کے بوجھ سے بے نیاز، خوشبوؤں میں بسیں دونوں لڑکیاں ہاتھوں میں کچھ گفٹ پیکس اور بڑا سا کیک اٹھائے ہال میں داخل ہوئیں اور کیٹ واک کرتی ہوئیں سامنے والے کمرے میں گھس گئیں، لڑکیوں کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال ہو گی، ایڈمن پر بیٹھے لڑکے نے ان دونوں کو سمائل دی اور گردن میں خم دیتے ہوئے اندر جانے کا اشارہ کیا، ان کے انداز میں انتہائی خود اعتمادی اور ارد گرد سے لاپروائی تھی، آفس میں پرنسپل سیٹ پر بیٹھے شہریار کی آنکھوں میں ان کو دیکھتے ہی چمک آ گئی۔ لڑکیوں نے سامان کے پیکس ٹیبل پر رکھے، ناگن کی طرح لمبی اور گھٹاؤں کی طرح گھنی زلفوں کو ایک ادا سے جھٹکا اور سامنے رکھی چیئرز سنبھال لیں۔

"ہیپی برتھ ڈے سر۔"

ذرا نکلتے قد والی لڑکی نے شہریار کو وش کیا۔

"واردا، تھینکس۔ مچ تھینکس۔ تم نے یاد رکھا۔"

شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"بھلا آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں سر۔"

لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر گفٹ میری مرضی کا نہیں، مجھے میٹھا سا گفٹ چاہیے، میری مرضی کا۔"

شہریار نے واردا کی آنکھوں میں جھانکا۔

"سر، آپ بھی نا۔"

واردا جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے بری طرح شرما گئی۔

"کوئی مشکل پیش تو نہیں آئی گھر سے نکلنے میں۔"

شہریار نے بات بدلی۔

"بس سامعہ کی برتھ ڈے کا بہانہ کیا، اس کے گھر سے نکلنا تو مشکل ہے ہی نہیں، سیدھے یہاں چلے آئے ایکسٹرا اسٹڈی کا بہانہ کر کے۔"

واردا نے مزے لے لے کر بات سنائی، اسے یہ سب کچھ ایک تھرل لگ رہا تھا۔

"ایکسٹرا اسٹڈی کی تو واقعی تمہیں ضرورت ہے۔"

شہریار نے ذو معنی انداز میں کہا اور کمرے میں ان کا مشترکہ قہقہہ گونجا۔

"سامعہ کی ایکسٹرا اسٹڈی کے لیے سر کاشان کو ٹائم دیا ہے میں نے۔"

شہریار نے ذو معنی انداز میں اپنے پارٹنر کا نام لیا اور سامعہ بری طرح شرما گئی۔

فیضِ عام اکیڈمی میں گہما گہمی کا سماں تھا۔ یہ اکیڈمی عصر سے عشاء تک کھلی رہتی تھی۔ میٹرک اور ایف ایس سی کے طلبا و طالبات کے لیے تمام مضامین کی کوچنگ کا انتظام تھا، اس کی انتظامیہ شہریار اور اس کے دو کلاس فیلوز پر مشتمل تھی، زیادہ تر ٹیچرز ایسے تھے جو خود بھی اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے اور اخراجات پورے کرنے کے لیے اکیڈمی کو ٹائم دیتے تھے۔ فیضِ عام اس وجہ سے بھی پاپولر تھی کہ یہاں سٹوڈنٹس پر روک ٹوک نہیں تھی، جو جس وقت آئے، لیکچر کے دوران اُٹھ کر چلا جائے، سیل فون استعمال کرے۔ غرضیکہ طلبا کو مکمل آزادی حاصل تھی۔ اسی وجہ سے دور دور سے طلباء اس اکیڈمی میں آتے تھے، سنجیدہ مزاج طلباء یہاں کم ہی ٹکتے تھے مگر ٹائم پاس کرنے والوں کے لیے یہ اکیڈمی بہترین ٹھکانہ تھی۔ طلباء اور اساتذہ کے درمیان عمر کے معمولی فرق کی وجہ سے طلبا ٹیچرز سے بے تکلف رہتے تھے اور شاید اکیڈمی کا ماٹو بھی یہی تھا، ہر روز پارٹیاں، آئے دن ٹریٹ، برتھ ڈے

سلیبریشن۔ ہر وقت میلہ لگا رہتا، یہ اکیڈمی ان سٹوڈنٹس کا مرکز تھی جن کے والدین صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے ان کا سر نہ کھائیں بلکہ اکیڈمی والوں کا سر کھائیں جس کے لیے وہ منہ مانگی فیس دینے کو تیار تھے۔ اکیڈمی آفس میں ہر وقت شہریار یا اس کے پارٹنر اور لڑکیوں کا گروپ جمع رہتا تھا۔ کہنے کو تو وہ آفس میں پڑھنے کو جمع ہوتیں تھی مگر اصل میں تو باہمی فاصلہ کم کرنے کے لیے منتخب لڑکیوں کو آفس بلایا جاتا تھا۔ نمیرہ صرف اور صرف شہریار کے اشارے پر اکیڈمی آنا شروع ہوئی تھی ورنہ اسے اکیڈمی کی خاص ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

''بیٹا، ایک بات کہنا تھی میں نے۔''

سفید براق جیسی چادر میں لپٹی، نورانی چہرے والی خاتون نے حلیمانہ انداز میں بیٹے سے کہا، ان کی انگلیاں مسلسل تسبیح پر گردش کر رہی تھیں۔ گرمیوں کی شام میں اس وقت لان میں بیٹھ کر چائے پی جا رہی تھی، سلیم الدین کی والدہ، حلیمہ بیگم عام طور پر اپنے کمرے سے کم ہی باہر آتی تھی، اس وقت ان کا آنا کسی خاص ذہنی پریشانی کی علامت تھا۔

''جی اماں جی، فرمائیے، اب کیا مسئلہ ہو گیا آپ کو۔''

اس سے پہلے کہ سلیم الدین کچھ کہتا، اس کی بیگم شاہانہ نے بے زاری سے کہا۔

''بہو۔ سامعہ کو کسی ایسی اکیڈمی داخل کیوں نہیں کرواتے جہاں خواتین اساتذہ ہی ہوں۔ یہ ممکن نہیں تو گھر پر سٹڈی کر لے، اکیڈمی ضروری تو نہیں۔''

حلیمہ بیگم نے دھیمے انداز میں اپنی پریشانی بیان کی۔

''اماں، کیا مطلب ہے آپ کا، کس دور میں جی رہی ہیں آپ، یہ اسی کی دہائی نہیں جب لڑکیوں کو سات پردوں میں گھر میں قید کر دیا جاتا تھا بلکہ دو ہزار سولہ ہے۔ ان پڑھ رکھ دیں میری بیٹی کو اگر آپ کو بس چلے تو۔''

شاہانہ تپ کر بولی۔ اسے اپنے دل کے سابقہ پھپھولے پھوڑنے کا موقع جو میسر آ گیا تھا۔

''بہو۔ بیٹی کی عزت اسی کی دہائی میں بھی قیمتی اور نازک تھی اور آج بھی وہ کانچ کا آبگینہ ہے۔ میرے پاس تم لوگوں جتنی سمجھ تو نہیں مگر بیٹی کی آنکھیں اور ہونٹ چپ رہتے ہوئے بھی بولتے ہیں اگر کوئی پڑھنے والی ماں ہو تو۔''

حلیمہ بیگم کے لہجے میں نمی در آئی تھی۔

سلیم الدین نے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی شاہانہ چیخ اٹھی

''کیا مجھے تربیت کرنا نہیں آتی، کیا میں بے عقل ہوں، کیا میں اپنی بیٹی کی دشمن ہوں۔ اماں آپ بس چپ ہی رہا کریں، خدا واسطے کا بیر ہے آپ کو مجھ سے، جانے بگاڑا کیا ہے میں نے اور میری بیٹی نے آپ کا۔''

شاہانہ رونے لگی

''اماں کچھ تو خیال کیا کریں آپ، بیٹی کو پڑھانا بھی تو ہے، ڈاکٹر کے علاوہ کوئی فیلڈ ہے نہیں کام کی۔ جس میں پیسہ بھی ہے، تعلقات بھی اور اچھا رشتہ بھی۔ اکیڈمی نہ بھیجیں تو اور کیا کریں۔''

بیوی کے رونے پر سلیم الدین کا دل پسیج گیا، پہلے ماں کی بات ٹھیک لگ رہی تھی، اب وہی ماں جاہل نظر آنے لگی۔ آنکھوں پر بیوی کی لگائی عینک لگی ہوئی تو موسم بھی ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا بیوی چاہتی ہو۔

''بیٹا، بہو نے ایک لمحے میں سامعہ کو اپنا بنا لیا اور مجھے بہت دور کھڑا کر دیا۔ وہ مجھے بھی جان سے زیادہ پیاری ہے، رہی بات اس کے مستقبل کی تو یہ ہمارے اپنے بنائے پیمانے ہیں بیٹا، جو بات اسلام نے منع کر دی اس سے رکنے میں فائدہ اور کرنے میں عظیم نقصان ہی ہے، بیٹا اندھیرے سے ڈرنا تو معاف کیا جا سکتا ہے مگر روشنی سے ڈرنا کسی طور قابلِ معافی نہیں ہوتا۔ تم روشنی سے ڈر رہے ہو بیٹا، اسلام روشنی ہی تو ہے۔''

حلیمہ بیگم نے بیٹے کو سمجھایا۔

''اماں۔ ہم کیا کریں، کہاں جائیں، ہر اکیڈمی، ہر کالج میں مرد ٹیچرز بیٹھے ہیں، شہر بھر کے ماہر ٹیچرز بھی مرد ہی ہیں جو ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کالج میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ کہاں سے لائیں فی

میل ٹیچرز۔"
سلیم الدین کے انداز میں بے بسی تھی۔
"بیٹا، چلو ایک بات یقینی بنا لو کسی طرح۔ مرد کے ساتھ تنہائی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، جب کوئی نہیں ہوتا تو مرد اور عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے، اجتماعی کلاس میں پڑھنا مجبوری ہے مگر وہ اتوار کو چل پڑتی ہے اکیڈمی، کبھی چیک کیا تم نے، کبھی ساتھ گئے تم، اس کا لباس کبھی غور سے دیکھا ہے، وہ تعلیم حاصل کرنے والا لباس ہے؟ بیٹا آج کل لونڈے لپاڑے ٹیچر بن گئے ہیں، بہت ڈر لگتا ہے مجھے تو۔ اللہ سب کی عزتیں محفوظ رکھے۔"
حلیمہ بیگم نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔
"اماں، آپ نے کہہ دیا اور ہم نے سن لیا۔ دنیا پڑھ رہی ہے باہر جا کر مردوں سے، کیا سب بھاگ جاتی ہیں گھروں سے؟۔ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں مہربانی ہوگی آپ کی۔"
شاہانہ نے جھنجھلا کر اماں کے آگے ہاتھ جوڑے اور سلیم الدین چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ حلیمہ بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔
"سب بھاگ تو نہیں جاتیں مگر آگ اور پٹرول کو یکجا نہ کرو شاہانہ۔"
حلیمہ بیگم چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکیں۔

☆......☆......☆

کئی ماہ سے سارہ ایک ٹیچر وانیا رحمان کے ساتھ چپکی رہتی تھی، جس کی اسکول میں موجودگی کا جواز سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس کی ڈیوٹی آخر ہے کیا، وہ ان سے سینئر تھی، عمر بمشکل پچیس سال ہوگی، تیکھے نین نقوش، چھریرا متناسب جسم، ناکافی لباس، بنا دوپٹے اور بھڑکیلے میک اپ میں شوخ و شنگ انداز لیے کسی ماڈل کی طرح کیٹ واک کرتے، اسکول کی راہداریوں میں اٹھلاتے پھرنا اس کی روٹین تھی اور یہی اس کی جاب تھی۔ اتنا تو زارا بھی سمجھتی تھی کہ سارہ یقیناً کسی خاص وجہ سے اس کے ساتھ اٹیچ ہوئی ہے، اس وجہ سے وہ خاموشی سے سب دیکھ رہی تھی۔ کافی دن بعد سارہ زارا کے ہاتھ لگی تو اس نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔
"کن چکروں میں ہو میڈم، قصہ کیا ہے یہ، بڑی الفت ہو چلی ہے وانیا سے۔"
زارا نے سارہ کو گھورا۔
"یار چائے منگواؤ پلیز۔"
سارہ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر گر سی گئی۔
"خیریت ہے سارہ، طبیعت تو ٹھیک ہے۔"
زارا لپک کر اس کے پاس آئی، اس کے ماتھے کو چھوا، سارہ خلافِ معمول فریش نظر نہیں آ رہی تھی، یہ اس کی نیچر کے خلاف تھا، وہ تو انتہائی نامساعد حالات میں بھی چٹکلے چھوڑتی رہتی تھی مگر اس دن وہ چپ چاپ تھی۔
"بس یار، آج میں ڈپریس ہوں، انسان محض پیسے کے لیے اپنا سب کچھ بیچ دیتا ہے، کیا ہے یہ پیسہ؟...... اس کے لیے اصول، آدرش، ایمان، دین، خدا، بھگوان...... انسان سب کچھ بیچ دیتا ہے۔ سب کچھ۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"
سارہ کی آنکھوں میں نمی تھی،
"سارہ، ہوا کیا ہے، مجھے بتاؤ، شیئر کرو مجھ سے پلیز، یوں دل چھوٹا مت کرو۔"
زارا نے سارہ کے سر کو محبت سے سہلایا۔
"وانیا پر کام کر رہی تھی میں کئی ماہ سے۔ پہلے تو بالکل ہی نہیں کھل رہی تھی مگر میں نے اس کے مزاج کے مطابق باتیں کیں، دولت کی ہوس، پیسے کی ضرورت ظاہر کی اس کے سامنے، خود کو اس کا ہم مزاج شو کیا، تب کہیں جا کر اس نے اشارتاً مجھ سے کچھ باتیں کی ہیں۔ ــــــ تم یقین نہیں کرو گی، اسکول میں اس کا کام کچھ خاص مہمانوں کی راتیں رنگین کرنا ہے بس، ان میں کچھ پولیس والے ہیں، کچھ بیوروکریٹس ہیں اور کچھ اجنبی مہمان، اور کوئی کام نہیں اس کا۔ احمد ہمدانی اسے کسی بھی وقت کال پر بلا لیتا ہے، یہ کئی لڑکیاں ہیں جو اس کام میں ملوث ہیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا زارا۔"
سارہ روہانسی ہوگئی۔ زارا بھی ہونٹ بھینچے اس کو دیکھ رہی تھی۔
"تم نے شروع میں ایک واقعہ بتایا تھا مجھے، ان

لڑکیوں کا جو تقریری مقابلے کے لیے ایک ویک سے گھر سے دور تھیں اور ان کے گھر والے آئے تھے۔ ان لڑکیوں کو ایک ویک کے لیے آن ڈیمانڈ بھیجا گیا تھا مختلف بڑے لوگوں کے بیڈ روم میں، اور وہ خوشی خوشی گئی تھیں محض اپنے حالات بدلنے کے لیے۔ جب یہ نظر آنے لگے کہ اس کام کو ہر کوئی کر رہا ہے تو اس کا راستہ ہی سیدھا راستہ محسوس ہوتا ہے، چاہے وہ غلط ہو، اسی طرح ورغلاتے ہیں یہ طالبات کو۔''

سارہ رو رہی تھی۔

''اس نے بتایا ہے یہ سب کچھ۔''

زارا کا لہجہ افسردہ تھا۔

''صاف صاف تو نہیں بتایا، نہ ہی اپنا نام لے کر بتایا ہے مگر مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا۔ پہلے تو مجھے لالچ دے رہی تھی، لاکھوں کے خواب دکھا رہی تھی، میں نے ہچکچاہٹ ظاہر کی تو مجھے ایسا کام کرنے کو کہا کہ میرا دماغ ہی الٹ گیا، آج مشکل سے ضبط کیا ہے میں نے۔''

ہر وقت ہنسنے مسکرانے والی سارہ کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔

''مجھے کہنے لگی کہ کئی اسکول کالج ایسے بھی ہیں کہ جہاں کی طالبات راتوں کو جاتی ہیں کہیں نہ کہیں، ان میں یونیورسٹی ہاسٹل سے بھی لڑکیاں ہوتی ہیں، ہر بیچ میں ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو آسان ہدف ہوتی ہیں، کچھ کا مسئلہ پیسہ ہوتا ہے، کچھ سسٹم کی باغی ہوتی ہیں، کچھ اونچے خوابوں کی اسیر ہوتی ہیں، کچھ تھرل چاہتی ہیں، کچھ اندر سے کمزور ہوتی ہیں اور اپر کلاس میں جانے کے لالچ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں، ان کے اندر کی چنگاری کو پھونک مار کر الاؤ بنانا پڑتا ہے بس، ان کی برین واشنگ کا معاوضہ بھی شاندار ملتا ہے، کم عمر سٹوڈنٹس کی بہت مانگ ہے اور ریٹ بھی ہائی ملتا ہے، پہلے بھی کئی طالبات پیسے کے لیے ان کا ساتھ دے رہی ہیں، مجھے بھی للچا رہی تھی کہ میں برین واشنگ کا کام لے لوں ذمہ۔!!''

سارہ رونے لگی، زارا نے اس کا سر اپنے اندر سمو لیا اور سر کو محبت سے تھپکنے لگی۔

''مت روؤ مری پیاری بہن، یہ سب تو جانے کب سے اور جانے کہاں کہاں جاری ہے، ہم نے اب دیکھا ہے نا، تم فکر نہ کرو، ہم اپنا کردار ادا کریں گے، ہم ان کا قلع قمع کریں گے مگر دیکھ بھال کر، کچا ہاتھ ڈالا تو کام خراب ہو جائے گا۔''

زارا نے محبت بھرے لہجے میں اسے تسلی دی، یہ اور بات کہ اس کا اپنا من خراب ہو رہا تھا۔

''یہ درندے ہیں زارا، خون چوسنے والے۔ یہ مشعل اٹھائے ہوئے لٹیرے ہیں، یہ بھیڑ کے لبادے میں بھیڑیے ہیں، ماں باپ ان کو ماں باپ جان کر اپنے جگر کے ٹکڑے سپرد کرتے ہیں، یہ ان ہی کا خون چوس رہے ہیں، ذرا بھی رحم نہیں ان کے دل میں۔''

سارہ بلک رہی تھی، تڑپ رہی تھی، ہانپ رہی تھی!!

☆......☆......☆

''میں زارا بول رہی ہوں سر۔ ہمیں آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

اس وقت زارا اور سارہ ایک ساتھ سارہ کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں، آج سنڈے تھا، اسکول معاملات پر ان کی تشویش بڑھتی چلی جا رہی تھی، آخر کار انہوں نے کرنل شیرازی سے سیل فون رابطے کا فیصلہ کیا۔

''جی زارا صاحبہ، کیسی ہیں آپ، آپ کی جاب کیسی جا رہی ہے اور معاف کرنا آج کل مصروفیات کی وجہ سے میں تو اسکول جا نہیں رہا، مگر ہمدانی ہے نا۔ کوئی مسئلہ ہے تو اسے بتاؤ۔''

دوسری طرف سے کرنل شیرازی کی شفیق آواز ابھری۔

''سر، ہمیں آپ سے ملنا ہے۔ سارہ اور میں نے۔''

زارا نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، ابھی آ جاؤ اگر ایزی ہو تو، میں گھر ہی ہوں۔''

کرنل شیرازی نے خوش دلی سے کہا۔

''او کے سر، ہم آدھ گھنٹے تک پہنچ رہے ہیں۔''

زارا نے کال منقطع کی۔

''چلو سارہ اٹھو، ہم نے ابھی جانا ہے۔''

زارا نے اٹھتے ہوئے کہا، سارہ تو پہلے ہی سے تیار تھی، آدھ گھنٹے بعد وہ کرنل شیرازی کے وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں براجمان تھے۔

''کیسی ہیں ینگ لیڈیز، کس مشن پہ ہیں آج کل۔''

کرنل شیرازی کے آنے پر وہ احترام میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''سر، وی آر فائن۔ سر کچھ مسائل تھے جو ڈسکس کرنے تھے۔''

سارہ نے دھیمے انداز میں کہا۔

''کیوں نہیں، آپ بتائیں جو معاملہ بھی ہے۔''

''سر، اسکول سے متعلقہ کچھ باتیں ہیں، آپ پلیز تسلی سے ہماری بات سنئے گا۔''

زارا نے تمہید باندھی۔

''آپ ٹینشن نہ لیں، بولیں پلیز، صاف صاف بات کریں، جو بھی ہے۔''

زارا پہلے ہی سارہ سے ڈسکس کر چکی تھی کہ فی الوقت فائزہ اور شہریار کی اکیڈمی والا معاملہ ہی سامنے لانا ہے، انہوں نے ساری بات کرنل شیرازی کو بتائی، وہ تحمل سے ان کی بات سُن رہے تھے مگر ان کے ماتھے کی شکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے بات مکمل کی تو کافی دیر ڈرائنگ روم کی فضا میں خاموشی چھائی رہی۔ وہ دونوں بھی گردن جھکائے منتظر تھیں۔

''بہت بڑی بات ہے یہ اگر سچ ہے تو۔ فائزہ کی تو احمد بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ اور فیضِ عام اکیڈمی والے معاملے کا شاید اسے بھی نہ پتہ ہو۔ بہر حال جو بھی ہو، اس سے رزلٹ تو ہمارا ہی اچھا آئے گا نا۔''

کرنل شیرازی نے پیشانی سہلائی۔

''لیکن سر، والدین ہم پر اعتماد کرتے ہوئے بچیوں کو ہمارے پاس بھیج رہے ہیں، ہم ایک نئی اکیڈمی میں ریفر کر رہے ہیں، بغیر تحقیق و تصدیق کے، کون لوگ ہیں، کیا کر رہے ہیں، کیسے ہیں۔ کچھ بھی تو معلوم نہیں ہمیں۔''

سارہ نے اپنا پوائنٹ آف ویو دیا۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں، کرتا ہوں کچھ۔''

کرنل شیرازی نے بات سمیٹی۔

''کرنل صاحب، اب آپ ٹکے ٹکے کی ٹیچرز کی باتوں میں آ کر میرے بھائی سے دل میلا کریں گے جو ہمارا دیا کھاتی ہیں اور ہم پہ غراتی ہیں۔''

وہ شاید مسز شیرازی تھیں جو اچانک ڈرائنگ روم میں آ گئیں، وہ تینوں بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔

''میں کہتی ہوں کہ ان عورتوں کی اپنی کوئی لڑائی ہو گی جس کے لیے یہ میرے بھائی کو بدنام کر رہی ہیں۔''

مسز شیرازی مسلسل بول رہی تھیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''آپ اندر جائیں پلیز۔ یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے، میں خود تحقیق کروں گا۔''

کرنل شیرازی نے اپنی بیوی کو ڈانٹا۔

''مگر میں بتا رہی ہوں کہ جھوٹ بول رہی ہیں یہ دونوں۔ میرے بھائی نے ان کو لفٹ نہیں کرائی ہو گی، جس کا یہ ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔''

مسز شیرازی کی ٹون اور جملے توہین آمیز تھے۔

''کنٹرول کریں اپنے آپ کو مسز شیرازی۔ ہم محنت کر کے روزی کما رہے ہیں، ملازم نہیں ہیں ہم آپ کے۔''

زارا سے اب برداشت نہ ہو سکا تو اس نے سلگتے لہجے میں کہا، سارہ اسے باہر کھینچ رہی تھی مگر وہ وہاں جمی کھڑی تھی۔

''تو کیا ہو تم۔ نوکر نہیں تو پھر ہو کیا، مالک ہو کیا۔ مالکن بننے کے ہی تو خواب ہیں تمہارے، ارے اتنا نخرہ ہے تو گھر بیٹھو، حرافہ کہیں کی۔''

مسز شیرازی نے اس پر جھپٹنا چاہا مگر کرنل شیرازی نے اپنی بیگم کا بازو تھاما اور اندر کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ زارا کے اندر آتش فشاں پھٹ رہے تھے، اتنی توہین، اتنی بے توقیری۔!!

''اندر چلو رخشی، پاگل ہو گئی ہو تم۔''

کرنل شیرازی دھاڑے۔

''پاگل میں نہیں، آپ کی یہ لاڈلی ہوئی ہیں جن کو

جانے کیوں جاب پر رکھ لیا تھا آپ نے۔"
مسز شیرازی دھاڑی۔
"سوری بیٹا۔ ویری سوری۔ اب آپ چلیں جائیں، ہم بعد میں بات کریں گے۔"
کرنل شیرازی نے بیوی کی کلائی تھامے انہیں معذرت خواہانہ انداز میں بے بسی سے دیکھا۔ زارا پیر پٹختی ہوئی باہر کی طرف چل دی، سارہ اس سے چند قدم پیچھے تھی۔

☆......☆......☆

کل کے واقعہ کی وجہ سے اگلے دن اسکول میں بھی زارا کی طبیعت گری گری رہی، اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو رہا تھا، وہ کافی دیر سے سر تھامے اپنے روم میں بیٹھی تھی جب سارہ پر جوش انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔
"کرنل شیرازی آئے ہوئے ہیں پرنسپل آفس میں۔"
"ارے واہ۔ اب مزہ آئے گا۔"
زارا اچھل پڑی۔
"اتنا بھی خوش نہ ہو، دیکھا نہیں کل بیگم صاحبہ کا طنطنہ۔"
سارہ نے جل کر کہا۔
اتنے میں زارا کی ایکسٹینشن پر بیل ہوئی، زارا نے فوراً فون اٹھایا، اس نے اوکے کہہ کر ریسیور رکھ دیا، سنجیدگی کی ایک گھمبیر تہہ اس کے چہرے پر چھائی تھی۔
"کیا ہوا۔"
سارہ نے تجسس بھرے لہجے میں دریافت کیا۔
"ہم دونوں کو بلایا جا رہا ہے پرنسپل آفس میں۔"
زارا نے مختصر جواب دیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تو منہ کیوں لٹک گیا تمہارا، چلو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"
سارہ نے اسے تسلی دی۔
پرنسپل آفس میں جا کر ان کا دماغ بھک سے اڑ گیا، وہاں کرنل شیرازی، بوائز کیمپس کے پرنسپل عاصم غنی، بیگم شیرازی، احمد ہمدانی کے علاوہ فائزہ بھی موجود تھی، جانے وہ کب آئی مگر انہیں اطمینان تھا کہ احمد ہمدانی کے خلاف سب سے ٹھوس ثبوت فائزہ کی شکل میں موجود تھا۔ دونوں نے کرنل شیرازی کے اشارے پر اپنی سیٹ سنبھالی۔ احمد ہمدانی ان کو کینہ توز نگاہوں سے گھور رہا تھا۔
"مس فائزہ، میں نے بہت ہی اہم مقصد کے لیے آپ کو زحمت دی ہے، مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے اور آپ چھٹیوں پر ہیں، بہرحال شکریہ کہ میرے کہنے پر آپ تشریف لائیں۔"
کرنل شیرازی تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ فائزہ نے سر جھکا کر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، وہ نروس نظر آ رہی تھی۔
سارہ اور زارا کو بے چینی ہونے لگی کہ فائزہ صاف صاف کیوں نہیں بتا رہی کہ وہ چھٹیوں پر نہیں تھی بلکہ اسے نوکری سے جواب دے دیا گیا ہے۔
"مس فائزہ، کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کو اس کیمپس میں کسی سے کوئی شکایت تو نہیں، کسی نے آپ کو ہراساں کیا ہو یا کوئی اور مسئلہ؟؟"
عاصم غنی نے فائزہ کی طرف دیکھا۔
ایک لمحے کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی، سارہ اور زارا کے دل دھڑک رہے تھے، سب سے اہم مرحلہ آن پہنچا تھا۔
"نہیں سر۔"
ایسے لگا فائزہ کے یہ الفاظ حروف کا مجموعہ نہ ہوں بلکہ ایٹم بم کی بوچھاڑ ہو جو ان کے سر پر پھٹی ہو۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی نظروں سے اس لڑکی کو دیکھ رہی تھیں جو اس دن ان کے سامنے آنسو بہا بہا کر اپنی بربادی کی داستان سنا رہی تھی۔ کرنل شیرازی نے اسی لمحے ان دونوں کی طرف دیکھا، اس کی نظروں میں دکھ ہی دکھ تھا، بیگم شیرازی حقارت اور احمد ہمدانی فاتحانہ انداز میں انہیں گھور رہے تھے۔ سارہ اور زارا کا سر گھوم رہا تھا، کمرے کے در و دیوار جگہ بدلتے نظر آ رہے تھے۔
"یہ کیا ہو گیا۔ دنیا ایسی بھی ہے!!"

☆......☆......☆

چھت پر بنے نیچی چھت والے اسٹڈی روم میں جانے کب سے وہ راکنگ چیئر پر جھول رہی تھی، اس کا سر چیئر کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا، شام سے رات ہو چکی تھی، باہر موسم ابر آلود تھا، تیز ہوا کا جھونکا آتا اور کمرے کے کواڑ زور سے ٹکراتے مگر اندر کا شور زیادہ بلند تھا۔ شور ہی شور۔ سماعتیں شل کرتا شور۔ سلمٰی خاتون کئی بار اسے بلانے آچکی تھی، آخر تھک ہار کر اسے تنہا چھوڑ دیا، اسے معلوم تھا کہ اس کے اندر جنگ جاری ہے جو کم سے کم فی الحال کسی صورت نہیں تھم سکتی۔ وہ سوچوں کے عفریت کے شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی جو اس کے نرخرے میں دانت گاڑ کر اس کا لہو پی رہا تھا۔ کیوں، کیسے کی گردان اس کی سوچ کے مہیب خلا میں سر ٹکرا رہی تھی۔

''دنیا ایسی بھی ہوتی ہے، لوگ چہرے کے پار بھی چہرہ رکھتے ہیں، بات کے اندر بھی بات ہوتی ہے۔''

اس کے اندر بے بسی نے آنسوؤں سے لبریز قہقہہ لگایا۔

اندھیاروں کا دیس ری گوری
اندھیاروں کا دیس۔!!
برف کی جیون نیا ہے۔!!
اور چہرہ ماٹی ماٹی ہے
لو کے چلتے بھابھڑ ہیں۔
کیوں بیٹھی نیر بہائے ہے؟
اندھیاروں کا دیس ری گوری!!
اندھیاروں کا دیس۔!!

اس کے اندر درد گرلایا، زارا نے زور زور سے آنکھیں مسلی، کرسی کی رفتار تیز ہوگئی۔!!

''ہم نے تو تمہارے درد پر مل کر آنسو بہائے تھے فائزہ۔ تمہاری آواز لرزی تو ہماری ایک ایک رگ درد سے مرتعش ہوگئی تھی۔۔ تمہارے ہونٹ کانپے تو ہم سے بولا نہ گیا اور تم نے سسکی بھری تو ہماری روح تجسم کے پنجر میں پھڑ پھڑانے لگی تھی فائزہ۔ تم کب تنہا تھیں۔ پھر کیوں کیا۔ کیوں کیا ایسا تم نے۔ اعتبار، مان، انسانیت۔ سب کچھ پامال کر دیا تم نے۔''

زارا نے سسکی بھری!!

باہر شاید بارش شروع ہو چکی تھی، ہوا کے ساتھ بوندوں کی بوچھاڑ اس سے ٹکراتی اور اندر تک جھرجھری طاری ہو جاتی۔!!

دروازے پر سایہ سا لہرایا۔

''زارا۔''

بہت مدھم آواز میں کسی نے پکارا۔

آنکھوں کے پردے پر آنسو لرزاں تھے، عکس دھندلا رہا تھا مگر سماعت نہیں دھندلائی تھی، زارا نے آنکھوں کو رگڑا اور دروازے کی اوڑ غور سے دیکھا۔ باہر زور سے بجلی چمکی، اس لمحاتی فلیش نے عکس واضح کر دیا۔

فائزہ سر جھکائے کھڑی تھی!!

☆......☆......☆

''ابھی تک چھٹی نہیں کرائی تم نے اُس کی۔ میں کانٹوں پہ دن کاٹ رہی ہوں۔''

زُنیرہ پھنکاری۔

''دیکھو جان، اتنا آسان نہیں ہے یہ سب، تمہاری وجہ سے ہم بیک فُٹ پہ آگئے ہیں۔''

انصر نے دفاعی انداز میں کہا۔

''کیا مطلب بیک فُٹ پہ آگئے ہیں۔ اس جیسی جانے کتنی برائٹ وے کی راہداریوں میں گم ہو گئیں، مسئلہ کیا ہے آخر۔''

زُنیرہ پھٹ پڑی۔

اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور غصے کے مارے ستواں ناک کے نتھنے پھول پچک رہے تھے۔

''مسئلہ تم ہو زُنیرہ۔ میں نے کاغذات میں تمہیں ٹیچر سے اسسٹنٹ بنا دیا تا کہ ہم آسانی سے اس کمرے میں وقت گزار سکیں اور لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر بھی جانے تمہیں مسئلہ کیا ہے کہ تم ٹیچرز سے پنگا لینے لگتی ہو، آرام سے بیٹھو یہاں۔''

انصر نے تحمل سے زُنیرہ کو سمجھایا۔

''اب تمہیں لوگوں کا بڑا ڈر لگ گیا ہے، اس وقت تم سوسائٹی سے کیوں نہیں ڈرے جب میں یہاں ٹیچر تھی

اور تم نے مجھے ٹریپ کیا تھا۔"
زُنیرہ شعلے اگل رہی تھی۔
"جو بھی ہوا تمہاری مرضی سے ہوا تھا۔"
انصر نے کمزور سی آواز میں کہا۔
"مرضی۔ ہونہہ۔ خوب کہی مرضی کی بھی۔ تم نے شادی کا وعدہ کیا تھا مجھ سے اور اسی بلڈنگ میں، اسی کمرے میں مجھ سے میرا سرمایہ چھین لیا تم نے۔ میں تمہیں روکتی رہی، خدا رسول کے واسطے دیے مگر تم نے یاد ہے کیا کہا تھا۔ کہ سب کچھ میرا ہی تو ہے۔ آج بھی اور کل بھی۔ یاد ہے نا تمہیں یا بھول گئے سب۔ جانے کتنے ابارشن تم نے کروا دیے میرے، اس چھوٹی سی عمر میں اور آج تم مجھے سائیڈ پر کر رہے ہو۔ چھوڑوں گی نہیں میں تمہیں۔"
زُنیرہ کی آواز بلند ہو رہی تھی، یہ ڈوبتے ہوئے مسافر کی کشتی کا کنارہ تھامنے کی آخری کوشش تھی۔
"تو اس کمرے میں تم مرضی سے آتی تھیں یا میں تمہیں اغوا کر کے لاتا تھا۔"
انصر نے طیش بھرے لہجے میں کہا۔
"یہ کوآرڈی نیٹر آفس تھا، یہاں میرا آنا بنتا تھا، آفس کام سے آتی تھی میں۔ تم نے اسے بیڈ روم بنا لیا۔ تمہارا بھانڈا میں سرِ عام پھوڑوں گی، میرے پاس تو گنوانے کے لیے بچا ہی کیا ہے، تہی دامن تمہیں بھی کر دوں گی، دکھا دوں گی دنیا کو تمہارا اصل چہرہ۔"
زُنیرہ اس کی بات پر مزید بھڑک اٹھی۔ اس نے پیپر ویٹ اٹھا کر دیوار پر دے مارا، جنون [illegible]ار تھا اس کے سر پر۔
"پلیز آہستہ بولو۔ کول ڈاون، کول ڈاون زُنیرہ۔ جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا بس تھوڑا انتظار اور کر لو، کچھ فیملی معاملات ہیں، ان کو سیدھا کر لوں۔"
انصر نے لجاجت سے کہا۔
"تین سال سے تمہارے مسائل ہی حل نہیں ہو رہے، صاف کیوں نہیں کہتے کہ کوئی اور پھول تمہیں پسند آ گیا ہے۔ مگر اس بار میں سب کو بتاؤں گی تمہاری اصلیت۔ کسی بھول میں نہ رہنا۔ انڈر سٹینڈ۔ جس جس کو تم نے برباد کیا، سب پتہ ہے مجھے۔ سب کو سامنے لے آؤں گی میڈیا کے۔"
زُنیرہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں کہا۔
"اگر تم نے ایسی حماقت کی تو وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"
انصر پھنکارا۔
برائٹ وے کی دیواریں افسردہ انداز میں اس علم کے مرکز کی بے توقیری دیکھ رہی تھیں!!

☆......☆......☆

زُنیرہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ انصر کا خون پی جائے، اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ اس کی ویڈیو ریکارڈنگ کی گئی ہے جو کسی بھی وقت اس کی رسی کھینچنے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے، زُنیرہ کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا، ایم اے کرنے کے بعد بوریت سے بچنے کے لیے اس نے برائٹ وے سسٹم جوائن کیا، اس کے والدین اس حق میں نہیں تھے مگر بیٹی کی ضد کے سامنے انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ زُنیرہ سیدھی سادھی معصوم سی لڑکی تھی، اس کی معصومیت اور حسنِ بلا خیز اس کے پاس کتنے بڑے ہتھیار تھے، اسے خود بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ مگر اسکول کے کوآرڈی نیٹر انصر نے اس کے سراپا کو آنکھوں آنکھوں میں تولا اور اسے اپنے لیے مختص کر لیا۔ اس کے کچھ لیکچرز فری کر کے انصر نے اسے فائل ورک، سلیبس، ایڈمیشن پراسس کے لیے کمرے میں بلانا شروع کر دیا، وہ گھنٹوں کمرے میں تنہا رہتے ہنسی مذاق سے شروع ہونے والا تعلق آگے بڑھتا چلا گیا، پھر اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ انصر کر قریب آتی چلی گئی، اتنا قریب کہ سب ہی پردے، سب حجاب اٹھ گئے۔ انصر نے اسے احساسِ ملکیت دیا، اسے ادارے کی مستقبل کی مالکہ قرار دیا اور وہ خوابوں میں خود کو اسکول اونر سمجھنا شروع ہو گئی، اسکول میں دھڑلے سے دندناتے پھرنا، ہر ٹیچر کی بے عزتی کر دینا، مرضی سے آنا، مرضی سے جانا، غرضیکہ اس کا ہر انداز مالکوں والا ہو گیا اور پھر اس کی زارا سے جھڑپ ہوئی۔ زارا جس کا اعتماد بھرا انداز

اور کسی سے فری نہ ہوتا، اسے آگ لگا گیا، وہ تو ہر لڑکی کو برائے فروخت سمجھتی تھی۔ خود بکی تو اسے نہ بکنے والوں سے نفرت ہوتی چلی گئی۔ خود لٹی تو اسے ہر وہ لڑکی زہر لگنے لگی جو لٹنے سے ڈرتی ہو، جو اپنے مال و متاع کو عزیز از جان رکھتی ہو۔ اسے پہلی بار زارا کے محاذ پر شکست کا سامنا تھا۔ گرچہ اسکول پر ہولڈ مسز شیرازی اور اس کے بھائی احمد ہمدانی کا تھا مگر اسکول کے تمام کاغذات، رجسٹریشن، اکاؤنٹس کرنل شیرازی کے نام تھے، اس وجہ سے اسے احمد ہمدانی، انصر وغیرہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، یہی وجہ تھی کہ زنیرہ کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ آج تو انصر نے کھلم کھلا دھمکی دے دی تھی، کچھ کرنا ضروری ہو گیا تھا، اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ گھوڑا پھونک مار دے، اسے پھونک مارنے میں پہل کرنا تھی۔ آخر اس نے سارہ ضیا سے ملنے کا فیصلہ کر لیا، اسے معلوم تھا کہ اس کے والد آرمی سے کرنل ریٹائرڈ ہیں، وہی اس کی مدد کر سکتی ہے۔ وہی ان کا توڑ ہو سکتی ہے!!

☆……☆……☆

''چلو جاؤ یہاں سے، کیوں آئی ہو میری بے بسی کا تماشا دیکھنے۔''

زارا نے سر دوبارہ کرسی پر ٹکا دیا، وہ شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لڑکی کی جس کے لیے وہ بے وقعت ہوئی، تحقیر کا نشانہ بنی۔

فائزہ آہستہ آہستہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی، اس نے اپنا داہنا ہاتھ زارا کے کندھے پر رکھا جو زارا نے شدت سے جھٹک دیا۔

''اس سے پہلے کہ میں تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں، دفع ہو جاؤ۔ سنا نہیں کیا کہا ہے میں نے۔''

زارا کا غصہ شُوٹ کر رہا تھا۔

''نہیں جاؤں گی میں، چاہے مجھے دھکے دے کر ہی کیوں نہ نکالو۔ سننی ہوگی میری بات تمہیں۔''

فائزہ زارا کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کے گھٹنے تھام کر رونے لگی۔

''مجھ سی بدنصیب اسی کی مستحق ہے کہ مجھے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا جائے، مجھے گلی گلی رسوا کیا جائے، مجھے سنگسار کیا جائے، میں نے ہر پیارے رشتے کا مان توڑا، ہر محبت بھرا رشتہ ٹھکرا دیا میں نے۔''

وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی، اس کا سر زارا کے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔ زارا کسی پتھر کی مورتی کی طرح ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔

''اب کونسا ڈرامہ کرنے آئی ہو۔ اب کیا کسر رہ گئی ہے ہماری رسوائی میں۔ بولو کوئی ڈائیلاگ، کرو کوئی نئی ایکٹنگ، لکھوا دو ہمیں سولی پہ کہ اب تو یہی ہونا رہ گیا ہے۔ اس مغرور عورت کی تحقیر آمیز نگاہیں اور احمد ہمدانی کی فتح صرف تمہاری وجہ سے برداشت کیں میں نے۔ اور کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا میرے پاس۔ اتنی بے بسی میں نے کبھی نہیں برداشت کی، کبھی نہیں کی۔''

زارا کی آواز آنسوؤں سے بھیگتی چلی گئی۔

''مجھے یہ دکھ نہیں کہ میں اس دن جھوٹی ثابت کر دی گئی، مجھے دکھ یہ ہے کہ سچ ہار گیا، کذب فاتح ٹھہرا، وہ لوگ بھیڑیے ہیں۔ تم نے درندوں کا ساتھ دیا فائزہ۔ کچھ تو سوچتیں فائزہ، کچھ تو لحاظ کرتیں اصولوں کا۔!!''

زارا خاموش آنسو بہائے جا رہی تھی۔

''میں مجبور تھی زارا۔ بہت مجبور، بے بس، اکیلی۔ درندوں کے بیچ تنہا لڑکی۔ کوئی بھی نہیں میرا تو۔''

فائزہ کی ہچکیاں تیز ہوتی چلی گئیں۔

''اس دن میں تم دونوں کو بتا نہیں پائی۔ میری ویڈیوز ہیں اس کے پاس۔ ایک نہیں بے شمار، پہلی چوری چھپے بنائی گئی اور اسی کی وجہ سے مجھے ہر بار ریکارڈنگ کروانی پڑی۔ میں نے تو اپنے گلے میں خود رسی ڈال کے اس کے حوالے کر رکھی ہے، اب اسے کیسے کہوں کہ رسی کو بل نہ دے کیونکہ میرا دم گھٹ رہا ہے!!''

فائزہ نے بلکتے ہوئے رک رک کے اسے بتایا اور زارا کا سانس رک گیا، اس لمحے اسے احساس ہوا کہ فائزہ تو اندھیری چٹان پر کھڑی ہے، آگے مگرمچھوں سے بھرا

وسیع سمندر ہے اور پیچھے نوکیلی چٹانوں والی مہیب کھائی ہے، جس کی گہرائی کا بھی نہیں معلوم!!

اس نے بے اختیار فائزہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

اس نیچی چھت والے کمرے میں گھور اندھیرا، برستی بارش، طوفانی ہوائیں اور ان کی سسکیاں مل کر بین کر رہی تھیں!!

☆......☆......☆

پھر وہ کئی دن تک اسکول نہ جا سکی، طبیعت بحال ہی نہیں ہو پا رہی تھی بس سارا دن ماں کی گود میں سر رکھ کر اوندھے منہ لیٹی رہتی تھی، جو ہو گا دیکھا جائے گا، یہی آخری سوچ تھی جو اسے سکون دیتی تھی، اس نے بڑی سیدھی سادھی زندگی گزاری تھی، اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ باہر کی دنیا مکر و فریب کی دنیا ہے، اس نے تو بس ماں کی گود ہی دیکھی تھی جہاں پر سکھ کی چھایا تھی، چلچلاتی دھوپ جہاں اجازت لے کر آتی تھی، دکھ اور غم ماں کی گود سے بہت پرے ہو کر گزرتے تھے، اسے کیا معلوم تھا کہ ماں کی گود کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے جہاں اماوس کے ڈیرے ہیں جن کی کوکھ میں اندھیرے پلتے ہیں، جہاں لوگ تاریک من میں کالی سوچوں کا بوجھ لیے پھرتے ہیں، یہ دنیا جیسے جیسے اس پر منکشف ہو رہی تھی، وہ صدمے سے شل ہوتی جا رہی تھی، ہر چوٹ نئی، ہر دکھ آنکھیں وا کر دینے والا لگتا تھا، پھر وہ کرلاتی پھرتی تھی۔ کہاں جائے، کس جگہ چھپے، کس گپھا میں پناہ لے کہ اماوس سے جان چھوٹے۔

اماوس کی شب تیرہ
چلی آئی دبے پاؤں!!
مرے سورج چلے آؤ
مری آنکھوں میں رم جھم ہے
مرے دل میں اندھیرا ہے!!

''جانے کب چھٹے گا یہ اندھیرا۔''

اس نے آنگن میں لیٹے ہوئے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے سوچا۔

''یہ پرندے کتنے خوش قسمت ہیں، روز نئی وسعتوں میں اُڑتے ہیں۔''

جانے کیوں اداسی اس کے اندر ٹھہر گئی تھی۔ اسے اسکول کی فکر تھی نہ اپنی نوکری کی، اسے تو اس اندھیری رات کا خوف تھا جو روشنی کی آڑ میں پھیلائی جا رہی تھی۔ اماں جانے کچن میں کیا کر رہی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑنے اور ذہن کو آزاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''زندگی کی کتاب میں تو آخری صفحے پر جواب بھی نہیں ہوتے زارا، صرف سوال، صرف سوال، گنجلک اور بھید بھرے سوالوں کا نام زندگی ہے۔''

ایک لمبی سانس لے کر اس نے اندر کا غبار باہر نکالا۔

''آئن سٹائن کی بدروح، خود عیاشیاں کر رہی ہو اور ہمیں ٹینشن دی ہوئی ہے۔''

وہ سارہ کی قریب سے آئی آواز پر اچھل پڑی اور پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''ارے ارے، فوت نہ ہو جانا۔''

سارہ اس کی چارپائی کے پاس ہی پہلوؤں پر ہاتھ رکھے کھڑی اسے غصے سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ پاس کون کھڑا ہے۔''

اس نے آنکھیں ملتے ہوئے سوچا۔

''یہ صبا ہی ہے، ہوش میں آؤ بڑی بی، آسن پٹی لیے پڑی ہو، چلو اٹھو شاباش۔''

سارہ نے چٹکی بجائی۔

زارا کے اندر توانائی کی ایک لہر اٹھی، وہ چھلانگ مار کر چارپائی سے اٹھی، صبا کے چہرے پر چھائی ازلی معصومیت، آنکھوں کی چمک اسے زندگی کا اعتبار عطا کرتی تھی۔ جانے کیوں اسے ہمیشہ صبا سے انرجی ملتی تھی۔

''تم اسکول سے غائب ہو گئیں، نہ کچھ بتایا، نہ ڈسکس کیا، ہم نے سوچا کہ بندہ یا تو گزر گیا یا ڈر گیا۔''

سارہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ڈرنے والے اور ہوں گے، میں نہیں ڈرتی ورتی۔''

زارا نے اپنے نیچرل انداز میں جھنجلا کر غصے سے کہا

اور سارہ، صبا دونوں کھلکھلا کر ہنسیں۔
"یہ بات مرے عزیز، یہی انرجی درکار ہے ہمیں کیونکہ برائٹ وے کو ابھی ہماری ضرورت ہے، بہت سے معاملات سیدھے کرنے ہیں، بہت گڑبڑ ہے۔"
سارہ نے اس کی کمر پر ہاتھ مارا۔
"میں تو سمجھی کہ برائٹ وے کے سامنے کی سڑک سے بھی میرا گزرنا بند ہو جائے گا مگر حیرت انگیز طور پر خاموشی ہے۔"
زارا واقعی حیرت میں تھی۔
"ہمارے ہوتے تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"
سارہ نے فرضی کالر کو کھینچتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔
"اچھا پیچھے ہٹو، مجھے معلوم ہے امی نے بلایا ہے تم دونوں کو۔ ماؤں کے ایکسرے سے بچنا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ خیر چھوڑو، صبا پہلی دفعہ آئی ہے، مجھ کچھ بنانے دو اس پیاری سی ڈول کے لیے۔"
زارا کے اندر کی اداسی اس سرپرائز پر فنش ہو چکی تھی، اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا، کچن کی کھڑکی سے ان کو دیکھتی سلمٰی خاتون بھی مسکرا رہی تھی۔
☆......☆......☆
"سامعہ کچھ نہیں ہو گا مری جان، دیکھو ہم نے ایک تو ہو ہی جانا ہے، پھر کیا ہرج ہے۔"
کاشان نے سامعہ کا ہاتھ پکڑا اور وہ اندر تک لرز گئی۔
یہ فیضِ عام اکیڈمی کے تیسرے فلور پر ایک بیڈ روم نما کمرہ تھا، آج سنڈے تھا، اکیڈمی پوری طرح ویران تھی، سامعہ ٹیسٹ کا بہانہ کر کے کاشان سے ملنے چلی آئی تھی۔ اس کے والدین خوش تھے کہ ان کی بیٹی بہت محنت کر رہی ہے، رات گئے تک پڑھتی ہے، چھٹی کے دن بھی اکیڈمی جاتی ہے، اچھی ٹیسٹنگ میں ہی میرٹ کا راز چھپا ہے، اسی وجہ سے ٹیسٹ کے نام پر وہ بخوشی سامعہ کو جانے کی اجازت دے دیتے تھے۔ موبائل نے کام بہت آسان کر دیا تھا، سر کاشان کے میسج کے بعد وہ بھی پاپا کی گاڑی یا آٹو رکشہ لے کر اکیڈمی چلی آتی تھی۔ اس
کمرے میں وہ پہلی مرتبہ آئی تھی۔ اس کے اندر بے چینی کی لہر اٹھ رہی تھی، فطری معصومیت اسے تھام رہی تھی مگر تنہائی اسے لرزا رہی تھی۔
"سامعہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، تمہیں پتہ ہے نہ کہ جب تک تمہیں نا دیکھ لوں میرا دن مکمل نہیں ہوتا۔"
کاشان نے ایک اور داؤ کھیلا، چاہے جانے کا احساس جو ہر لڑکی کی کمزوری ہوتا ہے۔ کاشان پرانا کھلاڑی تھا۔
"سر آپ اپنے گھر والوں کو بھیجیں گے نا ہمارے گھر۔"
سامعہ نے جھکی پلکوں سے کہا۔
"میں تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا ہوں، بس تمہارے پیپر ہو جائیں، ہم ایک ہو جائیں گے۔"
کاشان نے اپنے لہجے میں محبت سموتے ہوئے کہا۔
"سر، میں۔ میں اب چلتی ہوں۔"
سامعہ نے نہ جانے والے انداز میں کہا، وہ بدستور بیٹھی ہوئی تھی۔ پتا جب تک شاخ سے جڑا رہے، اسے اندازہ نہیں ہوتا کہ آندھیوں کی شدت کتنی ہوتی ہے مگر شاخ سے ٹوٹتے ہی اسے اپنی ناتوانی کا احساس ہوتا ہے، سامعہ کے اندر جذبات کے جھکڑ چل رہے تھے جو اسے اڑائے جا رہے تھے۔
"ابھی نہیں جان، ابھی تو آئی ہو۔"
کاشان نے لہجے میں محبت بھرتے ہوئے کہا۔
"سامعہ، جس دن میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا نا تو ساری رات سو نہیں سکا تھا، جی چاہتا تھا کہ کل کا سورج نکلے اور میں اڑ کر اکیڈمی پہنچ جاؤں۔ اتنا مکمل حسن میں نے آج تک نہیں دیکھا، یوں لگتا ہے جیسے تم اس زمین کی باسی ہو ہی نہیں، ایمان سے۔"
کاشان نے وارفتگی سے اسے دیکھا اور اس نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔ وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔
"سر، مجھے بھی آپ۔"
سامعہ نے حیا بار پلکوں سے ادھوری بات کی جو ادھوری ہو کر بھی مکمل تھی۔

''جان دور کیوں ہو مجھ سے، مجھ میں سما کر مجھے مکمل کر دونا۔''

کاشان نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ کھنچتی چلی آئی۔اس کے اندر جذبات کے بگولے اٹھ رہے تھے۔رقصِ ابلیس جاری تھا۔

☆......☆......☆

''اس بار کیمرے ہر اینگل سے فٹ کروا دیئے ہیں اور ہیں بھی پاور فل ریزولیشن والے۔اس بار خیال رکھا ہے،پچھلی بار کیمرا کوالٹی کی بڑی شکایت رہی تھی۔''

احمد ہمدانی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

''ہاں ہاں، نیا مال جلد مل جائے گا،کام جاری ہے، بندے لگے ہوئے ہیں بلکہ اب تو کام قریب ہے، کانٹا ڈالا ہوا ہے،کوئی نا کوئی مچھلی چارہ نگل ہی لے گی، کچھ مچھلیاں تو سٹوڈیو میں پہنچا دی گئی ہیں۔''

شہریار نے اوباشانہ لہجے میں کہا۔

''مری جان یونیفارم میں ہی ہو گیں تمام ویڈیوز۔مجھے پتہ ہے یونیفارم کی بڑی مانگ ہے، کہو تو وانیا، زُنیرہ اور فائزہ کو بھی یونیفارم پہنا دوں۔''

احمد ہمدانی نے زور دار قہقہہ لگایا،اس کے چہرے پر شیطانیت ثبت تھی۔

''اور کتنی کم عمر ہوں،فرسٹ ائر سیکنڈ ائر تو بھیج رہا ہوں،اب کیا ففتھ سکستھ کلاس پر چلا جاؤں، دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا،دامن بچا کر کام کرنا ہے ہمیں۔''

اس بار شہریار ذرا جھنجھلا گیا۔

''یہ مشکل ہے یار، بلکہ ناممکن ہے،ہم نے ادارہ بھی چلانا ہے،اسی سے سب کی روزی لگی ہوئی ہے،سب کچھ رضامندی سے ہو تو بات باہر نہیں نکلتی،تمہیں ریپ کے مناظر درکار ہیں،مگر زبردستی میں خطرات ہیں، ٹھنڈا کر کے کھاؤ،مرغی ایک ہی بار کیوں ذبح کرتے ہو۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا اور احمد ہمدانی ذرا سنجیدہ ہو گیا۔

''اچھا میں ٹرائی کروں گا،مگر اس کا ریٹ سوگنا زیادہ ہو گا۔''

اس نے دوٹوک لہجے میں بات کی۔

''پھر ٹھیک ہے،اوکے اوکے۔بے فکر رہو، ٹائم پر ڈیلیوری ہو گی۔''

احمد ہمدانی نے فون رکھ دیا۔

''مینوں نوٹ وکھا،میرا موڈ بنے۔''

وہ گنگنایا،اس وقت اس کا چہرہ کسی انسان کا نہیں بلکہ بھیڑیے کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔خون آشام بھیڑیا!!

☆......☆......☆

سارہ اور صبا کے آنے سے اگلے دن کی سہہ پہر تھی، آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، بدلیاں ایک دوسرے کا تعاقب کرتیں پورے آسمان پر پھیل چکی تھیں،روح کو چھونے والی ٹھنڈی ہوا درختوں کو جھولا جھلا رہی تھی، پتے تالیاں بجاتے ہوئے برکھا رُت کا استقبال کر رہے تھے، تھوڑی ہی دیر بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی، زارا صحن میں ہی ایک چارپائی پر لیٹی بارش کا لطف اٹھا رہی تھی، اسے یوں لگ رہا تھا کہ گنگناتی بوندیں اس کے جسم کے آر پار ہو رہی ہیں،ایسے میں گرمی اور اداسی کا احساس مر چکا تھا اور جسم ہلکا ہو کر پرندوں کے ساتھ آسمان پر اڑ رہا تھا،زارا کو ایسا موسم ہمیشہ اچھا لگتا تھا،اس کا دل چاہتا کہ کاش وہ کوئی فاختہ ہوتی جو دل کھول کر بارش میں بھیگتی اور پھر بھیگ کر کسی درخت کی شاخ پر جا بیٹھتی، بارش اس کی روح کو ایسے تازہ کر دیتی تھی جیسے درختوں کے پتے بارش میں دھل کر نئے نکور ہو جاتے۔بارش تیز ہو رہی تھی، ہوا کی وجہ سے بوچھاڑوں کی شکل میں پانی برآمدے کے اندر تک آ رہا تھا۔

''ارے پگلی،اندر آ جا، کیوں بھیگ رہی ہے، بخار ہو گیا نہ تو پڑی رہنا مزید ایک ہفتہ گھر۔''

سلمٰی خاتون نے برآمدے سے اسے آواز دی۔

''امی پہلے بھی بخار ہوا ہے بارش سے جو آج ہو گا، بارش تو حدت کو ساتھ اُڑا لے جاتی ہے۔''

سارا نے چہرے پر بہتے پانی کو پونچھا۔

اتنے میں بنٹو اور ٹیپو جو باہر گلی میں کرکٹ کھیل رہے تھے، بھاگتے ہوئے اندر آ گئے اور برآمدے میں بریک

لگائی۔

"ارے گدھو، بارش بھی کوئی ڈرنے یا بھاگنے کی چیز ہے، یہاں آؤ میرے ساتھ اور بارش انجوائے کرو، کیا بکریوں کی طرح میں میں کرتے اندر گھس گئے ہو۔"

زارا نے بھائیوں کو کہا اور ہنسنے لگی۔

"ہمیں معاف کرو آپی، خود ہی نہا لو، بارش تو برآمدے میں بیٹھ کر پکوڑے کھانے کے لیے ہوتی ہے۔"

ٹیپو نے منہ بسورتے ہوا کہا۔

ان کی نوک جھونک جاری تھی کہ زارا کا سیل فون جو برآمدے میں رکھا تھا، بجنے لگا۔ مجبوراً اسے برآمدے میں آنا پڑا۔

"کون ہے۔ بارش میں بھی چین نہیں۔"

زارا بڑبڑائی اور سیل فون کی اسکرین کو گھورا، کوئی نیا نمبر تھا، پہلے تو اس کا دل چاہا کہ اٹینڈ نہ کرے مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے کال اٹینڈ کرلی۔

"آپ میڈم زارا ہیں۔؟"

دوسری طرف سے ایک گھبرائی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی۔

"جی، مگر آپ کون ہیں۔؟"

زارا کا لہجہ خود بخود سخت ہو گیا۔

"میں صبا کا والد بول رہا ہوں، صبا ابھی تک گھر نہیں پہنچی، میری بچی کو ڈھونڈ دیں مجھے۔ بس اسٹاپ پر ہی کھڑا ہوں تین گھنٹے سے میں، بہت ٹینشن ہو رہی ہے مجھے۔"

دوسری طرف سے بلکتی آواز سن کر ایسے لگا جیسے اسکے سر پر کسی نے ایٹم بم دے مارا ہو۔

"او مائی گاڈ۔ صبا کہاں رہ گئی، وہ تو اسکول بس سے جاتی ہے۔"

زارا کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا، صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے سب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں کچھ کرتی ہوں، آپ حوصلہ کریں۔"

زارا نے فون بند کر دیا، اس کے جسم میں جیسے جان ہی نہیں تھی، وہ بے اختیار دیوار سے لگ گئی۔

"بیٹی حوصلہ کرو، ہو سکتا ہے بس خراب ہو گئی ہو یا کوئی اور مسئلہ ہو، حل جائے گی بچی۔"

"مجھے جانا ہوگا امی، مجھے جانا ہوگا۔"

زارا نے ہذیانی انداز میں کہا اور اندر کی طرف دوڑی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔

"اس موسم میں تم کہاں جاؤ گی زارا، پاگل ہو گئی ہو، اسکول پرنسپل کو فون کر دو، وہ خود مسئلہ حل کریں گے۔"

سلمیٰ خاتون نے زارا کو سمجھایا۔

"اسکول۔ اسکول جاؤں گی میں، آپ بس سارہ کو فون کر دیں کہ اسکول پہنچے۔"

زارا کے لہجے میں درد اور بے چینی تھی۔

"بارش تو دیکھو، سیلاب آیا ہوا ہے سڑکوں پر، نہ کوئی سواری ملے گی، عقل کے ناخن لو زارا، جوان جہان لڑکی ہو، خود کو خطرے میں مت ڈالو۔"

سلمیٰ خاتون کی جان پر بن آئی تھی۔

"میں نے اسے کہا تھا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ مجھ پہ بھروسہ تھا اسے اور میں نے اسے اکیلا چھوڑ دیا۔ مرے مالک اسے امان میں رکھنا۔"

زارا زور سے چیخی۔

اس نے جلدی جلدی چینج کیا، عام شوز کی بجائے اس نے جوگرز کا انتخاب کیا، سیل فون اور پرس اٹھا کر وہ صحن عبور کرتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑی۔

"اچھا سارہ آپی کو یہیں بُلا لیتے ہیں، آپ اکیلی کیسے جاؤ گی آپی یا پھر ہم ساتھ چلتے ہیں۔"

بنٹو نے حتمی لہجے میں کہا۔

"تم سارہ کو کہو کہ گاڑی لے کر ویکم چوک تک آ جائے، میں وہاں پہنچتی ہوں۔"

زارا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے پر لگ جائیں اور وہ اُڑ کر اسکول پہنچ جائے۔

"آپی میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گا۔"

بنو نے قطعی انداز میں کہا۔ نیپو بھی پریشان سا کھڑا تھا

''فضول باتیں مت کرو، سارہ ہو گی نا میرے ساتھ، تم بس سارہ کو فون کرو۔''

زارا نے بنو کو جھاڑا اور گھر سے باہر آ گئی، آسمان جیسے بین کر رہا تھا۔!!!

☆......☆......☆

خوش قسمتی سے ایک آٹو رکشہ والا ان کے گھر کے سامنے ہی رکشے کی سیٹ اٹھا کر کچھ کر رہا تھا۔ وہ ابھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ اس کے سر پر پہنچ گئی۔

''بھائی، پلیز ایمرجنسی ہے، جلدی سے ویلکم چوک چلو۔''

اس نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بی بی جی لگتا ہے آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا رکشہ، آدھے گھنٹے سے مغز ماری کر رہا تھا اس کے ساتھ۔''

رکشے والے نے گھر جاتے جاتے ملتی دیہاڑی پر مالک کا شکر ادا کیا اور رکشے کو سٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھا دیا۔

''بھائی ذرا تیز تو چلائیں اسے۔''

زارا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر پہنچ جاتی اسکول، اس کا دل اندر سے لرز رہا تھا۔

''بی بی جی جگہ جگہ پانی جمع ہے، کیا پتہ کہاں پر کھلا ہوا گٹر ہو، پھنس گئے تو پہنچ ہی نہیں سکیں گی آپ۔''

رکشے والے کی بات درست تھی، دور دور تک سڑکیں ویران پڑی تھیں، پانی سیلابی نالوں کی طرح بہہ رہا تھا، سڑکیں جھیل بنی ہوئی تھیں، اردگرد کی کالونیوں کا پانی بھی سڑکوں پر جمع ہو رہا تھا۔ اتنے میں اس کے سیل فون کی رنگ ہوئی، سارہ کا فون تھا۔

''کہاں ہو زارا، میں گھر سے نکل آئی ہوں، ٹینشن نہ لو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

سارہ کی آواز میں سنجیدگی کے ڈیرے تھے۔

''میں بس پہنچنے ہی والی ہوں ویلکم چوک۔ یہ کیا ہو رہا ہے سارہ۔''

زارا رونے والی ہو رہی تھی، صبا کا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

''میں بھی پہنچنے والی ہوں، ڈونٹ وری۔''

سارہ نے مختصر بات کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

ویلکم چوک پر اس نے رکشے میں بیٹھے بیٹھے ہی انتظار کیا، تھوڑی دیر بعد سارہ کی سٹی نظر آتے ہی اس نے رکشے والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا۔

''یار اسکول جانا چاہیے ہمیں، میرا دل کہتا ہے کہ وہ وہیں ہے، گڑبڑ اسکول میں ہی ہے۔''

زارا نے گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔

''چلتے ہیں، چلتے ہیں۔ ذرا صبر کرو اور میں نے سپیشل برانچ میں اپنے ایک کزن کو بھی الرٹ کر دیا ہے، ہمیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

سارہ نے گاڑی آگے بڑھائی۔ زارا نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''چلو اترو، آ گیا اسکول۔''

سارہ نے گاڑی اسکول کی بیک سائیڈ پر ایک درخت کے نیچے پارک کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں کیوں، سامنے سے کیوں نہیں؟''

زارا نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''وہاں گل خان بیٹھا ہے ہمارے سواگت کے لیے، جانے دے گا وہ ہمیں اندر۔؟؟''

سارہ نے اسے گھورا اور زارا نے سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی۔ بارش ابھی بھی طوفانی انداز میں جاری تھی۔

اسکول کی عقبی دیوار بہت بلند تھی، اس پر کچھے دار باڑ بھی لگی ہوئی تھی۔ زارا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اندر کیسے جائیں گی۔ سارہ بھی ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئی۔ اسے امید تھی کہ پیچھے کوئی عقبی دروازہ ہو گا مگر دیوار سپاٹ تھی۔

''لگتا ہے اب سامنے سے ہی جانا پڑے گا، چلو کچھ کرتے ہیں۔''

مین گیٹ اور ذیلی کھڑکی نما گیٹ حسب توقع بند تھے۔ وہ دونوں ایک چوڑے تنے والے درخت کی آڑ

میں کھڑے تھے جس سے بارش براہِ راست ان تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر اس وقت وہ سر سے پاؤں تک بری طرح بھیگے ہوئے تھے۔

''گل خان اور اسکول والوں کی نظر میں ہم مشکوک ہیں، وہ پہلے ہی ہمیں برداشت کر رہے ہیں، وہ تو قیامت تک دروازہ نہیں کھولے گا۔''

زارا نے سرگوشی کی۔

''آؤ میرے ساتھ اور چوکیدار کے کمرے کی کھڑکی کو آہستہ سے تھپتھپاؤ۔ وہ جھانکے تو لہرا کر گر جانا جیسے بے ہوش ہوگئی ہو اور خبردار اسے تمہارا چہرہ نظر نہ آئے، ورنہ وہ کبھی گیٹ نہیں کھولے گا۔''

سارہ نے جھنجلا کر کہا، اس کے ہاتھ میں ایک درخت کی مضبوط ڈنڈا نما شاخ تھی جو ابھی ابھی ٹوٹ کر گری تھی۔ زارا نے چوکیدار کی کھڑکی کو بجایا، سارہ مین گیٹ کی طرف ایک کونے میں کھڑی تھی، اسے گیٹ کے پلر کی آڑ میسر تھی۔ کافی دیر تو اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ زارا نے کھڑکی بجانا جاری رکھا۔

''اوئے کون ہے خانہ خراب کا باچہ، اس موسم میں بھی گھر میں چین وین نہیں۔''

اندر سے گل خان کی بڑبڑاتی آواز آئی۔

جیسے ہی اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا، زارا لہرا کر اس انداز میں گری کہ اس کا چہرہ مخالف سمت میں گھوم گیا۔ گل خان چونک گیا، وہ دروازہ کھولنے میں جھجک رہا تھا، اسی کشمکش میں وہ ساکت کھڑا رہا، اس کی نظر زارا کے جسمانی نشیب و فراز، جسم سے چپکے لباس میں الجھی ہوئی تھی، دور تک سناٹا تھا، زوروں کی بارش اور تنہا لڑکی۔ گل خان نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اس کی کشمکش ختم ہوگئی، وہ لپک کر مین گیٹ پر آیا، جیسے ہی اس نے چھوٹا دروازہ کھول کر سر نکالا، کونے میں تیار کھڑی سارہ نے ڈنڈے کی زوردار ضرب گل خان کے سر پر لگائی اور وہ تیورا کر باہر کی طرف گرا اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگیا۔ زارا اور سارہ نے مل کر اسے کھینچ کر کمرے میں پہنچایا، اس کے ہاتھ پاؤں چارپائی کی ادوائن سے باندھے، اسی کے تکیے کے غلاف کا گولا بنا کر اس کے منہ میں ٹھونسا اور کمرے کی باہر کی کنڈی لگاتے ہوئے بلڈنگ کی طرف دوڑے۔

''پرنسپل آفس چلو، فائزہ نے اسی کا بتایا تھا، اسی جگہ سے اس دن ہنسی کی آواز آئی تھی، وہ فائزہ ہی کی آواز تھی مگر ہمیں اس کمرے کا پتہ نہیں تھا۔''

زارا نے سیڑھیوں کی طرف لپکتے ہوئے کہا، سارہ اس کے پیچھے تھی۔

پرنسپل آفس حسب توقع لاک تھا۔

''اوہ، یہ تو بند ہے، اب کیا کریں۔ اسی کے پیچھے خفیہ کمرہ ہے۔''

زارا نے الجھی سانسوں کے ساتھ مایوسی بھرے لہجے میں دروازے کو جھنجھوڑا۔

''انہوں نے کیا ہمیں دعوت دے کر بلایا ہے جو پھولوں کے ہار لیے ہمارا استقبال فرماتے، بند ہی ہونا تھا اس نے۔''

ان لمحات میں بھی سارہ نے زارا کو چھیڑا مگر زارا نے جواب نہ دیا۔

''مجھے ہٹو ذرا، ان فینسی دروازوں کا کیا کھلا ہونا کیا بند ہونا۔''

سارہ نے اسے سامنے سے ہٹایا اور ایک زوردار کِک دروازے کے لاک والی جگہ پر ماری، لاک کا لیور لکڑی کو توڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ دروازہ کھل گیا۔ زارا نے حیرت سے سارہ کو دیکھا۔ آفس میں لگی ایک پینٹنگ کو ہٹانے پر پیچھے ایک لیور دکھائی دیا، اس لیور کو گھمانے پر دیوار میں ایک دروازہ سلائیڈ کر گیا، یہ لکڑی کا دروازہ تھا جس پر دیوار کے رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔ یہ سب تفصیلات زارا کو فائزہ نے بتائی تھیں، یہی ان کا ریکارڈنگ روم تھا جسے شاہانہ بیڈروم کی شکل دی گئی تھی۔

درخت کی شاخ اس وقت بھی سارہ کے ہاتھ میں ہی تھی، ان دونوں کو کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ کمرہ خالی تھا!!

ان کا دماغ گھوم گیا۔ منزل پر پہنچ کر بھی منزل نہ مل سکی۔

''سارہ، ہمیں فیضِ عام جانا ہوگا، وہ وہیں ہے، اسپیشل برانچ والوں کو بھی فون کر دو اور سارہ کے والد کو تسلی دے دو، اس کو مت بلانا اکیڈمی، وقت بہت کم ہے۔''

زارا نے پُر یقین انداز میں کہا اور نیچے کی طرف دوڑ پڑی، سارہ اس کے ساتھ تھی۔

☆......☆......☆

''کسی طرح صبا کو بھی اکیڈمی لے آؤ، کسی بھی بہانے سے۔''

شہریار نے نمیرہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

اس وقت فیضِ عام میں چھٹی ہو چکی تھی مگر نمیرہ اب تک وہیں بیٹھی تھی، اس نے ڈرائیور کو آدھ گھنٹا دیر کا ٹائم بتایا ہوا تھا۔

''کیوں، اس کا کیا کرنا ہے۔''

نمیرہ چونک اٹھی۔

''تمہیں اس سے غرض نہیں کہ کیوں۔ مگر تمہیں کرنا ہو گا یہ۔''

شہریار نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

''کیا مطلب سر، آپ مجھے آرڈر نہیں دے سکتے، میں ملازم نہیں آپ کی۔''

نمیرہ کو بھی غصہ آ گیا، اس کے اندر صبا کے نام پر حسد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ویسے بھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ کئی دنوں سے سر شہریار اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔

''ملازم تو چھوٹا لفظ ہے نمیرہ، غلام، ہو تم، غلام۔''

شہریار کی آواز میں بھیڑیے جیسی غراہٹ در آئی تھی۔

''یہ دیکھو ذرا۔''

شہریار نے کچھ تصویریں نمیرہ کی گود میں پھینکیں۔

''لگوا دوں ان کو شہروں کی دیواروں پر۔ بھیج دوں تمہارے والدین کو۔''

نمیرہ سُن ہو گئی، اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا ہے، وہ ایک نظر کے بعد ان تصاویر کو نہ دیکھ سکی، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

''یہ سب ویڈیو کی شکل میں بھی دستیاب ہے نمیرہ، اب فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے، اگر فرائڈے کو صبا کو لے آؤ، ورنہ پھر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے تمہارا۔''

شہریار نے اس کی گردن کے گرد شکنجہ مزید کسا، وہ پرانا کھلاڑی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ چڑیا پھڑ پھڑائے گی مگر مان جائے گی۔

''مگر۔ کیسے۔''

نمیرہ کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے، اسے اندازہ تھا کہ وہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔

''یہ ہوئی نا بات، بس تم اسے کہنا کہ اکیڈمی تمہیں کام ہے، اس کا گھر قریب ہی ہے تو تم اسے ڈراپ کرنے کا بھی ساتھ ہی کہہ دینا، وہ آ جائے گی ساتھ، آگے ہمارا کام ہے۔''

شہریار نے اسے پورا پلان سمجھایا۔

''میں کوشش کروں گی۔''

نمیرہ نے مری مری آواز میں کہا۔

''کوشش نہیں، تمہیں لے کر آنا ہے اُسے، کروڑوں کا چیک ہے وہ۔ اور ابھی تو تمہیں بہت کچھ کرنا ہے میری گڑیا۔''

شہریار نے نمیرہ کے گال پر انگلی پھیری۔

☆......☆......☆

فیضِ عام اکیڈمی پر چھاپہ میڈیا کی سب سے بڑی خبر تھی، چوکیدار نے اسپیشل برانچ والوں کو دیکھتے ہی رستہ دے دیا، اکیڈمی کے خفیہ کمرے سے صبا کو بے ہوشی کی حالت میں بازیاب کروا لیا گیا، جسے اسی دن نمیرہ دھوکے سے اپنی گاڑی میں اسکول سے اکیڈمی لائی تھی، خوش قسمتی سے ابھی اسے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، شہریار، کاشان اور ان کے تیسرے پارٹنر کو بھی گرفتار کر لیا گیا، ان کی نشاندہی پر برائٹ وے اسکول پر چھاپہ مارا گیا جو اس کام میں فیضِ عام اکیڈمی کے ساتھ شامل تھا۔ احمد ہمدانی، انصر، اکاؤنٹس آفیسر، کئی ٹیچرز کے ساتھ ساتھ کرنل شیرازی اور اس کی بیگم کو بھی گرفتار کیا گیا، دونوں جگہوں سے ویڈیوز کا ایک بڑا ذخیرہ قبضے میں لے لیا گیا، یہ ایک بڑا نیٹ ورک تھا جس کے تانے بانے دوسرے شہروں کے تعلیمی اداروں تک بھی پھیلے ہوئے تھے، معصوم بچیوں کو پھانسنے کے لیے کم عمر اور متاثر کن شخصیت کے ٹیچرز رکھے جاتے، اسٹوڈنٹس کی خفیہ ریکارڈنگ کے ذریعے ان کو بلیک میل کیا جاتا اور پھر ان کے ذریعے دوسری طالبات کو کنٹرول کیا جاتا، اس گینگ کا رابطہ یورپ کی پورن انڈسٹری سے تھا، جو کم عمر طالبات کی ایسی ویڈیوز منہ

ماتگے داموں خریدتی تھیں اور سائٹ پر اپ لوڈ کرتی تھیں، یہ اربوں کھربوں کا کالا دھندا تھا جس میں کئی نام نہاد شرفاء، سیاستدان اور مقتدر شخصیات شامل تھیں، ملک کی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کو اپنے ذرائع سے اس کی بھنک ملی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی، اپنی ٹاپ ایجنٹ سارہ ضیاء کو اسکول میں شامل کروایا اور اس مکروہ نیٹ ورک کو توڑا گیا۔ زنیرہ، وانیاء اور فائزہ کی گواہی، صبا کی برآمدگی، ویڈیوز کے ذخیرے کے بعد مجرموں کے لیے بچنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ کرنل شیرازی بذاتِ خود اس کام میں شامل نہ تھا، اس نے خلوصِ نیت سے یہ تعلیمی ادارہ شروع کیا تھا مگر بعد میں وہ اپنی بیماری کی وجہ سے سائیڈ پر ہو گیا، آہستہ آہستہ اس کی بیگم اور اس کا بھائی اس کے تعلیمی اداروں پر قابض ہو کر من مانی کیے جا رہے تھے اور وہ مجبور ہو کر سب دیکھ رہا تھا، مگر حقائق کا اسے بھی علم نہ تھا کہ اتنا انسانیت سوز کام تعلیم کے نام پر جانے کب سے جاری ہے۔

اسی شام جانے کتنے گھروں میں کتنی طالبات نے خود کشی کر لی، سفید براق لبادے میں ملبوس تسبیح کے دانے گراتی حلیمہ بیگم غم کی شدت سے ڈھے گئی تھی، ایک جنازہ ان کے گلشن کی کلی کا بھی اٹھا، سامعہ آنے والے وقت کا اندازہ کرتے ہوئے پنکھے سے لٹک گئی، شاہانہ اور سلیم الدین ماں سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے، گھر میں ماتم کا سماں تھا!!

"جانے کتنے اداروں میں ایسا کھیل کب سے جا رہی ہے، اسکولوں، کالجوں، اکیڈمیوں، یونیورسٹیوں۔ کہیں رضامندی سے، کہیں زبردستی۔ کہیں مارکس لگانے کے لیے بلیک میلنگ، کہیں سپلی لگانے کی دھمکی، کہیں اسائمنٹ کا نذرانہ۔ کہیں صرف مسکراہٹوں اور نظروں کے تبادلے کی حد تک، کہیں آخری حد تک۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قصور وار کون ہے؟ والدین کہاں جائیں؟ بیٹیاں کس کے دامن پہ اپنا لہو تلاش کریں، بکریوں کو چرواہوں پر اعتماد کر کے ان کے سپرد کیا جائے مگر وہ بھیڑیے نکلیں، اور پھر رکھوالی ہی نہ کی جائے تو نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، اعلیٰ ڈگریوں کے خواب کی دھند نے بہت سی قباحتوں کو اپنانے پر مجبور کر دیا ہے، بہت سی باتیں ہیں کہ جن کو والدین دل سے برا جانتے ہیں مگر سسٹم کے ہاتھوں مجبور ہیں، خواب ہاتھوں پہ لیے وہ سرِ بازار نکل آئے تو تعبیر بیچنے والوں نے قدم قدم پر پھندے سجا لیے۔!!

لٹیروں نے جنگل میں شمعیں جلا دیں
مسافر یہ سمجھے کہ منزل یہی ہے!!

قصور تو رنگوں کی تلاش میں بھٹکتی تتلیوں کا بھی نہیں۔ مگر کچھ پھول آدم خور بھی تو ہوتے ہیں نا، تتلیوں کا کیا قصور۔ کچھ بہت اہم فراموش بھی کر دیا گیا ہے۔ اسلام۔ جسے ہم نے بھلا دیا اور تباہ ہو گئے، اسلام جنسِ مخالف کے آزادانہ میل جول سے روکتا ہے مگر ہم نہیں رکتے۔ اور پھر کالی غار کی اتھاہ گہرائی ہمارا مقدر بن جاتی ہے۔ اسلام تنہائی میں مرد عورت کے ملنے سے منع کرتا ہے۔ ہم نے ذاتی تشریح کرتے ہوئے پردہ آنکھوں کا قرار دے کر اس حکم کو ڈسٹ بن میں ڈال دیا، نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ شیطان بہت مکار اور شاطر ہے، وہ مرحلہ وار برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک دم لے جائے تو کوئی بھی برائی نہ کرے۔ مگر کاش کوئی ہمیں گھروں میں قید کر دیتا، کاش کوئی ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر روک لیتا، کاش کوئی ہماری آنکھیں پڑھ لیتا کہ ہم کن خوابوں میں گم ہیں، کاش ہمارے والدین دکھ کے پرندوں کو ہمارے سروں پر کبھی گھونسلہ بنانے نہ دیتے، کاش گھر پر کسی کے پاس اتنا وقت ہوتا کہ ہمیں اسکول میں خود چھوڑ کر اور لے کر آتا، کاش کوئی ہمیں ٹوکتا کہ یہ عمر گڑیوں سے کھیلنے کی ہے، بج سنور کر گھر سے نکلنے کی نہیں، کاش کوئی ہم سے پوچھتا کہ سنڈے کو اکیڈمی میں کونسے ٹیسٹ ہو رہے ہیں، کاش کوئی ادارے کا ماحول چیک کر کے ہمیں بھیجتا۔ کاش کوئی ہاسٹلوں، اداروں میں بیٹیوں کو چیک بھی کرے کہ وہ کہاں آتی جاتی ہیں، کلاس میں ان کی حاضری کتنی ہے، کاش ڈگریوں، مارکس، شاندار مستقبل کی دوڑ میں ہمیں نہ دھکیلا جاتا، کاش کاش۔!!"

زارا آنسوؤں کی دھند میں دھاڑیں مار مار کر سامعہ کا آخری خط پڑھے جا رہی تھی اور کمرے میں موجود سبھی بلک بلک کر رو رہے تھے!!

☆☆......☆☆

خوشخبری

شاعری انٹرنیشنل انتخاب بہت
جلد منظر عام پر آرہا ہے

داستان دل ڈائجسٹ کی ٹیم شاعری انٹرنیشنل انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں سب شاعر شامل ہو سکتے ہیں اور جو شاعر نہیں وہ کسی بھی شاعر کی دو غزلیں انتخاب کر سکتے ہیں انشاء اللہ یہ کتاب بہت جلد مارکیٹ میں آرہی ہے شامل ہونے کے لیے آج ہی ہم سے رابطہ کریں

اہم نوٹ: اس بک کے لیے دو غزلیں یا نظم دے سکتے ہیں اور ایک ہزار فیس ہوگی ان پیسوں کی کتابیں سینڈ کی جائیں گی

03225494228
abbasnadeem283@gmail.com

سلسلہ انچارج

ارو نبیلہ اقبال، سحرش علی نقوی، آمنہ رشید، ملائکہ خان، ندیم عباس ڈھکو، نزہت جبیں ضیاء، نور بخاری، ریحانہ اعجاز، داستان دل ٹیم

اس انتخاب میں شامل لازمی ہوں انشاء اللہ یہ کتاب پاکستان کے علاوہ امریکہ، دوبئی، سعودی عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں پڑھی جائے گی انشاء اللہ۔ اس میں ہر ممالک سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اور شامل ہونا بھی آسان ہے آپ اپنی پسند کی دو غزلیں دے سکتے ہیں اور جو فیس دیں گے ان کی کتابیں مل جائیں گی ایسا چانس بار بار نہیں ملے گا اس لیے سب سے اپیل ہے کہ آپ سب شامل ہوں مزید معلومات کے لیے واٹس اپ 03225494228 یا فیس بک 03377017753 پر رابطہ کریں شکریہ
منجانب: داستان دل ڈائجسٹ ٹیم

افسانہ

مومنہ بتول

حسرتِ ناتمام

''میں نے بھیا سے کہا تھا ہم سب اپنے اپنے جیب خرچ جمع کر کے یہ والی آئس کریم منگائیں گے کیوں؟'' زبیر ڈریہ نے تائید چاہی اور ہاں میں نے بھی آپ کی بات سن لی تھی بیٹا جانی...... ''ساجد نے مسکرا کر جواب دیا۔ دوسری صبح ساجد کے کام پر جاتے......

دوپہر ہو چلی تھی۔ بچوں کو مدرسے بھیج کر عفت اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو لے کر نیم کی گھنیری چھاؤں تلے پلنگ پر آ گئی۔ لائٹ گئی ہوئی تھی اور ابھی مزید سوا گھنٹے بعد آنا تھی ایسے میں تپتے سیمنٹ کے کمرے میں بیٹھنا سوہان روح تھا تے دے......

پرانے نیم کا درخت کسی ماں کی طرح بانہیں پھیلائے اس تپتی دھوپ کا درماں بنا کھڑا تھا۔ عفت نے ساس کے تخت کی طرف دیکھا۔ کمزور نحیف وجود...... پھر بیماری کی دائمی صورت حال......اوپر سے اماں کی دوا بھی ہفتے بھر سے ختم تھی۔

''بیچاری اماں۔'' عفت نے دوپٹے سے مکھیوں کو بھگایا۔ پھر چھوٹے کو ساتھ لے کر لیٹ گئی۔

صبح چھ بجے سے بچے گھرداری کے جملہ اُمور نمٹانے کے دوران اُسے رات گئے لیٹنا نصیب ہوتا ہے بس دوپہر کی یہ چند گھڑیاں ملتیں تھیں جس میں وہ نیم کی چھاؤں تلے آ لیٹتی تھی۔ مہینے کا آخر آخر تھا آج 30 مئی کل...... پہلی......اور پہلی کے تصور کے ساتھ ہی تنخواہ کا خیال آیا تھا۔ مہینے بھر کی جاں توڑ محنت کا معاوضہ حیات کارخانہ کو چلانے کے لیے گرچہ ہمیشہ ہی ناکافی معلوم ہوتا تھا۔ مگر پھر بھی...... ہر ماہ کی پہلی تاریخ اُسے کچھ مسرور سا کر دیتی تھی۔

''بچوں نے کب سے اچھا کھانا نہیں کھایا۔ اس بار کم از کم ایک مرتبہ کباب......کوفتے اور آلو گوشت کا مزیدار سالن ضرور بناؤں گی۔'' خوب اچھی طرح بھون کر...... پتلے شوربہ والا......جس پر پڑی ہری مرچیں اور ہرا دھنیا...... ڈالا گیا ہو...... لیکن! تین مرتبہ خواہ ایک مہینے میں سہی گوشت کی یہ ڈشیں

کچھ نہیں تو ہزار ڈیڑھ ہزار کا خرچہ ہے۔ ساجد بتا رہے تھے کہ ہڈی والا بڑا گوشت بھی چار سو روپے چل رہا ہے۔ مگر بچوں کے لیے...... ڈیڑھ ہزار قربان سہی اُس نے پھر سے مینو بنانا

شروع کر دیا۔

چھوٹا کسمایا...... عفت نے اُسے تھپکا...... ہوا تو اچھی چل رہی تھی مگر اُس کا جسم ابھی تک پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اُسے ریشمی کپڑے چبھنے لگے تھے۔ کچھ ہو......! وہ آپ ہی آپ بدبدائی مہنگے ترین نہ سہی......

مگر سنڈے بازار میں سستی لون کے تھری پیس آٹھ آٹھ سو میں مل رہے ہیں۔ بس اس مہینے ایک اپنا ایک اماں اور ایک دُریہ کا...... سوٹ لے لوں گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی ہزار کے ہوں گے۔

ابھی پندرہ دن پہلے ہی وہ تمام بہنیں امی کے گھر جمع ہوئی تھیں۔ دونوں بھاوجیں اور تینوں بہنیں زور شور سے گرمیوں کے کپڑوں کے بارے میں ڈسکس کر رہی تھیں اُن کے پرنٹ...... اچھی کوالٹی...... دوسری کاپی...... اور ان بازاروں

کے بارے میں بھی جہاں معیاری...... گلگشن موجود ملتا تھا۔

اور وہ خاموشی سے اُس محفل میں ہوتے ہوئے بھی نہیں تھی۔ بڑھتی مہنگائی ساجد کی لگی بندھی آمدنی...... بے مہار اخراجات نے اُسے طرف...... سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔ اُسے تو 'ثنا سفینا ز' کے گارنٹیڈ معیار کا ابھی بھابی کی زبانی علم ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ واپسی کے وقت امی نے اپنا خوبصورت مہنگا ترین تھری پیس اُس کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔

''نہیں...... امی بھابی آپ کے لیے لائی ہیں۔ وہ برا مانیں گی۔'' بے بسی کے احساس نے اُس کی آنکھیں نم اور لہجہ گلوگیر کر دیا تھا۔

''بس بیٹا رکھ لو میں دیکھ لوں گی۔'' امی نے اُس کے بیگ میں شاپر رکھ دیا۔ وہ خاموش ہوگئی یوں بھی...... دُریہ کا پرائمری سیشن ختم ہو رہا تھا۔ فیر ویل پارٹی کے لیے وہ نئے سوٹ کا تقاضہ کر رہی تھی۔

پھر وہی سوٹ اُس نے سی کر دُریہ کو دیا تھا۔ عفت کو ایک بار پھر...... احساسِ کم مائیگی نے جکڑا...... بس کچھ ہو...... اس ماہ تنخواہ میں سے...... ڈھائی ہزار ہمارے ہوئے اُسے کچھ مسرت کا احساس ہوا۔ نیند نے پر پھیلائے مگر غنودگی میں جانے سے پہلے تک وہ لون کے سوٹوں میں اُلجھی رہی۔

جانے کتنی دیر ہوئی مگر پیاسے کوؤں کی کرخت آواز نے اُسے نیند سے جگا دیا۔ اماں بھی اُٹھ بیٹھی تھیں اور پانی کا کہہ رہی تھیں۔ عفت نے آہستگی سے سوئے چھوٹے کو تکیے پر لٹایا...... اماں کے لیے پانی لینے گئی کل کلاس ٹیچر نے اُسے میٹنگ میں بلوایا تھا۔

بچوں کی بابت بتایا کہ بچے ذہین بھی ہیں اور شوقین بھی...... مگر حد درجہ سست اور کمزور آپ ماں ہیں بڑھتے بچوں کی ماؤں کو تو ضرور ڈائٹ پلان کا خیال رکھنا چاہیے۔

ساتھ ساتھ ٹیچر نے بتایا کہ بچوں کو آپ روزانہ نہار منہ بھیگے بادام ایک کپ دودھ کے ساتھ ضرور دیں۔ جان و طاقت ہوگی تو بچے جلدی پک کریں گے اور جواب میں عفت کچھ کہہ نہ سکی تھی۔

چار بچے...... دو میاں بیوی ایک اماں سات افرادِ خانہ کمانے والا فرد واحد...... صبح سے رات گئے محنت کرنے والے ساجد کی تنخواہ 13 ہزار 800 روپے تھی۔ اسی میں سب کچھ پھر بھی دل مار مار کر جی رہے تھے وہ لوگ...... جہاں کھانے کے لیے سوچ سوچ کر انتظام کرنا پڑے۔ وہاں دودھ پھل میوہ جات...... بھلا...... عیاشی ہی کے زمرے میں آتے تھے۔

لیکن بچے...... وہ اُلجھی زبیر اور دُریہ دونوں سے میاں بیوی کی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ خود اوسط درجے تک تعلیم یافتہ تھے سو اپنے بچوں کے مستقبل کو کامیاب بنانا چاہتے تھے۔ مگر...... مگر اب میں بچوں کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گی اگر ایک ایک کپ دودھ اور 2، 2 بادام بچوں کو بالترتیب دیے جائیں تو...... دودھ 80 چل رہا ہے مہینے کا ساڑھے چار سو تک...... کا پڑے گا رہے بادام تو وہ بھی لے لوں گی بس ہزار اٹھے گا۔

ہاں مگر بچوں کی صحت بھی تو ضروری ہے زبیر، دُریہ اور سارہ ببلو تو ابھی چھوٹا ہی ہے۔ وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

دل ڈھل رہا تھا۔ بچے گھر آ کر کچھ کھیل میں

مصروف ہو گئے تھے۔ نیند کی رسیا دُر یہ...... دادی کے پاس لیٹ کر اونگھ رہی تھی۔ بچوں کو انہوں نے قریبی سرکاری اسکول میں ڈالا ہوا تھا۔ مگر ٹیوشن اچھی دلوا رہے تھے ماہانہ تین ہزار تینوں کے جاتے تھے۔ بچے اچھا رزلٹ بھی دے رہے تھے۔ عفت نے بچوں کو ٹیوشن کے لیے تیار ہونے کا کہا اور خود کچن میں چلی آئی ویسے بھی مہینے کی بالکل آخری تاریخ تھی۔

ہر چیز ناپید عفت نے چائے کا پانی رکھا اور آٹا گوندھنے لگی۔ ابھی کچھ عرصے سے اُس نے یہ سسٹم شروع کر دیا تھا۔ مغرب تک وہ بچوں کو چائے کے ساتھ گرم پراٹھے بنا دیتی۔ یا انڈے کا خاگینہ بچے شوق سے بھی کھالیتے اور گزارا ہو جاتا۔

آج بھی اُس نے یہی کیا۔ بچوں کو ٹیوشن بھیج کر اُس نے چھوٹے کو ساس کے حوالے کیا اور نماز ادا کر کے دوسرے دن کے لیے اسکول ڈریس استری کرنے لگی تو یاد آیا اُس کی استری تو پچھلے پندرہ دن سے خراب ہے۔

''ساجدہ......'' اُس نے دیوار پر سے پڑوسن کو پکارا۔

''تھوڑی دیر کے لیے استری چاہیے۔''

ساجدہ نے اُسے استری پکڑائی مگر عفت ساجدہ کی اماں کے تاثرات دیکھ چکی تھی وہ اک چھوٹے جھگڑالو ذہنیت کی حامل خاتون تھیں۔ اور اپنے رویے سے عفت کو باور کرا چکی تھی کہ روز روز کا استری مانگنا اُنہیں پسند نہیں۔

''خالہ...... آپ کہہ رہی تھیں نا...... راشد کی شاپ پر الیکٹرانک اشیاء کی سیل لگی ہے آپ اُسے کہنا مجھے قسطوں پر استری لا دے ایڈوانس کے 800 میں کل صبح دے دوں گی۔ وہ بلا سوچے سمجھے

بول اٹھی تھی اُسے روز روز کی شرمندگی نے شرمندہ جو کر دیا تھا۔ جو ہوگا اس طرح اپنی استری تو ہو جائے گی۔

کام سے فارغ ہو کر وہ اماں سے باتیں کرنے لگی تھیں اماں اُسے پیار سے سمجھاتیں...... اور وہ اماں کو ہمیشہ اپنی ماں ہی سمجھتی تھی سو دونوں ساس بہو میں اُنسیت کا رشتہ تھا۔

اچانک دروازہ بجا...... اور بھابی نصرت اندر آ گئیں۔ عفت خوش دلی سے ملی وہ اماں کے ساتھ آ بیٹھیں بھابی نصرت اُن کے گھر سے دو گلیاں آگے رہتی تھیں برسوں پرانا ساتھ تھا۔ اکثر کمیٹیاں ڈالتیں اور جب کوئی نئی کمیٹی بنتی وہ عفت کے پاس ضرور آتیں اُسے مشورہ دیتیں کہ جو بھی ہو عورت کو کچھ نہ کچھ بچانا چاہیے اور کمیٹی اُس کی اچھی شکل ہے۔

سو ضرورتیں اچانک آ کھڑی ہوتی ہیں انسان اُس وقت ادھار مانگ کر شرمندہ ہوتا ہے اس سے بہتر ہے کہ کچھ ماہانہ بچت کی جائے سو وہ بھی اسی لیے آئی تھیں ماہانہ ہزار پانچ سو پر نئی کمیٹی ڈال رہی تھیں۔ رمضان بھی آنے والے ہیں اگر میں کسی نہ کسی طرح یہ کمیٹی ڈال لوں تو...... بچوں کی عید کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ دونوں نندوں کا ایک ایک سوٹ اور چوڑیاں لے لوں گی آخر بہنوں کا بھی بھائی پر حق ہے اور ساجد تو ہیں ہی اکلوتے...... پھر عید کے تیسرے دن ہونے والی ان کی دعوت بھی اچھی ہو جائے گی۔

''بھابی......'' وہ ہچکچائی۔

''میں کمیٹی تو ڈال لوں گی مگر...... آپ مجھے رمضان میں دیں گی۔ تو میری عید اچھی ہو جائے گی۔''

''ارے بھئی عفت میں ممبر بنا رہی ہوں

چلو...... رمضان کی کمیٹی تمہاری ہوئی۔'' انہوں نے فوراً وعدہ کرلیا۔

رات گئے بچے بھی سو گئے تھے مگر ساجد ابھی تک نہیں آیا تھا اکثر اُس کا اوور ٹائم لگ جاتا تھا۔ سو دونوں ساس بہو مطمئن تھیں پھر رات تقریباً گیارہ بجے ساجد لدا پھندا گھر لوٹا تھا۔

آج تنخواہ جو ملی تھی۔ تین ہزار کا اوور ٹائم بنا تھا 2 ہزار تنخواہ سے ملا کر میں یہ پیڈسٹل فین لے آیا۔ یہ پرانا پنکھا کھر کھر کرتا تھا۔ اکثر آنکھ کھل جاتی تھی۔

''واہ پاپا! آپ نے بہت اچھا کیا۔'' زبیر اُٹھ بیٹھا ویسے بھی اُس کی نیند بہت کچی تھی۔ اور سب سے زیادہ پنکھے کے شور کرنے سے بھی وہی چڑتا تھا۔

''اٹھو بچو آج میں تم لوگوں کے لیے پسندیدہ آئس کریم بھی لایا ہوں۔''

ساجد نے سب سے پہلے اماں کو دی بچے بھی آئس کریم کا سن کر اٹھ گئے تھے۔

''یہ تو وہی ہے اشتہار والی۔'' دُریہ خوشی سے بولی۔

''میں نے بھیا سے کہا تھا ہم سب اپنے اپنے جیب خرچ جمع کر کے یہ والی آئس کریم منگائیں گے کیوں؟'' زبیر دُریہ نے تائید چاہی اور ہاں میں نے بھی آپ کی بات سن لی تھی بیٹا جانی......'' ساجد نے مسکرا کر جواب دیا

دوسری صبح ساجد کے کام پر جانے سے پہلے عفت نے تنخواہ کا لفافہ نکالا جو رات ہی ساجد نے اُسے دیا تھا پھر گنے...... تیرہ ہزار میں سے 2 ساجد نے پنکھے کے لیے نکالے تھے۔ سو گیارہ ہزار لفافے میں تھے۔ عفت نے گن گن کر تین ہزار کرایے کی مد میں ساجد کو دیے وہ لوکل ٹرانسپورٹ میں سفر کرتا تھا۔

''بچے آٹھ ہزار...... تین ٹیوشن کے عفت نے الگ کیے۔ ایک ہزار اماں کی دوا کے نکالے ماہانہ بجلی کا بل ساڑھے تین ہزار کے قریب قریب آتا تھا۔

سو وہ بھی الگ کیے گیس کے پانچ سو عفت نے...... ہمیشہ کی طرح ماہانہ...... بلز فیس...... الگ الگ کردی تھیں اور اب اُس کے ہاتھ میں صرف ڈھائی ہزار بچے تھے۔ ڈھائی ہزار...... روپے جس میں کھانا پینا...... اچانک آنے والے مہمان...... بیماری...... کہیں خوشی میں لینا دینا موت مرگ میں جانا...... بچوں کی کاپی، قلم، ربڑ، پنسل جیسے ازحد ضروری اشیاء راشن کے نام پر وہ صرف آٹا چینی آئل...... ہی مہینے بھر کا منگاتی تھی۔ باقی گوشت تو وہ لوگ مہینوں بعد کھاتے تھے۔ مگر دال سبزی بھی تو پیسے کی آتی تھی۔

عفت سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے سامنے...... صرف 30 کا ہندسہ ناچ رہا تھا۔ مہینے کے 30 دن اور 30 دنوں کے تین وقت کا کھانا...... خواہ دال، دلیہ سبزی چٹنی سہی کیسے ہوگا؟ کیا ہوگا ہر مرتبہ کی طرح عفت سن ہو رہی تھی۔ کل دوپہر سے ذہن میں بننے والی خوش آئند پلاننگ بھاپ کی طرح اڑ گئی تھی۔ کچھ بھی یاد نہ رہا تھا عفت کو......

یاد تھا تو بس یہ کہ اب کیسے اور کس طرح ان 30 دنوں کو گھسیٹتے...... کہ دوبارہ پہلی آجائے یا اللہ کرم کردے...... عفت اپنی سوچ کو بھلائے صرف...... دال دلیہ کے لیے...... اللہ کے حضور سجدہ ریز تھی زندگی کی باقی تمام تر ضروریات آسائش کا ٹیگ بن کر حسرتِ ناتمام میں ڈھل گئی تھیں۔

☆☆☆ ☆☆☆

افسانہ

زینب ملک ندیم

آنکھ مچولی

زندگی پھر ایسی ہوگئی کہ مانو کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ صائم صحیح کہتا تھا وہ کامیاب ہوگیا تھا اُسے پاگل جیسا بنانے کے لیے آنکھوں کا ایسا عالم تھا کہ اس شب اتنے آنسو بہے جیسے دریا میں طغیانی آ گئی ہو۔ سمندر کی طلاطم خیز موجیں...... تیز طوفان اس شب......

اس کی حیات اس سیج کی طرح تھی جو کانٹوں سے بھری تھی جو چبتی تھی تو وجود کو زخمی کر دیتی تھی اس زخم سے لگاتار خون رستا تھا کوئی نہ تھا اُس کا ہمدرد اُس کا ہمنوا جو اُس کے زخم پر مرہم لگا سکے۔

اس کا زخم مندمل ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

کبھی کبھار وہ تھک ہار جاتا تھا۔ کوئی پناہ گاہ نہ تھی جہاں وہ رہ سکے۔

آسائشیں تو بہت میسر تھیں مگر کوئی چھتنا ور درخت نہ تھا درد کم نہ ہوتا تھا۔ چندا و ماہتاب ایک نہ ہو پا رہے تھے۔

زندگی ایک پہلی کی سی تھی ہر شے آنکھ مچولی کھیلتی تھی۔ ابھی بھی چاند کبھی ٹہنیوں کی اوٹ میں چھپ جاتا اور کبھی باہر آ جاتا۔

آنکھ مچولی کا کھیل چل رہا تھا اس کے سامنے ایک سوالیہ نشان تھا۔

خاموش سا جیسے کوئی مسافر دسمبر کی کہر آلود رات میں بے سروسامانی کے عالم میں فٹ پاتھ پر گھٹنے ٹیکے سینے کے ساتھ لگائے ہوئے، گردن کو آگے کی طرف جھکائے پیٹھ گول، مرا ہوا۔ بالکل سوالیہ نشان۔

زندگی پانی کا سا بلبلہ تھا کہ کوئی بھی ہوا کا جھونکا اُسے مٹا سکتا تھا۔

اس نے بہت محویت سے چاند کو دیکھا، بے داغ، یکتا، تنہا اسے چاند بھی اپنے جیسا لگا۔

''اچھا جی! تو چاند کو اتنی محویت سے دیکھا جا رہا ہے۔ سنا ہے جو قیس کی طرح چاند کو دیکھتے ہیں نا اصل میں چاند میں محبوب کا چہرہ تلا کرتے ہیں۔ آپ کس کا چہرہ تلاش کر رہے ہیں؟'' وہ شرارت سے اس کے کندھے پر ٹھوڑی اٹکائے ہوئے شریر لہجے میں بولی۔

''جب ہمارے محبوب کا چہرہ سامنے ہے تو ہمیں چاند کو دیکھنے کی کیا ضرورت۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس کے چہرے پر خوبصورتی کا حسین امتزاج تھا سب سے جدا۔

''خوبصورتی ہی خوبصورتی...... دیوانگی ہی دیوانگی سراپا محبت۔''

محبت بھی کیا چیز ہے نا کسی بھی عام انجان شخص کو زندگی میں وہ مقام دے دیتی ہے جو کوئی بھی شخص خاصی تگ و دو کے بعد بھی حاصل کرنے سے قاصر ہو۔ وہ اس کی زندگی میں اہم مقام رکھتی تھی۔

مگر ایک دلفریب سا دھوکہ...... اُس کی آواز اُس کا وجود سب تخیل ہو چکا تھا۔ وہ ایسا ہی کرتی تھی ایک تصور جو کبھی کہیں سے چپکے سے آ کر ہیجان برپا کر دیتی تھی۔ اُس کی زندگی ہمیشہ امتحانات کی زد پر تھی۔

☆......☆......☆

اس کی مما اُس کے پاپا کی دوسری بیوی تھیں وہ اُن کی محبت تھیں۔

دادا جان کے کہنے پر انہوں نے پہلی شادی اُن کی بھانجی سے تو کر لی مگر دل تو وہ کب کا ہزال کو دے آئے تھے۔

انہوں نے کشادہ علاقے میں ہزال کو ایک بنگلہ خرید کر دے دیا جہاں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ آفندی نے دونوں بیویوں میں فرق نہ کیا تھا دونوں کو اُن کے مکمل حقوق فراہم کیے۔ ہزال آفندی نے عالیان اور شزا آفندی نے صائم کو جنم دیا۔

مسرتیں اُن کی زندگی میں بکھر گئیں۔ لگتا تھا زندگی میں کوئی دکھ نہ آئے گا مگر وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ تغیر و تنوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

توس قزاح کے رنگ ہمیشہ نہیں رہتے۔
دکھ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی اوٹ سے جھانک کر پکڑ لیتے ہیں۔ برے وقت کی جکڑ سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ سوائے اُن کے جو اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ آفندی اور ہزال کی ایک کار ایکسیڈنٹ میں موت ہوگئی۔

اظہر آغا بہت رحم دل انسان تھے جانتے تو تھے کہ آفندی نے دوسری شادی کرلی ہے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ آفندی خود اعتماد میں لے کر اُن سے بات کرے مگر زندگی نے موقع ہی نہ دیا کہ وہ باپ سے بات شیئر کر سکتے وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتے تھے اُن کی تعریفوں میں آسمان و زمین کے قلابے ملا سکتے تھے۔ مگر ڈر تھا کہ آغا جان کا مان نہ ٹوٹ جائے۔ اظہر آغا عالیان کو اپنے پاس لے آئے۔

عالیان ایک نہایت سنجیدہ اور سمجھدار بچہ تھا۔ ہر شے ہر عمل کو سمجھنے والا اس کے برعکس صائم عیش و عشرت میں اس طرح نشوونما پایا کہ اس میں ہر بری عادت تھی۔ وہ لااُبالی سا غیر ذمہ دار بچہ تھا۔ ہمیشہ عالیان سے جھگڑنے والا وہ اسے اپنے کمرے سے نکال دیتا تھا مگر عالیان ہمیشہ ضبط کرتا۔

عالیان جب آپ اپنے آغا جان اور بھائی سے ملو گے نا تو ہمیشہ اُن کا ادب و احترام کرنا چاہیے وہ پیار نہ کریں مگر اُن کے خلاف نہ جانا۔ ہمارے رشتے ہمارے لیے بہت انمول ہوتے ہیں جیسے بھی ہوں ہمارے اپنے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنا کہنے کا حق حاصل ہوتا ہے وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے اکثر سمجھاتی تھیں۔ بہت سی باتیں تھیں جو مما نے اُسے بچپن میں ہی سمجھا دی تھیں اور بچے کو بچپن میں جو سکھایا جاتا ہے وہ وہی

اپناتا ہے خود کو سنہری باتوں کی اونچی دیواروں میں مقید کردیتا ہے۔ اچھی پرورش ہمیشہ اچھا اثر چھوڑتی ہے۔ آفندی صاحب کی پہلی بیوی نے اپنی زندگی صرف پارٹیز سے گھر، گھر سے سوشل ورکنگ تک محدود کرر کھی تھی۔ انہیں تمام عیش و آسائش حاصل تھیں۔ انہیں کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ کیا ہورہا ہے کیوں ہورہا ہے؟ صائم ہمیشہ عالیان سے جلتا رہتا تھا۔ کیونکہ عالیان کو اچھے ادب واحترام کے باعث بہت پسند کیا جاتا تھا۔ حسد کی آگ دل میں لیے کب دونوں بڑے ہوگئے پتہ نہ چلا۔

عالیان کی زندگی میں ایک اپسرا آگئی۔ وہ اُس کی زندگی کا وہ موڑ تھا جو بہت حسین تھا لانبی پلکیں، لمبے سنہری بال' گلاب کی پنکھڑی کی مانند ہونٹ، لمبی مخروطی انگلیاں، ستواں ناک، براؤن آنکھیں ایک ٹھنڈی ہوا روح کو تازگی بخشنے والی، محبت زندگی کی وہ غلطی جس میں تمام صلاحیتیں ہماری تمام دانشوری ختم ہوجاتی ہے۔ ہم ایسے جہان میں کھوجاتے ہیں جہاں ناواقف چہرے اپنے سے لگتے ہیں۔ وہ اس کی محبت تھی اُس کی زندگی اس کا سب کچھ......''

وقت ایک سائبان کی طرح بن جائے گا اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ صحرا میں بھٹکے مسافر کو جب پانی کا دریا نظر آجائے بے سروساماں پھرنے والے کو حیات جینے کا سامان مل جائے گا۔ کائنات، یا روزے دار کو مغرب کی آواز سنائی دے جیسے ماں کو روتے ہوئے بچے کی سوتے وقت دل موہ لینے والی مسکراہٹ ملے ایسا ہی کچھ حال زندگی کے اس مسافر کا تھا۔

'خزینہ تم مجھے آپ کیوں کہتی ہو؟'' وہ شوخی سے بولا۔

''پتہ نہیں کیوں مگر میں یہ جانتی ہوں کہ آپ کو دیکھتے ہی دل کرتا ہے بے پناہ عزت کرنے کو...... لمحے کے ہزارویں حصے اُسے احساس ہوا کہ اُس نے سب پالیا ہے ماضی کی تمام چپقلش احساس محرومی سب بھول گیا۔

☆......☆......☆

ج وہ بہت خوش تھا وہ خزینہ سے رشتے کی بات کرنا چاہتا تھا۔ زندگی کی تمام خوشیوں کو اپنی جھولی میں سمیٹے خوبصورت جہاں کی سیر کرنا چاہتا تھا۔

وقت تھا، خوشی تھی وہ بہت پُر جوش تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ اس کے کمرے کی جانب بڑھا۔ ابھی دروازہ کھولنے کے لیے اس نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے آتی آوازوں نے اُس کے پیروں تلے زمین کو نکال دیا۔ دروازہ پورا کھولنے کے لیے اٹھایا گیا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔

''خزینہ میں تمہارے چال چلن دیکھ رہا ہوں۔ بخوبی سمجھتا ہوں سب تمہاری آنکھوں میں صاف نظر آتا ہے۔ میں کوئی پاگل نہیں ہوں کہ تم جیسے چاہو اپنی انگلی کے اشاروں پر نچالو۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں تم صرف میری محبت ہو صائم آفندی کی محبت۔ عالیان سے محبت کرنا صرف ہمارے کھیل کا حصہ ہے۔ بس میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے عشق میں اتنا پاگل ہوجائے کہ کسی کام کا نہ رہے۔ قیس کی طرح صحرا میں پھرتا رہے اور تب ہوگی ہماری شادی اور اُس کی بربادی...... ہاہاہا......'' وہ تلخ اور وحشی انداز میں بول رہا تھا کہ مانو کتنا بڑا مجرم ہو عالیان صائم کا۔

''بچپن میں پاپا نے اس کی مما سے دوسری شادی کرلی آغا کا پیار اُسے ملا۔ جسے دیکھو عالیان کا راگ الاپتا تھا۔ دل تو کرتا ہے اُسے قتل کردوں وہ نفسیاتی ہورہا تھا۔

''ہونہہ دیکھ رہا ہوں تمہارے پیچھے کتنا پاگل ہے اور اگر تم پاگل ہوئی نہ اُس کے لیے تو دیکھنا تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' ایک زوردار طمانچہ خزینہ کے گال پر پڑا۔ عالیان یکلخت دروازہ کھول کر

اندر داخل ہوا۔ ماحول میں گہری خاموشی چھا گئی۔
صائم طنزیہ مسکراہٹ لیے وہاں سے نکل گیا۔
''عالیان...... گال پر ہاتھ رکھے آنکھوں میں اشک لیے وہ اسے بے وفا سے کم نہ لگی۔
عالیان کے حواس معطل ہو چکے تھے۔ بلند فشار خون کے باعث اس کی آنکھیں سرخی مائل ہو چکی تھیں۔ زندگی نے اُس کے سر پر پہاڑ توڑ دیا تھا کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے وہ ایک لڑکی سے ہار گیا...... کیا محبت اُس کا نصیب نہ تھی اُس کے اعصاب بری طرح شل ہو گئے ارد گرد سائیں سائیں ہونے لگی۔
''عالیان Let Me Explain''۔ وہ منمنائی۔
اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بولنے سے روک دیا وہ اُسے دیکھتا رہا آنکھوں میں تحیر سا عالم تھا کہ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

☆......☆......☆

زندگی پھر ایسی ہوگئی کہ مانو کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ صائم صحیح کہتا تھا وہ کامیاب ہو گیا تھا اُسے پاگل جیسا بنانے کے لیے آنکھوں کا ایسا عالم تھا کہ اس شب اتنے آنسو بہے جیسے دریا میں طغیانی آ گئی ہو۔ سمندر کی طلاطم خیز موجیں...... تیز طوفان اس شب وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا رات لمحہ بہ لمحہ بیت رہی تھی۔ بالکل ایسے جاں بلب شخص کی روح دھیرے دھیرے بدن سے نکلتی ہے۔
اس اماوس کی رات کے بعد اُس نے رونا بند کر دیا روتا تو صرف اللہ کے سامنے۔ صائم نے اسے ہرا دیا تھا۔ زندگی نا جانے کیوں عزیز چیزوں سے ہی غم دیتی ہے اور عزیز چیزوں سے ملنے والی تکلیف کی اذیت حد درجہ ہوتی ہے۔
وہ دنیا سے انجان ابھی بھی اپنی پسندیدہ سیڑھیوں پر بیٹھا تھا یہ اُس کی مما کا گھر تھا جس کے آنگن میں اس نے بچپن میں ڈھیر ساری خوشیاں سمیٹی تھیں۔ آج بھی چاند آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ٹہنیوں کی اوٹ میں چھپتا تو شاخیں چاہے ساخت کو چھپا دیتی مگر روشنی برقرار رہتی تھی۔
زندگی بھی آنکھ مچولی کھیلتی تھی کبھی اپنی اپنی سی کبھی پرائی پرائی سی...... آغا جان کے فون سے اُس کی محویت توڑی۔
عالیان بیٹے آغا جان کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ جی آغا جان وہ انجان بنا۔
بیٹے خزینہ کو معاف کر دے وہ کہتی ہے کہ آغا جان میں نے عالیان کے ساتھ بہت برا کیا ہے اُس کی بد دعا لگی ہے مجھے کہ پہلی رات ہی پھولوں کی سیج کانٹوں سی بن گئی صائم نفسیاتی سا بن گیا ہے اس پر شک کرتا ہے بے پناہ پابندیاں لگاتا ہے ظلم کرتا ہے وہ چاہتی ہے کہ تم اسے اپنی بد دعا کے قفس سے نجات دے دو۔ معاف کر دو اُسے بیٹے آغا جان کی درخواست ہے وہ کہتی ہے کہ اس سے اس کا ضمیر ملامت کرنا چھوڑ دے گا وہ تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی بس معاف کر دے اسے وہ اشک بہاتے ہوئے غمگین لہجے میں بولے۔
''میں نے معاف کیا آغا جان اُسے معاف کیا...... فون بند ہو چکا تھا۔ چار سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا مگر وقت جب گزرنے پر آئے تو پتہ ہی نہیں چلتا...... اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جاتا ہے اور انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے لیکن خالی ہاتھ رہ جانا بہت بہتر ہے ان بھرے ہاتھوں سے جو دھوکا دے کر اپنی خوشیاں سمیٹتے ہیں۔ دراصل یہ دھوکے باز حقیقتاً تہی داماں ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

اک جنوں بے معنی...

مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ تم سے کیسے اظہار کروں بس میں اتنا جانتا ہوں کہ علوینہ میری زندگی کا ایک ایسا اہم جزو ہے کہ اگر اس لفظ کو نکال دیا جائے تو ارشان کی زندگی بے مقصد ہو جائے گی۔ ارشان کا دل خالی اور حیات ویران ہو جائے۔ وہ بھیگی آنکھوں سے......

رات کی تاریکی میں شہرِ خموشاں میں چہار سو ویرانی کا راج تھا۔ مگر وہ ان سب سے بے نیاز پچھلے چار گھنٹے سے تنہا بیٹھا دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں قبر پر ٹکائے خالی نگاہوں سے جانے کتنی دیر سے کتبے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ قبر میں موجود وجود کو شہرِ خموشاں کا مہمان بنے چار گھنٹے بیت چکے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گلاب کی بکھری ہوئی پتیوں کو اب اٹھانے لگا۔ آنکھوں سے بہتے آنسو تیزی سے گلاب کی پتیوں پر گر رہے تھے اور پھر اس نے وہیں قبر پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

''یہ جو سمندر ہے نا بڑا گہرا ہوتا ہے ماں کے وسیع دل کی طرح ہر راز کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ اس سے بہتر راز داں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' رومانہ علوی سمندر کی بپھری ہوئی لہروں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ماں کے دل جیسا ہی کیوں آخر......'' تانیہ رومانہ علوی حیرت سے اُسے دیکھنے لگی وہ تیز

رومانہ علوی کے خوبصورت چہرے پر ڈوبتے سورج کی مدھم پڑتی سنہری روشنی کو دیکھتے ہوئے سوال کرنے لگی۔ ماں کے دل نے بے وفائی نہیں سیکھی۔

''رازوں کو اگر ماں کے دل کے حوالے کر دو تو وہ اِن رازوں کو دل کے ایسے تہہ خانے میں دفن کر دیتی ہے کہ کوئی اس تہہ خانے کے مضبوط دروازوں کی چابی کو ڈھونڈ نہیں سکتا تانیہ علی......'' وہ اس کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''کب واپس آؤ گی۔'' وہ اس کے گلے لگتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ایک سال بعد واپسی ہو گی گرینی بہت یاد کر رہی ہیں مجھے ان کو میری ضرورت ہے رومی...... میں تمہیں بہت مس کروں گی تانی۔'' وہ دونوں اس وقت ایئر پورٹ پر کھڑی تھیں۔

''میری فلائٹ کا ٹائم ہو گیا چلتی ہوں۔'' جاتے ہوئے وہ پلٹی اور واپس آنے لگی

قدموں سے اُس کی جانب آئی اور بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی۔ تانیہ علی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتی محبت سے رومانہ علوی کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

''مجھے تمہارے ناول کا شدت سے انتظار ہے رومی۔'' اس کی بات پر وہ دھیمے سے مسکرادی۔

''امریکہ کی فضاؤں میں رومانہ علوی کو نہ بھول جانا۔''

''ایسا ہوسکتا ہے کیا تانیہ علی رومانہ علوی کو بھول جائے۔'' وہ اس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈالتی محبت سے اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولی۔ وہ بار بار اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

تانیہ علی کے دل کو اندیشوں نے گھیرا ہوا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جن سے محبت ہوتی ہے ان سے متعلق دلوں میں خطرے کے الارم پہلے سے بج جایا کرتے ہیں۔ رومانہ علوی میں تم سے ٹھیک ایک سال بعد ملوں گی یہ کہتے ہوئے وہ رخصت ہونے لگی کوئی نہیں جانتا تھا تانیہ نے یہ جملہ خود کو مطمئن کرنے کے لیے کہا تھا یا اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے۔

☆......☆......☆

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔'' آنکھوں میں شرارت لیے اس کو بیٹھا دیکھ کر بولی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس کو دیکھے بغیر وہ بولا نگاہیں ہنوز سمندر پر جمی ہوئی تھیں۔

''تم کیا روز یہاں آتے ہو۔'' وہ اپنے برابر بیٹھے وجود کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں......'' مختصر سے جواب پر وہ جز بز سی ہوکر ایک نیا سوال سوچنے لگی۔

''اچھا میں یہاں روز آتی ہوں پہلے اپنی دوست تانی کے ساتھ آتی تھی اب وہ امریکہ چلی گئی ہے تو اکیلی ہی آتی ہوں۔ ان سمندر کی لہروں میں بڑا جادو ہوتا ہے یہ انسان کو اپنی جادوئی گرفت میں لے لیتی ہیں۔''

وہ جذب سے بولتے ہوئے اس کو دیکھنے لگی۔ مگر برابر بیٹھا وجود خاموشی سے کچھ لکھتا مٹی پر اور مٹا دیتا اس کی انگلی تیزی سے حرکت کررہی تھی۔

وہ کوشش کے باوجود پڑھنے سے قاصر تھی کہ آخر وہ لکھ کیا رہا ہے جتنی رفتار سے وہ مٹی پر لکھتا اتنی ہی رفتار سے مٹا دیتا۔

''کیا تمہیں میرا یہاں بیٹھنا پسند نہیں۔'' وہ ایک بار پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں......'' اس کے جواب پر وہ بے بسی سے اُسے دیکھ کے رہ گئی۔

☆......☆......☆

بہت سے لوگوں کی رائے لکھاری قبیلے کے بارے میں بڑی عجیب ہوتی ہے تانی۔ اِن کو لگتا ہے کہ ہم لکھاری لوگ بڑے خود غرض ہوتے ہیں اپنی کہانی بنانے کے لیے بڑے آرام سے لوگوں کے دلوں میں چھپے زخموں کو تازہ کردیتے ہیں۔

وہ دونوں اس وقت اسکائپ پر بات کررہی تھیں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے ہم لکھاری ہی تو ہوتے ہیں جو دلوں میں چھپے غموں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

تو کبھی آنکھوں میں بسے خوابوں کو سچ ہونے کا یقین دلا کر ان کے دلوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ ہمارے ہی قلم کے بدولت ان کے لبوں پر مسکان بکھر جاتی ہے۔ تانیہ علی بہت توجہ سے اس کی باتوں کو سن رہی تھی۔

رومانہ علوی لوگوں کی باتوں کی پرواہ کب

سے کرنے لگی۔ جب سے محبت کرنے لگی۔ تانی کے سوال پر وہ بے ساختہ بول اٹھی۔ شکر ہے آپ کو بھی کسی سے محبت ہوئی۔'' تانیہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔

''کون ہے کیا نام ہے؟ کیا کرتا ہے؟''

''نام احمد ہے باقی میں نہیں جانتی کون ہے کیا کرتا ہے پر بس اتنا جانتی ہوں تانی اس کو دیکھتی ہوں تو سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ اس کی آنکھیں کسی ساحر کی جیسی ہے جو اپنے طلسم میں جکڑ کر بے بس کر دے۔

محبت تو میں کرتی ہوں تانی وہ تو مجھ سے غافل رہتا ہے۔ وہ یک ٹک سمندر کو دیکھتا ہے اور میں یک ٹک اس کو دیکھتی ہوں۔ میرے اس جنون نے میرے ابھی بڑے بڑے امتحان لینے ہیں۔ وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنس کے بولی۔ تانیہ علی بہت خاموشی سے اس کو دیکھ کے رہ گئی۔

وہ کافی دیر سے ہاتھ میں قلم لیے سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اپنے برابر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا وہ دیکھے بغیر بتا سکتی تھی کہ اس کے برابر بیٹھنے والا کون ہے۔

''کیا سوچ رہی ہیں آپ......'' اُس کے مخاطب کرنے پر اس کو لگا کہ اس کو سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اس کے دوبارہ سوال کرنے پر وہ بول اٹھی۔

''میں ناول کا نام سوچ رہی تھی۔'' بولتے ہوئے رومانہ علوی کی نگاہیں اس کے چہرے پر اٹھی تو اس کو لگا کہ اگر تھوڑی دیر بھی اس نے اس کے چہرے کو دیکھا تو وہ یہاں سے دل ہار کر ہی اٹھے گی۔

''ناول کا نام ایک جنوں بے معنی ایک یقین لاحاصل لکھیں۔'' اب کی بار وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

میرے خوابوں میں وہ تیر چلا کر گئی ہے
میں سویا تھا مجھ کو جگا کر چلی گئی
میں نے پوچھا چاند نکلتا ہے کیسے
چہرے سے اپنی زلف ہٹا کر چلی گئی

وہ شرارت سے اُسے دیکھتا شعر پڑھنے لگا۔

''ارشمان کے بچے اٹھ جاؤ سورج نکل آیا ہے۔'' وہ اس کے بستر پر لیٹے لیٹے شعر کہنے پر دانت کچکچا کر بولی۔

''سر کاشف کو سنانا اپنی شاعری خدارا اٹھ جاؤ۔''

ریشم زلفوں، نیلم آنکھوں والے اچھے لگتے ہیں
میں شاعر ہوں مجھ کو اُجلے چہرے اچھے لگتے ہیں

وہ بیڈ سے اُتر کر اس کے قریب آ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے جذب سے شعر پڑھنے لگا۔

''خدا کے واسطے ارشمان یونیورسٹی کے لیے ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔''

وہ دونوں ہاتھ جوڑتی غصے سے اُسے گھورتے ہوئے بولی۔ وہ ہنستا ہوا واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

وہ مسلسل ارشمان کو گھورے جا رہی تھی جو کلاس روم میں اس کے برابر بیٹھا مہوش سے ہنس ہنس کر باتیں کیے جا رہا تھا۔ بات کرتے کرتے ارشمان کی نگاہ علوینہ پر پڑی جو مستقل پچھلے بیس منٹ سے اُسے گھور رہی تھی۔

''کیا ہوا بہت پیارا لگ رہا ہوں۔'' وہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے آنکھوں میں شرارت لیے اس سے پوچھنے لگا۔

''ہاں بہت خوبصورت لگ رہے ہو گھر چلو بتاتی ہوں۔'' وہ چبا چبا کر بولی۔

"علوینہ علوینہ سنو۔" وہ کوئی تیسری بار اس کو کیفے میں مخاطب کر چکا تھا مگر مدِ مقابل بھی علوینہ تھی جس نے اس کی نہ سننے کی ٹھانی ہوئی تھی۔

"تمہیں ان سموسوں کے آگے کیا میں دکھائی نہیں دے رہا۔" وہ اس کو مگن انداز میں سموسہ کھاتا دیکھ کر جل کے بولا۔

"مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔" وہ خفگی سے اس کو دیکھے بغیر بولی۔

"یار وہ مجھ سے کل کی کلاس کا پوچھ رہی تھی جو اس نے سر فیصل کی مس کر دی تھی۔"

"اچھا تو تم ہنس ہنس کر اس کو کل کی کلاس میں سر فیصل کے پڑھائے جانے والے ٹاپک سمجھا رہے تھے۔ ایسے کون سے لطیفے سنائے تھے سر فیصل نے جو میں سن نہیں پائی۔"

وہ غصے سے بولنے لگی۔

"ارے یار ہماری کلاس فیلو ہے وہ اگر میں نے ہنس کے بات کر لی تو ایسی کیا بات ہو گئی۔"

"لڑکیوں سے تو وہ ہنس کے ایسے بات نہیں کرتی، تمہارے ساتھ تو دانت ہی اس کے اندر نہیں ہو رہے تھے۔"

اس کے جل کے بولنے پر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا جانتا تھا علوینہ سے بحث کرنا بیکار ہے۔

☆......☆......☆

"کیسی ہو......" محب کی آواز پر وہ چونک کر اُس کو دیکھنے لگی۔

"ٹھیک ہوں تم کیسے ہو۔" وہ لان میں واک کرتے ہوئے اپنے قریب آتے محب کو دیکھ کر رُک کر بولی۔ اور وہیں سنگی بینچ پر ٹک گئی وہ بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"تائی کیسی ہیں؟" وہ اُس کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ٹھیک ہیں۔ رومانہ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ تمہید باندھتا ہوا بولا۔

"تم نے چاچی کو انکار کیوں کر دیا۔" اس کے سوال پر وہ کھلی فضا میں گہری سانس بھر کر رہ گئی وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے یہ سوال کرنے آئے گا۔

"میں تم سے شادی نہیں کر سکتی محب کیونکہ تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔" وہ صاف گوئی سے اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ایسے شخص سے کیسے شادی کر لوں جس کے منہ سے کاروباری باتوں کے سوا کوئی بات نکلتی ہی نہیں۔ جو یہ نہیں جانتا کہ دنوں کو کس طرح یادگار بنایا جاتا ہے۔ برستی بارش کو کیسے انجوائے کیا جاتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ جو اِن سب باتوں کو بکواس کہتا ہو وہ کیسے اس سب بکواس کے ساتھ زندگی گزارے گا۔"

وہ اس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے بولی۔

محب عثمان کے پاس اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کر چل دیا۔

"میں جانتی ہوں محب عثمان کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو مجھے دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں جو محبت کے دیپ جلتے ہیں میں ان سب سے بے نیاز نہیں ہوں پر میں کیا کروں میں اپنے دل کے ہاتھوں بڑی شدت سے مجبور ہوں۔ محب عثمان کاروبار میں خسارہ ہو تو پھر بھر دیا جاتا ہے مگر محبت میں اگر تمہیں خسارہ ہوا تو وہ تم ساری عمر نہیں بھر سکتے۔

میں تمہارے لیے اللہ سے دعا گو ہوں کہ تم کو ایسا شخص ملے جو تم سے بھی محبت کرے۔" وہ بینچ

سے سر کی پشت ٹکائے آنکھیں بند کیے محب عثمان کے لیے دل سے دعا کرنے لگی۔

☆......☆......☆

اُس کو وہاں بیٹھا دیکھ کر آج اِس کے پاس نہیں گئی بلکہ نظرانداز کر کے ساحل سمندر کے کنارے پر چہل قدمی کرنے لگی۔ اپنی سوچوں میں اس قدر محو تھی کہ اس کو پتا بھی نہیں چل سکا کہ کب وہ اس کے برابر آ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس کے مسکرا کر پوچھنے پر وہ ابھی حیرت سے سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ بے اختیار اس کے قدم ڈگمگائے جس سے وہ خود کو سنبھال نہیں پائی اور پانی میں گرنے لگی۔ احمد بدحواس ہو کر چیختا ہوا اُس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑنے لگا۔ وہ اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں بدحواس سی ہوئی احمد کے خوفزدہ چہرے کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ جھجک کر اس کے ہاتھوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرنے لگی۔ وہ اب تک اسی کیفیت میں چپ چاپ کھڑا خوفزدہ سا اس کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا کہ رومانہ نے گھبرا کر اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

اس کے ہلانے پر وہ چونک کر اس کو دیکھنے لگا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لے کر تھاما اور تیزی سے واپسی کی طرف مڑ گیا رومانہ علوی حیرتوں میں غوطہ زن اس کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ کو دیکھتی اس کے ساتھ چلنے لگی۔

☆......☆......☆

علوینہ یہ کیا حرکت ہے۔'' مینا غصے سے علوینہ کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ علوینہ مزے سے بیڈ پر بیٹھی ہوئی چپس کھا رہی تھی۔

''میں نے کیا کیا مینا آپی میں تو چپس کھا رہی ہوں۔'' علوینہ بھولپن سے مینا کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم نے دیکھا نہیں اپنا انداز و رویہ جو تمہارا ابھی عائشہ کے ساتھ تھا۔''

''ہاں تو اس میں میری کیا غلطی ہے وہ کیوں اتنا ارشمان سے فری ہو رہی تھی۔'' وہ لاپروائی سے کندھے اُچکا کر مینا کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''علوینہ دیکھو میری بات سنو۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے محبت سے بولتی ہوئی وہیں اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

''دیکھو میری جان تمہارا رویہ ٹھیک نہیں ہوتا عائشہ تم دونوں کی خالہ زاد ہے اور کزنز میں یہ ہنسی مذاق چلتا ہے۔ میں ارشمان کی بڑی بہن کی حیثیت سے تم کو نہیں سمجھا رہی بلکہ تمہاری بڑی بہن کی حیثیت سے سمجھا رہی ہوں۔ میں نے کبھی تم کو اپنی بھابی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے۔''

''آپی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی ارشمان کے قریب بھی آئے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''دیکھو علوینہ محبوب کو اپنی محبت کی اتنی مضبوط گرفت میں قید نہ کرو کہ محبوب اس گرفت کو توڑ دے محبت کرو یا عشق کرو اس کا ایک ہی اصول ہے کہ گرفت کو تنگ نہ کرو بلکہ اتنی لچک ہو اتنی نرمی ہو کہ محبوب چاہ کر بھی اس گرفت سے خود کو آزاد نہ کر سکے۔''

وہ مینا کی بات پر سر ہلا کر رہ گئی۔

علوینہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ علوینہ

کا خالہ زاد ارشمان اور مینا دونوں بہن بھائی تھے۔ مینا ارشمان سے کافی بڑی تھیں اور اُن کی شادی کو بھی پندرہ سال ہو گئے تھے۔ علوینہ کا انٹر میں ہی اپنے خالہ زاد ارشمان سے نکاح ہو گیا تھا۔ رخصتی دونوں کی پڑھائی کے بعد طے پائی تھی۔ مینا علوینہ کے جنون سے خوفزدہ رہتی تھی۔ وہ ارشمان کے معاملے میں اس قدر جنونی تھی کہ اس کو کسی کزن سے ہنس کر بات کرتا بھی دیکھتی تو خفا ہو جاتی تھی۔ ارشمان علوینہ کی اس عادت سے بعض اوقات چڑ سا جاتا تھا۔

''ارشمان یعنی آسمانوں کا شہزادہ اور تم خود کو سچ مچ کا شہزادہ سمجھتے ہو کیا جو اتنا اتراتے ہو۔'' وہ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی گول گپے کھاتے ہوئے اس کو چھیڑ رہی تھی۔

وہ اس کے چھیڑنے پر مسکراہٹ دبائے گول گپوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اپنی پلیٹ کا صفایا کر کے اس کی نگاہیں اب ارشمان کی پلیٹ پر تھی۔

''ندیدی نیتی علوینہ خبردار، میری پلیٹ کو ہاتھ لگایا۔'' علوینہ کا ارادہ بھانپ کر اس سے اپنی پلیٹ بچاتا وہ اسے گھورنے لگا۔

''کیسے ہو ارشمان کیا بیوی کو اتنے سے گول گپے نہیں کھلا سکتے۔''

وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''دو پلیٹیں کھانے کے بعد بھی اتنے سے گول گپے ہو رہے ہیں۔''

وہ ناراضگی سے بچوں کی طرح منہ پھیر کے بیٹھ گئی۔ اس کے پھولے ہوئے منہ کو وہ ہنسی دبائے دیکھ رہا تھا۔

''اچھا اِدھر دیکھو۔'' زبردستی ہاتھ سے اس کا منہ پکڑ کر اپنی طرف کرنے لگا۔ اور شرارت سے گول گپا زبردستی اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

وہ بھرے منہ سے اس کو گھور کر رہ گئی۔

وہ اس کا منہ دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''میرے نوالوں میں بھی تم حصہ دار ہو۔'' وہ محبت سے اس کو دیکھتا ہوا بولا۔ وہ اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

اُس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی وہ وہیں رُک کر اُس کو اپنی طرف آتا دیکھنے لگی۔ رومانہ علوی کی آنکھوں میں احمد کو دیکھتے ہوئے جو جذبات ہلکورے لے رہے تھے۔

اُن آنکھوں کو کوئی بھی دیکھ کے بتا سکتا تھا کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔ وہ اس کے برابر آ کر اُس کے ساتھ واک کرنے لگا۔

''آپ کو بھی میری طرح ساحلِ سمندر کے کنارے پر چہل قدمی کرنا اچھا لگتا ہے۔'' وہ اس کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''نہیں مجھے سمندر نہیں پسند......'' اس کے جواب پر وہ حیرانگی سے اُسے دیکھنے لگی۔

''اگر سمندر نہیں پسند تو روز یہاں آتے کیوں ہیں آپ؟''

''میں تو اپنا انتقام لیتا ہوں اس سمندر سے روز اس کی مٹی کو نفرت سے اپنے قدموں تلے روندتا ہوں۔ روز بے بسی کے پتھر اس سمندر میں اچھالتا ہوں۔'' وہ سمندر پر نگاہیں جمائے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' اس کی بات پر وہ اُلجھتے ہوئے اُس کو دیکھنے لگی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''کل تمہاری سالگرہ ہے نا۔''
''جی آپ آئیں گے؟'' وہ مسکرا کر اُس سے پوچھنے لگی۔
''نہیں......'' اس کے مختصر سے جواب پر اِس کی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر دم توڑ گئی۔

☆......☆......☆

وہ اپنے کمرے میں اُداس سی بیٹھی تھی۔ صبح سے سب کی کالز آ رہی تھیں اس کو وِش کرنے کے لیے۔ اس کے فین کی بڑی تعداد تھی۔ تانیہ سے بھی صبح بات ہو گئی تھی۔ مگر دل پر ایک اُداسی تھی۔ عجیب سا بوجھ تھا۔ آنکھیں شدت سے کسی کی منتظر تھیں۔ وہ جانتی تھی اس کا انتظار بے کار ہے پر وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو آس لگائے بیٹھا تھا۔ اس کو کچھ دن پہلے پڑھی ہوئی محسن نقوی کی ایک نظم یاد آ گئی۔

پاگل آنکھوں والی لڑکی
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو
تھک جاؤ گی
کانچ سے نازک خواب تمہارے
ٹوٹ گئے تو پچھتاؤ گی
تم کیا جانو......
خواب سفر کی دھوپ کے تیشے
خواب ادھوری رات کا دوزخ
خواب خیالوں کا پچھتاوا
خوابوں کا حاصل تنہائی
مہنگے خواب خریدنا ہوں تو
آنکھیں بیچنا پڑتی ہیں
رشتے بھولنا پڑتے ہیں
اندیشوں کی ریت نہ پھانکو
خوابوں کی اوٹ سراب نہ دیکھو
پیاس نہ دیکھو
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو
تھک جاؤ گی

وہ تھک کر اپنا سر ٹیبل پر ٹکا گئی۔
''کیا بات ہے آج سالگرہ اپنے کمرے میں رہ کر منانے کا ارادہ ہے۔''
ساجدہ بیگم کی آواز پر وہ سر اُٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔ جو اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑی اُسے دیکھ رہی تھیں۔
''نہیں ماں بس سر میں درد ہو رہا ہے۔'' وہ ماں کو دیکھ کے زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔
وہ اپنی بیٹی کو دیکھ کے رہ گئیں۔ اپنی سالگرہ کو جتنا وہ انجوائے کرتی تھی آج اس کے چہرے پر وہ خوشی نہیں تھی۔
''چھوٹی بی بی......'' چوکیدار کی آواز پر دونوں ماں بیٹی اُسے دیکھنے لگی۔
''وہ کوئی احمد صاحب آئے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔'' چوکیدار کی بات پر وہ بے ساختہ کرسی سے اٹھی۔
''کہاں ہیں وہ......'' خوشی سے کانپتی آواز میں وہ چوکیدار سے بولی۔
''لان میں ہیں۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھی۔
''جس شخص نے میری بیٹی کا سر درد ٹھیک کر دیا ہے۔ میں دعا کروں گی وہ طبیب میری بیٹی کی زندگی میں شامل ہو جائے۔'' ماں کی آواز پر وہ رُک کر ماں کو دیکھنے لگی اور مسکرا کر 'آمین' کہہ کر آگے بڑھ گئی۔
وہ تیز قدموں سے لان کی جانب بڑھ رہی تھی اس کو لان میں کرسی پر بیٹھا دیکھ کر رومانہ علوی کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ اس کو آتا دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

کالی شرٹ پر براؤن مفلر ڈالے ہلکی ہلکی شیو میں رومانہ علوی کے دل کی دھڑکن کو بے ترتیب سا کر گیا تھا۔

''جنم دن مبارک ہو۔'' تحفہ اُس کو دیتے ہوئے مسکرا کر اس کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

''اِس کی کیا ضرورت تھی آپ آ گئے یہی بہت تھا۔''

''ضرورت تو تھی اگر میں تحفے کے بغیر آتا تو آپ کنجوس کا خطاب دے دیتیں۔'' وہ شرارت سے بولا۔

وہ اُس کو دیکھنے لگی۔ پہلی بار اس نے اس کو اتنا کھل کر مسکرا کر بولتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دن رومانہ علوی کی زندگی کا یادگار ترین دن تھا۔

ساجدہ بیگم بیٹی کے احساسات سے غافل نہ تھیں وہ بہت بار رومانہ کے منہ سے احمد کا تذکرہ سن چکی تھیں اور آج اُس سے مل بھی چکی تھیں۔ رومانہ کی زندگی میں احمد سے پہلے کوئی مرد نہ آیا تھا اور وہ جانتی تھیں کہ اب احمد کے آنے کے بعد اُس کی زندگی میں کسی اور مرد کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔

☆......☆......☆

''مبارک ہو شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی۔ اگلے ماہ کی اکتیس دسمبر......'' وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتا ہوا خوشی سے لبریز لہجے میں بولا۔

''اچھا مبارک ہو۔'' وہ جو کافی دیر سے کمرے میں بیٹھی تھی اُس کو شرما کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''یا اللہ علوینہ تم شرما رہی ہو۔'' وہ آنکھوں میں حیرتوں کا سمندر لیے اُسے دیکھنے لگا۔ آج صبح سے خالہ اور اُن کی فیملی آئی ہوئی تھی شادی کی تاریخ رکھنے۔ آج پہلی بار اس کو ارشان سے جھجک آ رہی تھی۔

''کیا مسئلہ ہے۔'' وہ جھینپ کر اس کو دیکھنے لگی۔ وہ مزے سے بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''کیا خیال ہے علوینہ شادی سے پہلے ایک ڈیٹ ماریں۔'' وہ آنکھ مار کر اُس کو دیکھتا ہوا بولا۔

''کہاں......'' وہ پُرجوش ہو کر پوچھنے لگی۔

''شرم کرو لڑکی فوراً ہی تیار ہو گئیں۔'' وہ اُس کو شرم دلاتے ہوئے بولا۔

''تو کیا ہوا اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہوں ڈیٹ پر کسی غیر کے ساتھ تھوڑی تم تو ایسے شرم دلا رہے ہو جیسے نوردین کے ساتھ میں ڈیٹ پر جا رہی ہوں۔''

وہ گھر کے نوکر کا نام لیتے ہوئے اپنی پرانی جون میں بولی۔

''اوکے ڈن ہے پارٹنر......'' وہ اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولا۔

☆......☆......☆

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے تانیہ سے احمد کی باتیں کیے جا رہی تھی۔ تانیہ محبت سے اپنی دوست کے خوشی سے چمکتے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ محبت بھی بڑی عجیب ہوتی ہے تانی...... آپ کی ہر بات میں آپ کا محبوب خود بخود آ جاتا ہے۔ آپ کی کوئی بات بھی اس کے ذکر سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر باتوں میں آپ کے محبوب کا ذکر نہ ہو تو باتیں بھی بے مزہ لگتی ہیں۔''

محبوب کا ذکر باتوں میں رنگ بھر دیتا ہے۔

وہ رومانہ کی بات پر بے ساختہ مسکرا دی۔

''میں دعا کروں گی اللہ سے کہ وہ شخص باتوں کے ساتھ ساتھ تمہاری زندگی میں بھی شامل

ہو جائے اور تمہاری زندگی کو خوشیوں کے رنگ سے بھر دے۔'' وہ صدقِ دل سے اس کے لیے دعا کرتے ہوئے بولی۔

وہ اپنی دوست کی محبت پر مسکرا دی۔

''تم پاکستان کب آ رہی ہو۔ انشاء اللہ بہت جلد رومانہ علوی کے احمد سے ملنے آ رہی ہوں۔'' وہ شریر لہجے میں بولی۔ اس کی شرارت پر وہ ہنس دی۔

☆......☆......☆

وہ جھولوں میں بیٹھی وقفے وقفے سے اس کی سماعتوں میں اپنی چیخیں انڈیل رہی تھی۔ وہ ہر چیخ پر اس کو گھور کر دیکھتا جس پر وہ اور مزے سے اُس کے کان کے قریب جا کر چیختی۔

''علوینہ مجھے لگتا ہے تم مجھے رخصتی سے پہلے سماعت سے عاری کر دو گی۔'' وہ دانت کچکچا کر بولا۔

''اچھا ہے نہ بہرے ہو جاؤ گے۔'' وہ مزے لیتے ہوئے بولی۔

''جھولا تیز ہونے پر وہ خوف اور خوشی کی کیفیت میں بے ساختہ چیخی کہ اچانک ارشمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''علوینہ تم میرا عشق ہو تم سے محبت میں کب سے کر رہا ہوں یہ تک مجھے یاد نہیں پر ہوش سنبھالتے ہی جس لڑکی کو چاہا وہ تم تھی میرے دل کے کورے کاغذ پر جس کا پہلی بار نام لکھا وہ تم تھی۔ میں اپنے حوالے سے تمہاری جنونی محبت سے بہت پہلے سے آگاہ تھا۔ میں تمہارے جنون سے بعض اوقات چڑ جاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ تم کو مجھ پر یا میری محبت پر یقین نہیں۔ تم میری وجہ سے جب کسی سے لڑتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ تم بے اعتبار ہو رہی ہو۔ میں نے بہت انتظار کیا ہے۔ علوینہ اس دن کا جس دن تم میرے سنگ رخصت ہو گی۔ میں جانتا تھا کہ تم مجھ سے خائف رہتی ہو کہ میں تم سے اظہارِ محبت نہیں کرتا۔''

مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ تم سے کیسے اظہار کروں بس میں اتنا جانتا ہوں کہ علوینہ میری زندگی کا ایک ایسا اہم جزو ہے کہ اگر اس لفظ کو نکال دیا جائے تو ارشمان کی زندگی بے مقصد ہو جائے گی۔

ارشمان کا دل خالی اور حیات ویران ہو جائے۔ وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی اور اُس کے کاندھے پر سر ٹکا کر بولی۔

''بڑا انوکھا انداز ہے اظہارِ محبت کا جھولے میں بیٹھ کے ہو رہا ہے۔'' اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اور اونچی فضا میں جھولتے جھولے پر ارشمان کی آواز کی گونج۔

''میں تم سے عشق کرتا ہوں علوینہ......'' کی گونج دور تک سنی گئی۔

☆......☆......☆

وہ جوش و خروش سے شادی کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ آج ارشمان اُس کو شاپنگ پر اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

''ارشمان ایک بات بتاؤ۔'' وہ کپڑے دیکھتے ہوئے کچھ یاد آنے پر اُس سے پوچھنے لگی۔

''ہاں بولو......''

''یہ اکتیس دسمبر شادی کی تاریخ تم نے رکھی ہے کیا۔''

''ہاں میں چاہتا ہوں نئے سال کا آغاز میں تمہارے ساتھ کروں نئے سال کی نئی صبح کو میری زندگی میرے ساتھ ہو۔'' وہ محبت سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ اُس کی بات پر وہ شرما

کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

آج بھی اُس کی نگاہیں فقط اُسی کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ اُس کو پچھلے ایک ہفتے سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کو سمندر کی لہریں بھی اپنے دل کی طرح اُداس لگ رہی تھی۔ واپسی میں اُس نے احمد کے گھر جانے کا سوچا۔ وہ اس کے گھر کبھی گئی نہیں تھی مگر آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے گھر چلی گئی۔

چوکیدار سے احمد کی گھر میں موجودگی کا پوچھ کر وہ اندر داخل ہوگئی۔ ستائشی نگاہوں سے خوبصورت سے لان کو دیکھتی وہ اندر کی جانب بڑھی۔ پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کچن سے نکلتے نوکر کو آواز دے کر اس نے بلایا۔

''سنو اِدھر آؤ۔''

''جی بولیے۔'' وہ مودب بنا پوچھنے لگا۔

''کیا کوئی گھر پر نہیں ہے۔''

''نہیں احمد صاحب کے ممی ڈیڈی امریکہ میں ہوتے ہیں۔ خالی احمد صاحب ہی رہتے ہیں یہاں۔'' اس کی بات پر رومانہ سر ہلانے لگی۔

''اچھا احمد صاحب کدھر ہیں۔''

''بی بی جی وہ اپنے کمرے میں ہیں آپ اوپر چلی جائیں پہلا کمرہ اُن ہی کا ہے۔''

اس کے کہنے پر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے روم کی جانب بڑھ گئی۔ کچھ جھجکتے ہوئے اُس کا روم ناک کیا۔

''آ جاؤ اندر......'' وہ روم میں داخل ہوگئی۔ سامنے ہی کرسی پر وہ بیٹھا دکھائی دیا۔

''کیا بات ہے جمال میں نے بولا تھا مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔'' وہ آنکھیں بند کیے بولا۔

''میں رومانہ ہوں۔'' اُس کی آواز پر اُس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''اوہ آپ بیٹھیے پلیز۔'' وہ بیڈ کی جانب اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''آپ ایک ہفتے سے نہیں آ رہے تھے میں نے سوچا آج پوچھ لوں کہیں آپ کی طبیعت خراب نہ ہو۔'' وہ اپنے آنے کی وجہ بتاتے ہوئے بیڈ پر ٹک گئی۔

''آپ کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

آنکھوں کے گرد حلقے سرخ ہوتی آنکھیں بڑھی ہوئی شیو اور بے ترتیب بال اُس کو پریشان کر گئے تھے۔

''نہیں بس ایسے ہی۔'' وہ زبردستی مسکرا کر رہ گیا۔

''آپ کا کمرا بہت خوبصورت ہے۔'' وہ تعریفی انداز میں اُس کا کمرا دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔ وہ رومانہ کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھنے لگا۔ جو دیوار پر لگی تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ کون ہے؟'' اس کے سوال پر وہ تصویر کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہی ہے علوینہ......''

☆......☆......☆

مہندی کی رات تھی گھر میں ایک گہما گہمی تھی ڈھولک کی تھاپ پر لڑکے لڑکیوں کے شوخ گانے' لڑکیاں پیلی قمیض پر ہرے دوپٹے لیے تتلیاں بنی اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھیں۔ جبکہ لڑکے سفید قمیض شلوار پر پیلی ہری واسکٹ پہنے ہوئے تھے۔

علوینہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں شرمائی شرمائی سی پیلی فراک میں ہرا آنچل سر پر لیے

ہاتھوں میں گجرے لیے خوبصورت سی گڑیا لگ رہی تھی۔

ارشمان کے میسج مسلسل اس کے سیل پر آ رہے تھے۔ وہ اس کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ خود علوینہ ارشمان کو دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔ جیسے ہی سب اِدھر اُدھر ہوئے اُس نے جلدی سے ارشمان کو کال ملائی۔

''آداب عرض ہے جانِ من......'' ارشمان کی شوخ آواز پر وہ اپنی ہنسی روکنے لگی۔

''کیا ہوا کیا سو گئی۔'' دوسری طرف سے خاموشی پا کر وہ بولا۔

''ارشمان مجھے ساحلِ سمندر پر لے کر چلو۔''

علوینہ کی فرمائش پر وہ بوکھلا گیا۔

''اس وقت پاگل ہوئی ہو رات کے بارہ بج رہے ہیں۔''

''میں نہیں جانتی آج رات کو مجھے یادگار بنانا ہے۔'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔

''علوینہ اس وقت ٹھیک نہیں ہے میں تمہیں بعد میں روز لے کر جاؤں گا، پر ابھی یار تم ٹائم دیکھو۔'' وہ اُس کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''تمہیں میری قسم ارشمان......''

''قسم دے کر علوینہ تم نے مجھے بے بس کر دیا۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''اوکے آتا ہوں دس منٹ میں۔''

''اوکے میں پیچھے کے دروازے سے آؤں گی۔'' وہ پُر جوش لہجے میں بولتی فون بند کر گئی۔

''ہرگز نہیں جانے دوں گی میں تمہیں اس وقت، تمہارا کیا دماغ خراب ہو گیا۔'' مینا غصے سے گھورتے ہوئے بولیں۔

''پلیز آپی ایک گھنٹے میں آ جاؤں گی ارشمان، میرا پاہر ویٹ کر رہا ہے۔'' وہ مینا کا بازو پکڑ کے منت بھرے لہجے میں بولنے لگی۔

''علوینہ تمہاری منطق مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔ جاؤ پر ایک گھنٹے سے زیادہ مت لگانا کسی کو پتا چل گیا تو بات غلط ہو جائے گی۔''

وہ مینا کے گال پر پیار کرتے ہوئے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

''سنو علوینہ......''

''جی آپی......'' وہ مڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

''نظر کی دعا پڑھ لو بہت خوبصورت لگ رہی ہو ارشمان کی نظر نہ لگ جائے۔'' وہ شریر لہجے میں بولیں۔

''آپ کا بھائی بھی آج شہزادہ لگ رہا ہوگا۔ اگر اس کو میری نظر لگ گئی تو......'' وہ شرارت سے اُن کو دیکھ کر سوال کرنے لگی۔

''تو تم اپنی خوبصورت آنکھوں کے کاجل کا ٹیکہ اُس کے لگا دینا۔'' اُن کی بات پر وہ ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ اُس کا ہاتھ پکڑے ساحل سمندر پر چہل قدمی کر رہا تھا۔

''کیسا لگ رہا ہے نہ ارشمان کتنا خوبصورت لگ رہا ہے سب کچھ۔'' وہ تیز ہوا سے اپنے کھلے بالوں کو دوپٹے سے سنبھالتی ہوئی بولی۔

''ہاں بہت خوبصورت لگ رہا ہے سب کچھ۔'' وہ اس کے گجرے والے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ اس کی اس حرکت پر وہ لجا کر رہ گئی۔

''چلو آگے چلتے ہیں۔''

''آگے کہاں بس اب گھر چلو ہمیں ایک گھنٹہ ہو گیا۔''

''چلو نہ......'' وہ ضد کرنے لگی۔

''نہیں بس علوینہ بہت دیر ہو گئی۔''

''میں جارہی ہوں۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

''علوینہ رکو......'' اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر علوینہ کو شرارت سوجھی وہ تیزی سے آگے کی جانب لہروں میں بھاگنے لگی۔

''علوینہ بس بہت ہوگیا مذاق۔'' وہ اس کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑا۔

علوینہ نے بھاگنے کی رفتار تیز کردی اس کی ہنسی کی گونج چاروں طرف گونج رہی تھی کہ اچانک علوینہ کے قدم لڑکھڑائے اور وہ منہ کے بل پانی میں گری سمندر کی تیز لہریں اُس کو تیزی سے اپنے ساتھ بہا کر لے جانے لگی۔

ارشمان احمد بدحواس سا اُس کی جانب دوڑا۔ مگر تب تک لہریں اُس کو اپنے ساتھ بہت دور لے گئی تھی۔

☆......☆......☆

اکتیس دسمبر کا سورج طلوع ہوچکا تھا۔ وہ گھر جہاں کل رات تک خوشیاں چھک رہی تھیں اب وہاں صرف سسکیوں کی گونج تھی۔ وہ بے یقینی سے اُس کے سرہانے بیٹھا اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

وہ بار بار اُس کے مہندی لگے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتا اُس کی بند آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا اِس کو لگ رہا تھا ابھی وہ آنکھیں کھول دے گی اور ارشمان کو دیکھ کر زور سے ہنس دے گی۔ وہ اس کے ساکت لبوں کو بڑی حیرت سے دیکھتا ارشمان احمد نے ان لبوں کو اتنا ساکت کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تو ان لبوں کو ہمیشہ مسکراتے دیکھا تھا۔

ارشمان احمد کی خواہش پر وہ اس کے گھر میں اس کے بیڈروم میں تھی مگر آج فرق تھا۔ وہ بے جان وجود کے ساتھ اس کے بیڈ پر لیٹی اس کے گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے والی تھی۔ رات تین بجے ارشمان کی مینا کو کال نے پورے گھر میں ایک کہرام برپا کردیا تھا۔ دوسرے دن کے شام سات بجے علوینہ کی لہروں پر لاش ملی تھی۔ وہ بڑی بے چارگی سے اپنی ماں، بہن اور خالہ کو بری طرح سے روتا دیکھ رہا تھا۔ ارشمان کو لگ رہا تھا کہ اُس کے آنسو فریز ہوگئے ہیں۔ اس کی نگاہیں بھٹک کر علوینہ کے اس جوڑے پر پڑی جو آج اُس نے زیب تن کرنا تھا وہ حسرت سے اس لال جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ اس جوڑے کو علوینہ اور ارشمان نے آٹھ گھنٹے کی مشقت کے بعد پسند کیا تھا۔

علوینہ کو سفید کفن میں دیکھ کر عجیب احساس گھیرے ہوا تھا۔ ارشمان احمد کو لگا زندگی بڑی دغا باز ہے یہ کسی کے ساتھ بھی کھیل جاتی ہے۔ اس کے جنازے کو کاندھا دیتے ہوئے ارشمان کو اپنے کاندھے مفلوج سے محسوس ہوئے۔ قبرستان تک کا راستہ اُس کو لگ رہا تھا کہ وہ اپنے بے جان وجود کو گھسیٹ رہا ہے۔ اُس کا شدت سے دل چاہا کہ ساتھ چلتے ہوئے لوگوں سے بولے میری زندہ لاش کو بھی کاندھے دے دو مجھ سے اپنے وجود کا بوجھ برداشت نہیں ہورہا۔ علوینہ کے وجود کو قبر میں لٹاتے ہوئے اُس کے ہاتھوں نے شدت سے کانپنا شروع کردیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ اس قبر میں مدفن ہوجائے۔ ارشمان احمد کو قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے ہاتھ بیکار ہوگئے ہیں۔ اس کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی وہ اب کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ ایک آنسو گر کر مٹی میں جذب ہوگیا۔ اب سب ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے لگے وہ بھی سب کی تقلید میں دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر دعا

کرنے لگا۔ نگاہیں اپنے ہاتھوں پر تھی جنھوں نے کل رات مہندی لگے گجرے والے ہاتھوں کو تھاما ہوا تھا۔

کانوں میں علوینہ کی جھولے میں بیٹھی شریری چیخ سنائی دی آہستہ آہستہ کر کے سب منظر آنکھوں کی اسکرین پر چلنا شروع ہوگئے۔ پہلی جنوری شروع ہو چکی تھی۔ وہ بے ساختہ وہیں گھٹنوں کے بل گرا۔ میں نئے سال کی صبح اپنی زندگی کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں کی گونج اس کو اپنے جسم پر کوڑوں کی مانند محسوس ہوئی۔ ارشمان احمد کی نگاہیں کتبے پر جا ٹھہریں۔

نام......علوینہ ارشمان

تاریخ پیدائش......1986

قبرستان کے سناٹے کو چیرتی ہوئی اس کی آواز دور تک گونجی میں علوینہ سے عشق کرتا ہوں۔ ارشمان احمد قبر پر سر ٹکائے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔ عمر بھر کی اذیت جاگ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اوہ بڑی غمگین کہانی ہے دونوں کی۔ تانیہ سن کر افسردگی سے بولی۔

''پتا ہے تانی میں جب ارشمان کی آنکھوں کو دیکھتی تھی نہ مجھے لگتا تھا کہ غم کا موسم اُس کی آنکھوں میں ٹھہر سا گیا ہو۔ ایک بار مجھ سے ارشمان نے بولا کہ رومانہ میرے ان سمندر کی لہروں سے بڑے حساب نکلتے ہیں میں اس وقت اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ پائی تھی پر آج میں سمجھ گئی کہ اس کو ان سمندر کی لہروں سے اتنی عداوت کیوں ہے۔ رومانہ علوی کے لہجے میں ارشمان احمد کا دکھ بول رہا تھا۔

''تم اپنے ناول کا اختتام کیا کرو گی۔'' تانی بات بدلتے ہوئے بولی۔

''کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ اس ناول کا اختتام کیا ہونا چاہیے۔ ارشمان کو اس کی علوینہ نہ مل سکی پر رومانہ علوی کو اس کا ارشمان ملنا چاہیے رومی......''

تانیہ کی بات پر وہ افسردگی سے مسکرا دی۔

''کس کو پتا ہے کون یہاں بامراد ہوگا اور کون خالی ہاتھ رہ جائے گا۔'' رومانہ کی بات پر وہ اس کو دیکھ کے رہ گئی۔

☆......☆......☆

وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے بس شور مچاتی تیز لہروں کی آوازیں تھی۔ اس خاموشی کو ارشمان کی آواز نے توڑا۔

''کاش میں اس رات علوینہ کی بات نہ مانتا تو آج اپنے دکھوں پر ماتم نہ کر رہا ہوتا۔ اس کے قسم دینے پر بھی میں اس کی نہ سنتا۔ کاش کاش کچھ بھی نہ ہوا ہوتا۔ یہ کاش لفظ بڑا عجیب ہے انسان کتنی حسرت سے اس کاش لفظ کو کہتا ہے۔''

''پتا ہے رومانہ جب تک نعمت ہمارے پاس ہوتی ہے نہ ہیں اس نعمت کی اتنی قدر نہیں ہوتی جب وہ آپ سے چھن جاتی ہے نہ تو آپ کو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہوگئے۔ محبت بھی تو بہت بڑی نعمت ہے نہ...... دیکھو میں بھی اس نعمت سے محروم ہوگیا۔ وہ اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

''میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ ہر چیز میں میری علوینہ کی یادیں ہیں۔ ممی ڈیڈی مجھے اپنے پاس امریکہ بلا رہے ہیں میں ان کے پاس جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے......'' ارشمان کی بات پر رومانہ کو اپنا دل بند ہوتا ہوا لگا۔ اس کو لگا اگر ارشمان احمد چلا گیا تو اس کا بھی دم گھٹ جائے گا۔

''آپ کب جا رہے ہیں؟'' بے چین ہو کر

اُس نے سوال کیا۔

''ایک ہفتے بعد......'' اس کی بات پر وہ بمشکل اثبات میں سر ہلا کر اپنے امڈتے آنسوؤں پر قابو پانے کے لیے تیزی سے سر جھکا گئی۔

☆......☆......☆

''تانی وہ جا رہا ہے۔'' رومانہ علوی اتنے دھیمے سے بولی کہ تانیہ بمشکل سن پائی کہ اس نے بولا کیا ہے۔

''وہ تمہارے نصیب میں نہیں ہے رومی اور تم سے بہتر تو کوئی نہیں یہ بات سمجھے گا کہ ہر کہانی کے اینڈ میں ملن ضروری تو نہیں ہوتا۔''

''ہاں وہ میرے نصیب میں نہیں ہے۔'' وہ اذیت سے ہنس دی۔

''ارشمان احمد نے بڑا سچا عشق کیا ہے علوینہ سے بڑی خوش نصیب ہے علوینہ، اُس کا محبوب بڑا سچا ہے۔ ارشمان احمد جیسے مرد بہت کم ہوتے ہیں۔ ایک کے نام پر اپنی عمر گزار دیتے ہیں۔''

''کیا کرو گی اب تم رومی......'' تانی اس کے چہرے پر پھیلی اذیت کو دکھ سے دیکھتے ہوئے بولی۔

لکھ دینا میرے مزار کے کتبے پر
مرحوم زندگی کی حسرت میں مر گیا

رومانہ کے بے ساختہ شعر کہنے پر تانیہ دہل کر اس کو دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

''جا رہا ہوں میں روکو گی نہیں۔'' وہ اس کی قبر کے پاس دوزانو ہوئے بیٹھا تھا۔

''تم بہت جھوٹی ہو علوینہ تم نے کہا تھا کہ میں تمہاری زندگی کا دوسرا نام ہوں۔ کیوں کی تھی مجھ سے محبت اتنی اپنا عادی بنا کر چھوڑ گئی۔ اب لگتا ہے کسی کو میری پرواہ ہی نہیں۔ یہ عادت بھی علوینہ بڑی عجیب چیز ہوتی ہے ایک نشے کی مانند...... جب ہم کسی چیز کے عادی ہو جاتے ہیں نہ تو اس سے پیچھا تا عمر نہیں چھڑا سکتے۔ جس دن میں نے تم کو اس خاک کے سپرد کیا تھا نہ اس دن اپنا دل بھی یہیں چھوڑ گیا تھا۔ اپنا دل تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ بس کھوکھلا وجود لے کر جا رہا ہوں۔ ارشمان احمد یہاں بھی علوینہ کا ہے اور مرنے کے بعد بھی تمہارا ہوگا۔'' آنکھوں سے بہتے بے تحاشا آنسو جو قبر پر پڑی گلاب کی پتیوں پر گر رہے تھے۔ وہ محبت سے قبر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ بعض حادثے ہماری زندگی میں ایسے ہوتے ہیں کہ ہمیں ساری زندگی لگ جاتی ہے خود کو سنبھالنے میں...... ایک الوداعی نگاہ اس نے قبر پر ڈالی۔ اللہ حافظ میری زندگی......

وہ اس سے ملنے اس کے گھر نہیں گئی تھی۔

رومانہ علوی کے اندر اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ ارشمان احمد کو رخصت ہوتا دیکھتی۔ مگر وہ آج جانے سے پہلے خود اس سے ملنے چلا آیا۔ وہ لان میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''میں نے سوچا آپ تو آئیں نہیں میں ہی ملنے چلا جاؤں۔'' وہ مسکرا کر اُس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کی بات پر وہ خاموشی سے سر جھکائے لان کی گھاس کو دیکھے جا رہی تھی۔

''اپنا بہت خیال رکھیے گا مجھے جلدی ایئرپورٹ پہنچنا ہے۔ سوچا آپ کو خدا حافظ کہتا جاؤں۔ اس کی بات پر اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

''یہ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ، ایک لکھاری کے لیے اس سے بہترین تحفہ کوئی ہو نہیں سکتا میرے خیال میں۔'' وہ تحفہ اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''اجازت چاہتا ہوں۔'' ارشمان کہتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ وہ اپنی سسکیوں کو دباتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔
''دعاؤں میں یاد رکھیے گا رومانہ......''
ارشمان کی بات پر وہ بمشکل سر ہلا کر رہ گئی۔ حلق میں آنسو کے نمکین گولے کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔
''اللہ حافظ۔'' ارشمان احمد نے جاتے ہوئے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی جو شدتِ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ لب بھینچ کر تیزی سے گیٹ سے نکل گیا۔
ساجدہ بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دکھ سے اسے دیکھنے لگیں۔
''امی وہ گیا'' ماں کو خالی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ساجدہ کو اس کے چہرے پر پھیلے کرب کو دیکھ کر اذیت ہونے لگی۔ وہ ہاتھ میں ارشمان کا دیا تحفہ دیکھنے لگی۔
سنہری نفیس سا قلم تھا۔
''میں ٹھیک ہوں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔'' وہ ماں کے پریشان چہرے کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔
کمرے میں آ کر رومانہ علوی دروازہ بند کر کے اُس کی پشت سے لگ کر اپنی بلند ہوتی چیخوں کو دونوں ہاتھوں سے روکتی وہیں بیٹھتی چلی گئی۔
''تم چلے گئے ارشمان میں اپنے خالی وجود کو کیسے لیے پھروں گی۔'' اس کو شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا اپنے سینے پر ہاتھ رکھتی وہ جھکتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

محبت کے اس کھیل میں نہ ارشمان کو اس کی علوی نہ مل سکی نہ رومانہ علوی کو اس کا ارشمان مل سکا۔ رومانہ علوی میں واقعی ارشمان احمد کو رخصت کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق دل بند ہو جانے سے رومانہ کی موت ہوئی ہے۔ ڈاکٹرز کو کیا پتا اس کی موت کی وجہ اس کا بے معنی جنون تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا اس ناول کا اختتام میں کروں گی۔
مجھ سے رومانہ نے کہا تھا کہ ارشمان جیسے مرد بہت کم ہوتے ہیں پر رومانہ علوی یہ نہیں جانتی تھی کہ اس جیسی عورتیں بھی بہت کم ہوتی ہیں ایک مرد اگر اُن کی زندگی میں آ جائے تو پھر دوسرے مرد کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ کہانی لکھتے لکھتے رومانہ علوی خود آج ایک کہانی ہوگئی۔
میں کیا لکھوں مجھے لگتا ہے لفظوں کی موت ہوگئی ہو جیسے...... تانیہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ لرزتے ہاتھوں سے ناول کا اختتام کر گئی۔

☆......☆......☆

دیارِ غیر میں بیٹھے ارشمان احمد ہاتھوں میں ناول لیے بیٹھا تھا۔ وہ ناول بند کر کے ٹیبل پر رکھتا باہر ہوتی برف باری کو کھڑکی سے دیکھنے لگا۔
''تمہاری آنکھوں میں میرے لیے جو محبت تھی رومانہ علوی اس سے میں بہت پہلے ہی باخبر ہو چکا تھا پر میں کیا کرتا میں تو خود خالی ہاتھ تھا میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ وقتِ رخصت تمہارے چہرے کی اذیت نے مجھے دکھی کر دیا تھا۔ مجھے تم پر اس وقت بڑا بے ساختہ رحم آیا تھا۔ تم مجھے اس وقت بہت بے بس سی لگی تھیں۔ مجھے معاف کر دینا رومانہ علوی...... اللہ تمہیں سکون دے......'' ارشمان احمد کی آنکھ سے آنسو ٹپک کر ناول میں جذب ہوگیا۔
ایک جنوں بے معنی ایک یقین لاحاصل
کیا ملا ہمیں محسن اس کی آرزو کر کے

☆☆......☆☆

افسانہ

ندیا مسعود

کسی مہرباں نے آ کر...

"ارے تم فکر نہ کرو ایسا کرو شیئرز خرید لو۔ آج کل بھاؤ بہت اونچے جا رہے ہیں۔ پیسے دگنے تگنے ہو جائیں گے۔ خورشید (دوست) نے پُرجوش انداز میں کہا۔ نثار صاحب فوراً راضی ہو گئے اور سارے جمع شدہ پیسے شیئرز میں لگا دیے۔ مگر یہ کیا......

سرخ جوڑے میں ملبوس اسٹیج پر بیٹھی ہوئی مہرین کسی بھی طرح شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ زبردست میک اپ، مناسب جیولری اور قیمتی جوڑے نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اپنی دوستوں کے درمیان میں وہ اپنی خوشی چھپا نہیں پا رہی تھی۔ اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ اپنے ہونے والے ہینڈسم دولہا پر سہیلیوں کے تبصرے اُس کے گالوں کو مزید گلابی بنا رہے تھے۔ بات بات پر ہنسی آئے جا رہی تھی۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا۔ مولانا صاحب نکاح کی اجازت لینے آ گئے۔ ایجاب و قبول ہو گیا۔

شاہین کی آنکھوں سے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ بیٹی کی جدائی کا تصور دونوں ماں بیٹی کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔ لڑکے یعنی شہزاد کے پاس نکاح کے لیے مولانا گئے۔ قبول ہے قبول ہے کے بعد سب دولہا سے گلے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ مختصر سے مہمانوں کی محفل سجی تھی۔ کھانا لگایا گیا اور پھر تقریب اپنے اختتامی مراحل میں تھی کہ اچانک یہ خبر مہرین پر بم کی طرح گری۔

"نہیں نہیں یہ کیا؟" مہرین بوکھلائی ہوئی اپنی ماں شاہین کی طرف دیکھ کر چلا اٹھی۔

"امی پلیز امی مجھے گھر لے چلیں۔"

مہرین کی ساس شبانہ بیگم اپنے بیٹے کی التجا لیے مہرین کی رخصتی کا اصرار کر رہی تھیں۔ شاہین منہ کھولے حیران و پریشان کھڑی اپنی بیٹی کو دلاسہ دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شہزاد نے اچانک رخصتی کا مطالبہ کر دیا۔ شہزاد (دولہا میاں) جو مہرین کے سپنوں کے شہزادے تھے ایکدم بدل گئے۔ مہرین کے والد نثار صاحب کو بلایا گیا۔ بزرگوں سے مشورہ ہوا۔

سب دولہا کی بے جا ضد پر حیران پریشان تھے۔ مگر جانتے تھے نکاح کے بعد وہ کسی بھی حق سے رخصتی کے مطالبے کو رد نہیں کر سکتے تھے۔ مہرین اور اس کی امی شاہین دم بخود تھیں۔ مہرین کسی بھی طرح رخصتی کو تیار نہ تھی۔ تقریب میں

لوگ دولہے کی دیدہ دلیری پر ششدر تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

نکاح کی پُر تکلف اور محدود مہمانوں کی تعداد کی تقریب ایک تماشا بن گئی۔ ہلچل مچی ہوئی تھی۔ جس میں مہرین کے والد نثار شیخ سر جھکائے کھڑے تھے۔ بالآخر دولہا کی ضد کے سامنے ہار گئے۔ مہرین اپنی بہن نوشین کے گلے لگ کر اس شدت سے روئی کہ وہاں سب خواتین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مہرین نے اپنے سسرال میں قدم رکھا تو نفرت اور غصے سے برا حال تھا۔ سارے ارمان ساری خواہشیں چکنا چور ہو گئیں تھیں۔ شہزاد اور مہرین واجبی رسموں کے بعد کمرہ عروسی میں لائے گئے۔ نند اور بھاوجوں کی چھیڑ چھاڑ کے بعد شہزاد کمرے میں داخل ہوئے اور نہایت آہستگی سے کمرے کے دروازے کو لاک کیا۔

خراماں خراماں اس مسہری کی طرف بڑھے جو کہ نہ سجی تھی، نہ پھولوں کی خوشبو تھی، نہ نئی سیج کی رونق بس بیڈ پر دلہن کے جوڑے میں مہرین سمٹی بیٹھی تھی۔

شہزاد نے نہایت نرم لہجے میں 'السلام علیکم' کہا۔ مہرین نے غضبناک نظروں سے شہزاد کی

طرف دیکھا اور نفرت سے منہ موڑ لیا۔
''مہرین پلیز میری طرف دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟''
مہرین اچھل کر بستر سے اتر گئی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہ تھی۔
خبردار مجھے ہاتھ مت لگانا۔'' مہرین نے قہر آلود نگاہوں سے شہزاد کو دیکھا جو کہ دولہا کے روپ میں شہزاد نہیں شہزادہ لگ رہا تھا۔ بالکل اُس کے تصوراتی آئیڈیل کی طرح ہینڈسم اور اسمارٹ...... ایک لمحے کو تو وہ پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ لمحہ بھر کے بعد چونکی اور غصہ دوبارہ عروج پر پہنچ گیا۔
شہزاد بولا۔''مہرین بیٹھ جاؤ آرام سے میری بات تو سنو......!''
''بات سنوں، کیا بات سنوں؟ تم نے میرے ارمانوں کا خون کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ میں نے اپنی شادی پر کیا کیا پلان کیا تھا تم نے سب برباد کردیا۔ تم میری نظروں سے بالکل گر چکے ہو۔ اگر قریب بھی آئے تو شور مچا کر سب کو اکٹھا کرلوں گی۔'' مہرین بڑی بے ادبی سے بولی۔
''خبردار جو نزدیک آئے۔ وہ تماشا کھڑا کروں گی کہ تم بھی یاد کرو گے۔ تمہیں ذرا بھی احساس ہے کہ مجھ پر، میرے ماں باپ پر کیا گزری، کس قدر بے عزتی ہوئی مہمانوں کے سامنے۔'' مہرین بولے چلی جارہی تھی اور شہزاد بار بار اُس کو منانے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ مگر وہ تھی کہ قابو میں ہی نہیں آرہی تھی۔
آخر شہزاد ذرا زور سے بولا۔
''بس کرو مہرین اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں تمہارے قریب اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک تمہاری مرضی نہیں ہوگی۔ مگر میری بھی ایک شرط ہے۔''
''میں کوئی شرط ورط ماننے کو تیار نہیں۔'' مہرین نے تلخ لہجے میں کہا۔
''تو ٹھیک ہے قانوناً میں تمہارا شوہر ہوں مجھے تمہارے پاس آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔'' وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔
''نہیں نہیں پلیز...... بتائیں کیا شرط ہے؟''
''ہاں اب ٹھیک ہے شرط یہ ہے کہ صبح کسی پر یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم دونوں میں کوئی رنجش یا لڑائی ہے، ہنستی مسکراتی اپنے اماں ابا کے گھر جاؤ گی یہاں تک کہ تمہاری بہن کو بھی شک نہ ہو۔ وعدہ کرو ورنہ......'' شہزاد نے ذرا زور سے بولا۔
''اچھا ٹھیک ہے۔ اب مجھے سونے دیں پلیز بہت نیند آرہی ہے۔'' مہرین نے نہایت معصومیت سے کہا۔ شہزاد کو ہنسی آگئی۔ اُس کی معصومیت اور بھولے پن پر بہت پیار آیا۔
''جاؤ کپڑے بدل لو...... باتھ روم وائیں طرف ہے۔ میں صوفے پر سو جاؤں گا۔'' شہزاد نے پُرسکون لہجے میں کہا۔
دروازے پر ہلکی سی آواز سے مہرین ہڑبڑا کر اٹھی۔ دیکھا شہزاد صوفے پر بے خبر سو رہا تھا۔ گھبرا کر شہزاد کی چادر کھینچی، شہزاد آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ ایک لمحے کو پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ اتنا حسین چہرہ میک اپ بگڑنے پر بھی حسن ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ مہرین کی گھبرائی ہوئی آواز پر چونکا۔
''کیا ہوا؟'' شہزاد نے پوچھا۔
''باہر دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے کوئی۔'' مہرین نے بے ساختہ کہا۔
''اوہ...... اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ اپنی چادر بیڈ

پر رکھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا۔ دیکھا تو اُس کی بہن اپنی دو عدد سہیلیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

'' بھائی جان ناشتہ تیار ہے آپ اور بھابی آ کر ہمیں جوائن کریں پلیز۔'' شہر بانو کن انکھیوں سے مہرین کو دیکھ رہی تھی جو کہ بیڈ پر سمٹی بیٹھی تھی۔

'' اچھا اچھا ہم فریش ہو کر کھانے کی میز پر آتے ہیں۔'' شہزاد نے اپنی بہن اور اُس کی سہیلیوں کو دروازے سے واپس جانے کا اشارہ دیا۔

'' مہرین کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ناشتے کی ٹیبل پر جائیں گے۔'' شہزاد نے اُسے حکم دیا۔

مہرین نے کن انکھیوں سے شہزاد کو دیکھا۔ سخت غصے میں تھی۔

'' ایک تو زبردستی رخصتی کروالی اس پر ڈھٹائی دیکھو حکم بھی چلا رہے ہیں۔'' مگر اس ڈر سے کہ کہیں وہ فری نہ ہو جائیں فوراً تیار ہونے چلی گئی۔

شہزاد اور مہرین ناشتے کی میز پر پہنچے تو سب کی مسکراتی ہوئی نظریں اُن دونوں کو شرمندہ کر رہی تھیں۔ مہرین آتشی گلابی جوڑے میں ہلکے سے میک اپ اور مناسب جیولری میں غضب کی لگ رہی تھی۔

اس کے برابر شہزاد براؤن سوٹ میں انتہائی پُرکشش اور باوقار نظر آ رہا تھا۔ جوڑی اتنی شاندار لگ رہی تھی کہ مہرین کی ساس شبانہ بیگم فوراً صدقہ واری ہو گئیں۔ ملازمہ سے فوراً صدقہ اُتارنے کو کہا۔ ناشتے کی میز پر شہزاد بڑی ہنسی خوشی سب کے مذاق اور سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

مہرین حیران پریشان تھی کہ رات کی اُس کی بدتمیزی اور بے ادبی کا اُس پر ذرا اثر نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا نہ جانے ان کو کتنی خوشی ہے اس شادی سے کہ چھپائے نہیں چھپ رہی۔

مہرین نے دروازے سے نوشین اور اپنے بھائی کو تحفے تحائف کے ساتھ اندر آتے دیکھا تو بے اختیار نوشین سے لپٹ گئی آنکھوں میں بھر بھر آنسو آ رہے تھے مگر شہزاد کے ڈر سے ضبط کر کر کے خاموشی سے پونچھ لیے۔

'' چلو مہرین رسم کے مطابق تمہیں گھر لے جانے آئے ہیں۔'' نوشین نے بڑے بے صبرے انداز میں کہا۔

'' دولہا بھائی ابھی دلہن اکیلے ہم بہن بھائی کے ساتھ جائے گی۔ شام میں آپ اپنے سب گھر والوں کے ساتھ مہرین کو لینے آ یئے گا۔ چوتھی کا کھانا ہمارے ساتھ کھایئے گا۔''

شہزاد نے پُرجوش لہجے میں نوشین سے کہا۔

'' جو حکم سرکار کا۔''

مہرین نے چبھتی ہوئی نظروں سے شہزاد کی طرف دیکھا جس میں اسے شرارت اور محبت نظر آ رہی تھی۔ مگر مہرین کی آنکھوں میں گلہ تھا۔

گھر پہنچتے ہی وہ امی کے گلے لگ کر خوب روئی۔ اپنے باپ کو دیکھ کر تو ضبط کا یارا نہ رہا۔ بار بار دوہرا رہی تھی کہ امی ابو آپ دونوں کیسے میری رخصتی پر آمادہ ہو گئے۔ اُن لوگوں کو روکا کیوں نہیں۔

میں ذہنی طور پر رخصتی کے لیے تیار نہیں تھی۔ آپ لوگوں نے ذرا بھی میرے خیالات اور جذبات کا خیال نہ کیا۔ دونوں یعنی ابو اور امی سر جھکائے کھڑے اس کی فریاد سن رہے تھے اور اُس کو بتا رہے تھے کہ نکاح کے بعد لڑکی کے ماں باپ کیسے بے بس ہو جاتے ہیں۔ اُن کو ہر وہ بات بادل نخواستہ ماننا پڑتی ہے جس کے لیے وہ بالکل بھی تیار نہ ہوں۔

نوشین بار بار شہزاد بھائی شہزاد بھائی کا نام لے کر اُس کو ستا رہی تھی۔ مگر شہزاد کی دھمکی نے اُس کی زبان میں تالے ڈال دیے تھے۔ وہ ہر بات پر مسکرا کر خاموش رہی مگر نوشین کو اپنے غصے کے اس طوفان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکی جو اُس کے دل میں اُٹھ رہے تھے۔

سب کزنز کی موجودگی میں تھوڑی دیر کو وہ ہر بات بھول کر اُن کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوگئی۔ وہی شرارتیں وہی باتیں......

امی ابو اُس کی معصومیت پر صدقہ واری ہو رہے تھے بات بے بات اُس کی باتوں میں اُس کا ساتھ دے کر اپنی غلطی کے مداوا کی کوششوں میں لگے تھے۔ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا پتا ہی نہیں چلا۔

''ارے مہرین بتاؤ کون سا جوڑا شام کے لیے نکالنا ہے۔ یہ گرین والا ٹھیک ہے۔'' نوشین نے بڑے جوش و خروش سے اُس کے سسرال کی طرف سے آیا ہوا بوتیک کا سوٹ نکال کر پوچھا۔ جو کہ انتہائی حسین تھا دیکھنے میں ہی بیش قیمت لگ رہا تھا۔

مہرین ایکدم چونکی اور جانے کے خیال سے ہی بوکھلا گئی۔

''نوشین پلیز کیا میں اپنے گھر میں ہی نہیں رک سکتی جانا ضروری ہے۔'' اُس نے ملتجی نظروں سے نوشین کی طرف دیکھا۔

''بنو! شادی کے بعد دلہن سسرال میں ہی اچھی لگتی ہے۔'' نوشین نے بڑی بوڑھیوں کی طرح اُس کو نصیحت کی۔ مہرین کے چہرے پر سخت گھبراہٹ تھی۔ مگر وہ اپنے گھر والوں سے چھپانے کے لیے زبردستی مسکرا رہی تھی۔

مہرین میرے دولہا بھائی شہزاد نہیں بلکہ شہزادہ ہیں، کیا ہینڈسم پرسنالٹی ہے، بولتے ہیں تو لگتا ہے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔'' نوشین بولے چلے جا رہی تھی اور مہرین خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

چوتھی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ کھانے کی ڈشز تو پہلے سے طے ہو چکی تھیں۔ بس رسموں کے لیے پھل، پھول ہار وغیرہ منگوائے جا رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں شہزاد اپنے گھر والوں کے ہمراہ مہرین کے گھر پہنچے امی ابو نے استقبال کیا۔ شہزاد سفید شلوار اور پرپل کرتے میں اس قدر حسین لگ رہے تھے کہ ہر ایک مہرین کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔

اور مہرین دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی کہ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کس کرب سے گزر رہی ہے کیا کیا ارمان دل میں لیے ہوئے اس نکاح پر خوش خوش تیار تھی کہ شہزاد کی رخصتی کی ضد نے ارمانوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور وہ ماضی کی ان خوشگوار وادیوں میں پہنچ گئی جو کسی بھی لڑکی کی زندگی میں شادی کے ارمان پورے کرنے کے خواب ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

نکاح کا غرارہ ڈیزائنر بنوانا میں تمہیں گائیڈ کر دوں گی۔'' شمع نے اُس کے نکاح کی خبر سنتے ہی خوش ہو کر بتایا۔

''ارے بے وقوف نکاح کا جوڑا تو دولہا والوں کی طرف سے ہوگا۔''

''اوہ...... چلو ایسا کرتے ہیں کہ شادی کے جوڑوں کی تیاری کرتے ہیں۔ ابھی ابھی میری بہن کی شادی ہوئی ہے۔ مجھے سب دکانیں اور جگہ معلوم ہیں کہ کہاں سے اچھا کام بنتا ہے کہاں ریڈی میڈ سوٹس ملتے ہیں۔ جیولری کہاں سے لینا

ہے۔" شمع نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

"صبر صبر!" مہرین نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شادی میری ہے اور گھبراہٹ تم پر طاری ہے۔"

"ہاں مجھے پتہ ہے مگر پھر بھی پہلے سے نہیں سوچیں گے تو کیسے ایکدم سے سب کام ہوں گے چلو ڈائری میں ہر دن کو کیسے منانا ہے لکھ لیتے ہیں۔" شمع نے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے مہرین نے اپنی دراز سے ایک نئی ڈائری نکالی اور دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں کہ کتنے جوڑے بنیں گے؟ کس کس کلر کے ہوں گے؟ کتنے مہمان آئیں گے؟ مانجھے پر کس پارلر سے میک اپ ہوگا۔

شادی پر کس پارلر جانا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اس بات سے بے خبر کہ مہرین کے والدین ان کی ان خواہشات کو پورا کرنے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں کہ نہیں۔

دراصل نثار صاحب ریٹائرمنٹ سے پہلے بینک میں بڑے اچھے عہدے پر فائز تھے۔ پیسوں کی بڑی ریل پیل تھی۔ بیگم شاہین کا یہ عالم تھا کہ گھر کی جدید ڈیکوریشن سے لے کر جدید فیشن کے کپڑے بغیر پیسوں کی فکر کیے بنائے چلی جاتی تھیں۔ بیٹیوں کو بھی وہی عادت تھی بغیر سوچے سمجھے فیشن اور جیولری بنائے چلی جاتی تھیں۔ مسز نثار یعنی شاہین نے کبھی یہ نہ سوچا کہ بیٹیوں کی ماں ہیں جہیز یا پیسے بچا کر رکھیں۔

کرتی بھی کیسے نثار صاحب اپنی بیگم کی ہر خوشی پوری کرنے کے لیے اُن کے نخرے اور لاڈ اٹھاتے تھے کبھی بیگم کو پیسے کی کمی کا احساس ہی نہیں دلوایا۔

ایک دن نثار صاحب کے دوست نے اُن کو باور کروایا کہ دو بیٹیوں کے باپ ہو کچھ بچا کر رکھا ہے۔" نثار چونکے کہا۔

"نہیں کبھی سوچا ہی نہیں اور یہ کام میرے نہیں بلکہ لڑکیوں کی ماں کے سوچنے کے ہیں۔ مگر شاہین کا مزاج ہی ایسا نہیں کہ وہ یہ سب سوچے۔"

"ارے تم فکر نہ کرو ایسا کرو شیئرز خرید لو۔ آج کل بھاؤ بہت اونچے جا رہے ہیں۔ پیسے دگنے تگنے ہو جائیں گے۔ خورشید (دوست) نے پُرجوش انداز میں کہا۔ نثار صاحب فوراً راضی

غزل

حال احوال کیا سناؤں اُسے
اب تو رو کر گلے لگاؤں اُسے

کبھی ایسا ہو دلکشی اُس کی
اپنی آنکھوں سے میں دکھاؤں اُسے

دن گذرتا نہیں تھا جس کے بغیر
اب کسی دن تو دکھ آؤں اُسے

زندگی ہارنے کی شرط قبول
گر کسی طرح جیت جاؤں اُسے

اُس کے کمرے میں سنگ کرنوں کے
نیند سے آکے میں جگاؤں اُسے

سعدیہ جیسے وہ رُلاتا ہے
کاش میں بھی کبھی رُلاؤں اُسے

شاعرہ: سعدیہ سیٹھی۔ لندن

ہوگئے اور سارے جمع شدہ پیسے شیئرز میں لگادیے۔ مگر یہ کیا اچانک شیئرز کا بھاؤ گر گیا سارے پیسے ڈوب گئے۔ نثار صاحب کو انجائنا کا درد اٹھا، اسپتال پہنچ گئے۔ بیوی اور بیٹیاں بوکھلا گئے کیونکہ انہوں نے کبھی بھی اس طرح کی صورتحال کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ بہرحال چند دنوں اسپتال میں رہنے کے بعد نثار صاحب گھر آ گئے۔ مگر فکر مند تھے کہ اب مستقبل میں بغیر پیسوں کے کیسے گزارہ ہوگا۔ خدا کی اس آزمائش کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ مگر ایماندار اور نیک لوگوں کو خدا آزماتا بھی ہے یہی ہوا کہ اچانک مہرین کا رشتہ آ گیا۔ لڑکا امریکہ میں بڑی اچھی نوکری پر تھا اور شکل صورت قد کاٹھ ایسا کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں۔ فوراً رشتہ طے ہوگیا اور بات اس پر طے ہوئی کہ لڑکا آج کل پاکستان آیا ہوا ہے نکاح کر دیا جائے تاکہ پیپر ورک مکمل کر کے جلد از جلد رخصتی کی جائے۔

اِدھر نثار صاحب تذبذب کے عالم میں تھے بغیر پیسے کے اس فرض سے کیسے سبکدوش ہوں۔ آخر اپنی طبیعت کے خلاف اپنے دوست سے مدد طلب کی جو کچھ شرائط کے ساتھ پیسے دینے کو تیار ہوگیا اور نکاح کی تقریب طے پائی۔ مگر یہ کیا؟ شہزاد نے نکاح کے بجائے رخصتی کا مطالبہ کر دیا۔

مہرین اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ غصے میں برہم تھی مگر نکاح کے بعد ماں باپ مجبور ہو گئے اور لڑکوں والوں کا کہنا اُن کو ماننا پڑا۔ مہرین کے سارے ارمان، سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ بھلا ایسی ہوتی ہے شادی زبردستی اٹھا لائے۔ یہ سوچ سوچ کر بھر بھر آنسو آ جاتے آنکھوں میں۔

''چلو مہرین گھر جانے کا وقت آ گیا۔ شہزاد نے مسکراتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھاما۔ بوکھلا کر مہرین نے ہاتھ چھڑا لیا کرنٹ سا دوڑ گیا پورے وجود میں۔ وہ لمحہ خوشی کے بجائے افسوس میں بدل گیا۔

''ارے بھئی جلدی کرو۔ میرا دوست امریکہ سے پہنچ رہا ہے مجھے ایئرپورٹ اُس کو لینے جانا ہے۔'' شہزاد نے ذرا زور دار آواز میں کہا تو سارے گھر والے اُس کو رخصت کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی سسرال آ گئی۔

شہزاد اُس کو چھوڑ کر فوراً دوست کو لینے ایئرپورٹ پہنچ گیا اور مہرین کو تیار رہنے کو کہا۔

''سنو مہرین یہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے بھرپور طریقے سے استقبال کرنا۔'' شہزاد نے نرمی سے کہا۔

''جی اچھا......'' مہرین نے بے زاری سے کہا۔ اور پھر اُداسی چھا گئی۔

شہزاد اپنے دوست کے ساتھ ڈرائنگ روم میں مہرین کا انتظار کر رہا تھا۔ مہرین کا گزر کسی کام سے ڈرائنگ روم کی طرف سے ہوا تو شہزاد بڑی ہی انکساری سے اپنے دوست سے معافی مانگ رہا تھا۔

عمران (شہزاد کا دوست) اصرار کر رہا تھا کہ وجہ بتاؤ کہ تم نے شادی کے بجائے نکاح پر رخصتی کیوں مانگی۔ یہ ہے تحفہ تمہارے سوئٹزرلینڈ کا ٹکٹ، مگر شرط وہی ہے کہ وجہ بتاؤ۔ میں کس قدر بے چین تھا کہ تمہاری شادی پر خوب ہنگامہ کروں گا اور تم نے نکاح پر رخصتی کروالی۔ ذرا اپنے دوست کی پرواہ نہ کی۔

''اچھا اللہ کے بندے بتاتا ہوں مگر تمہارے علاوہ کسی کو خبر نہ ہو۔'' عمران ہمہ تن گوش ہوگیا۔ شہزاد نے بات یوں شروع کی کہ یار جس

دن میرا نکاح تھا میں اسٹیج سے اُٹھ کر اکیلا باتھ روم کی جانب جا رہا تھا کہ میں نے دلہن کے والد یعنی نثار صاحب کو کسی شخص کی خوشامد کرتے دیکھا۔

''یار نکاح ہو جانے دو میں جلد از جلد تمہارے پیسے لوٹا دوں گا۔ کیا کروں یار ساری جمع پونجی شیئرز میں لگا دی۔ نہ بیٹیوں کو خبر نہ بیوی کو...... میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ دو دو بیٹیاں کیسے جہیز دوں گا کیسے شادی کا انتظام کروں گا تم سوچ بھی نہیں سکتے نثار صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں ٹھٹک گیا ان کی بے چارگی دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا اور سوچنے لگا کہ لڑکیوں کا باپ ہونا اور پیسے کی کمی ہونا اور کسی کے سامنے پیسے مانگنا کیا یہی شرمندگی ہی ایماندار باپ کی قسمت میں ہے۔ ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ میں آج ہی رخصتی کروا لیتا ہوں ایک باپ کی لاج رہ جائے گی دنیا کے سامنے......

اپنی بیٹیوں کے سامنے اپنی بیوی کے سامنے، زیادہ سے زیادہ لوگ مجھے برا بھلا کہیں گے مجھے اُس کی پرواہ نہیں اور شاید میں اپنی بیوی کو شرمندگی سے بچانے کے لیے اُس کے سامنے بھی کبھی نہیں بتاؤں گا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ کسی کے رازوں پر پردہ ڈالنے سے کسی کی بھلائی ہو جاتی ہے تو میں اس بھلائی کے لیے تیار ہوں۔ فوراً امی کے پاس جا کر تمام صورتحال سمجھائی۔ تم تو جانتے ہو میری ماں کو فوراً مان گئیں اور ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔ دیکھنا ان دعاؤں کا نتیجہ مہرین ایک نہ ایک دن میری بن جائے گی۔''

مہرین دم بخود اس فرشتہ نما انسان کی باتیں سن رہی تھی۔ اُس کی پرسنالٹی کے اور شکل و صورت کے علاوہ اس کے خیالات کتنے اچھے ہیں۔ میرے باپ کو شرمندگی سے بچالیا۔ مہرین کی آنکھوں میں فرط جذبات سے آنسو آ گئے۔ فوراً پلٹی کمرے میں آئی دروازہ بند کیا شکرانے کی نماز پڑھی کہ ایک ایماندار مخلص محبت کرنے والے باپ کی زندگی میں فرشتہ نما داماد دے دیا یا الٰہی تیرا شکر......''

شہزاد مہرین کو بلانے کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر گنگ رہ گیا کہ وہ جائے نماز بچھائے آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

''مہرین کیا ہوا بتاؤ مجھے؟'' وہ گھبرا گیا۔

مہرین نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔

''شہزاد مجھے معاف کر دیں میں آپ کے بارے میں کیا کیا سوچتی رہی مگر آپ نے تو مجھ پر اور میرے والدین پر احسان کیا ہے۔'' شہزاد اس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر اس کی پیاری صورت کو تکتا رہا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ محبت سے تھام کر چوم لیے۔

''پگلی میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں، میں باہر سے تعلیم حاصل کر کے ضرور آیا ہوں مگر اپنے مذہب کو نہیں بھولا شادی ایک بہت خوبصورت بندھن ہے۔ بے جا نمود و نمائش اس رشتے میں تلخیاں پیدا کرتی ہے۔'' وہ بول رہا تھا اور مہرین اپنے شوہر پر واری صدقے ہو رہی تھی۔

''اچھا اٹھو تیار ہو جاؤ میرا دوست کیا کہے گا کہ دونوں میاں بیوی کمرے میں بند ہو گئے۔'' مہرین نے ہنس کر شہزاد کو دیکھا۔ اور ایک دم ہی سارے گلے شکوے دور ہو گئے۔ زندگی کتنی خوبصورت ہے اُسے آج احساس ہو رہا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

عائشہ نور عاشا

اتنی سی محبت

''میں اپنی بیٹی کو سوتیلے رشتے دے کر اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔'' بے شک سوتیلے رشتے حقیقی رشتوں کی پیاس نہیں بجھا سکتے کہیں نا کہیں تشنگی رہ ہی جاتی ہے۔ پھر یوں ہے کہ انسان سوتیلے رشتوں کو دیکھ کر حقیقی رشتوں کو زیادہ یاد کرنے لگتا ہے۔ اور جب کوئی......

سرخ گلاب اور موتیے کے پھولوں سے کمرے کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا اور سینٹر ٹیبل پر موجود جلتے ہوئے دیے ماحول کو رومانوی بنانے میں اہم کردار کر رہے تھے۔ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس حسن کی دیوی پھولوں کے درمیان بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی وہ آیا تو نگین کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

داؤد نے اپنا موبائل ٹیبل پر رکھا اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے دھیرے سے گویا ہوا۔

''نئی زندگی کی شروعات کرنے سے پہلے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' نگین ہنوز خاموش رہی تو داؤد نے اپنی بات کہنا شروع کی۔

''نگین آج سے تین سال پہلے مجھے ایک لڑکی سے عشق ہو گیا محبت اب بھی کرتا ہوں ...... اور...... اور اگر وہ میری محبت قبول کرلے تو اُسے ہمیشہ اسی طرح چاہوں گا۔ شیشے کی طرح رکھوں گا اور......'' بات ابھی نامکمل تھی کہ نگین بول پڑی۔

''اگر ایسی ہی بات تھی تو آپ نے مجھ سے کیوں شادی کی؟'' نگین بھی اپنے نام کی ایک تھی ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ چپ چاپ کچھ بھی سہہ جائے۔ جو دل میں آیا کہہ دیا اور داؤد اس کی اس ہمت پر زوردار ہنسا تو نگین کچھ کنفیوژ ہوگئی کہ شاید مجھے بولنا نہیں چاہیے تھا۔

''میرا مطلب ہے اگر آپ اپنے پاپا سے یہ بات کرتے تو یقیناً وہ آپ کو اس شادی کے لیے مجبور نہ کرتے۔''

''کی تھی بات اسی لیے ہی تو میرے اور آپ کے پاپا کی دوستی رشتے میں بدلی ہے۔'' داؤد نے کہا تو اس بار نگین کچھ بولی نہیں بلکہ ناسمجھی کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ داؤد اس کی آنکھوں میں اُلجھن بخوبی دیکھ رہا تھا اس لیے وضاحت دی۔

''وہ لڑکی نگین داؤد ہے اور اسی کی محبت کی چاہ ہے مجھے۔'' داؤد کے گھمبیر لہجے سے نگین خود میں سمٹ گئی اور خوبصورت شربتی آنکھوں پر لمبی پلکوں کی جھالر گرالی۔

''کیا تمہیں میری محبت قبول ہے۔'' داؤد نے قدرے قریب ہوتے ہوئے کہا تو نگین کی دلکش

مسکراہٹ نے داؤد کی محبت کی قبولیت کو سند بخشی۔

☆......☆......☆

فیصل اور ہاشم صاحب کی دوستی اپنی مثال آپ تھی فیصل صاحب کی بیگم نگین کی پیدائش پر ہی ابدی نیند سوگئی۔ اس کے بعد انہوں نے نگین کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ بہت نازوں سے پالا اور اس کی ہر خواہش پوری کی۔ ہاشم صاحب نے لاکھ کہا شادی کرلو مگر فیصل صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

''میں اپنی بیٹی کو سوتیلے رشتے دے کر اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔'' بے شک سوتیلے رشتے حقیقی رشتوں کی پیاس نہیں بجھا سکتے کہیں نا کہیں تشنگی رہ ہی جاتی ہے۔ پھر یوں ہے کہ انسان سوتیلے رشتوں کو دیکھ کر حقیقی رشتوں کو زیادہ یاد کرنے لگتا ہے۔ اور جب کوئی رشتہ یاد، خیال، یا خواب بن جائے تو دل ہمہ وقت ان دیکھی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

داؤد ہاشم بھی نازیہ اور ہاشم کا واحد چشم و چراغ تھا۔ پڑھائی کے بعد پاپا کے کاروبار میں دلچسپی لینے لگا تو ہاشم صاحب نے خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین باپ جانا۔ جب داؤد نے نگین کے لیے پسندیدگی ظاہر کی تو مما پاپا دونوں کو بیٹے کی پسند پر فخر ہوا۔ وہ نگین کو بچپن سے جانتے تھے صاف دل، سادہ طبیعت اور اچھے اخلاق کی مالک لڑکی تھی۔ ہاشم نے فوراً سے بیشتر نگین کا ہاتھ مانگ لیا۔ فیصل صاحب نے بیٹی کی رائے لینی ضروری سمجھا تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا وہ جانتی تھی کہ داؤد ہاشم اچھی شکل و صورت رکھنے کے ساتھ ساتھ اچھے اور اعلیٰ اخلاقیات کا مالک ہے۔

منگنی کے محض دو ماہ بعد ہی شادی بھی ہوگئی اس دوران ان دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ داؤد نے کوشش ہی نہ کی وہ چاہتا تھا ساری باتیں اس وقت ہوں جب وہ اس کے گھر کی ملکہ بن کر اس کے آنگن میں اتر آئے۔

☆......☆......☆

''نگین...... نگین کہاں ہو یار؟'' وہ آفس سے آتے ہی پورے گھر میں شور مچا رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے جناب؟'' نگین کچن سے نکلی۔

''آنکھیں بند اور ہاتھ آگے کرو۔''

''جو حکم۔'' نگین نے مسکراتے ہوئے داؤد کے حکم کی تعمیل کی تو اس نے پھولوں کے خوبصورت گجرے اس کی دونوں کلائیوں میں سجا دیے۔

''بہت خوبصورت ہیں۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔

''تم سے زیادہ دلکش نہیں ہیں۔''

''اُف یہ ڈائیلاگ......'' نگین نے مصنوعی شکل بناتے ہوئے کہا تو داؤد نے اُسے گھورا۔

''اتنی محبت نہ کریں کہ جب اس میں کمی آئے تو مجھ سے سہا نہ جائے۔''

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ تمہارے لیے میری محبت میں کمی آئے۔'' داؤد نے ایک بار پھر اپنی محبت کا یقین دلایا تو نگین مسکرا دی۔ کیونکہ عورت ہر دن ہر لمحہ اپنے شوہر کی محبت کا ثبوت چاہتی ہے۔

☆......☆......☆

سال کے تمام دن ایک جیسے ہوتے ہیں مگر انسان اپنی ترجیحات کے مطابق ان کو معمولی یا غیر معمولی ہونے کی سند دیتے ہیں۔ یہ دن نگین اور داؤد کے لیے غیر معمولی تھا کیونکہ ڈاکٹر نے ان کو ایک ننھے مہمان کے آنے کی نوید دی تھی۔ دونوں مما پاپا اور پھر فیصل صاحب کے گھر بھی گئے سب بہت خوش تھے اور جب عمر اس دنیا میں آیا تو ان کی خوشی کو حقیقی روپ ملا۔ عمر نے داؤد اور نگین کے رشتے کو اور بہت مضبوط کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے آپ کچھ دنوں سے پریشان لگ رہے ہیں مجھ سے شیئر نہیں کریں گے؟'' عمر کی پیدائش کے بعد نگین کو داؤد کا رویہ کچھ بدلا سا محسوس ہوا تو پوچھا۔

''نہیں تو...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' داؤد نے قدرے سنبھل کر جواب دیا۔

''میری قسم کھا کر کہہ دیں میں مان جاؤں گی۔''

''مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟''

''ہے اعتبار...... بہت زیادہ ہے اسی لیے تو ڈرتی ہوں۔''

''کس بات سے ڈرتی ہو؟'' داؤد نے اپنی تمام تر توجہ نگین کی طرف مبذول کی۔

''کسی سے نہیں، بس مجھے ہمیشہ آپ کا ساتھ چاہیے۔'' نگین روہانسی ہو گئی تھی۔

''خادم حاضر ہے جناب۔'' داؤد نے ہنستے ہوئے کہا تو نگین نے اس کی آنکھوں میں رقم وفا کی تحریر پڑھ لی۔

وہ اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کو خطرہ ہے کیونکہ کچھ دن پہلے ہی ایک بھتہ خوروں کے گروپ نے گن پوائنٹ پر اس سے بھاری رقم کا تقاضا کیا اور پولیس کو اطلاع کرنے سے منع کیا مگر داؤد نے پولیس کو اطلاع کر دی اور جب اس گروپ کے دو آدمی رقم لینے آئے تو پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا اُن کی گرفتاری کے بعد داؤد کو کال کے ذریعے دھمکیاں دی گئی کہ وہ لوگ داؤد کی فیملی کو نقصان پہنچائیں گے۔ اب داؤد کو صرف اور صرف نگین اور عمر کی فکر تھی وہ خوف زدہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہر وقت گم صم رہنے لگا تھا۔ مشکل آسان ہو جاتی ہے اگر کسی اپنے سے دکھ بیان کر دیا جائے مگر یہاں معاملہ مختلف تھا۔ داؤد گھر کے کسی فرد کو بھی پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

آج نگین کو اپنی دوست فرح کے ساتھ شاپنگ پر جانا تھا۔ اس نے عمر کو دادی کے گھر بھیج دیا اور خود جانے کے لیے تیار ہونے لگی کہ ساتھ ڈور بیل چیخ اٹھی۔ اس نے دیکھا تو داؤد تھا

''آج اتنی جلدی آ گئے۔''

''ہاں، کہیں جا رہی ہو کیا؟'' داؤد کا موڈ خوشگوار تھا۔

''فرح کے ساتھ شاپنگ پر جا رہی ہوں۔''

''منع کر دو فرح کو، آج میں اور تم ساتھ وقت گزاریں گے۔'' شاید بہت دنوں کی پریشانی نے داؤد کو بھی اب تھکا دیا تھا اور وہ اس خوف کے ماحول سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

''اوہ! اچانک یہ تبدیلی......'' نگین مسکرائی۔

اور جب داؤد کو پتہ چلا کہ عمر بھی گھر پر نہیں ہے تو اس نے فوراً ہی شاپنگ اور لنچ کا پلان مرتب کر لیا۔

''چلو جانِ داؤد آج باہر گھومتے پھرتے دن گزارتے ہیں، واپسی پر عمر کو بھی لے لیں گے۔'' نگین اس تبدیلی پر بہت مسرور تھی۔

''اچھا چلیں آج آپ کی جیب ہلکی کرائی جائے۔'' وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مین گیٹ کی طرف بڑھے ہی تھے جب تین لوگ دروازے کو دھکیلتے اندر آ گئے اس سے پہلے کہ صورتحال واضح ہوتی انہوں نے فائر اوپن کر دیے۔ داؤد نے لمحے کے ہزارویں حصے میں نگین کو گملوں کی جانب دھکا دے دیا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا تھا کانوں کے پھاڑ دینے والے دھماکوں نے اہل علاقہ کو بھی ہوشیار کر دیا تھا کسی نے پولیس کو بھی فون کر دیا۔ نگین کے جب اوسان بحال ہوئے تو اس نے داؤد کو گیٹ کے پاس خون میں لت پت پڑے دیکھا۔

''داؤد یہ کیا ہو گیا داؤد کچھ بولیں۔'' وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ان کے گھر کے باہر مجمع لگ گیا۔ قاتل اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔ ایک ہنستا بستا گھر لمحوں میں اجڑ گیا۔

☆......☆☆......☆

ننھا عمر نگین کی گود میں سو رہا تھا اور وہ خالی خالی آنکھوں سے بیٹھی کھڑکی کے باہر تک رہی تھی۔ جہاں امرود کے درخت پر ننھی ننھی دو گلہریاں بھاگ دوڑ کر رہی تھیں۔ تب فیصل صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور نگین کو صدمے میں دیکھ کر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''بیٹی کیا حال ہے ہمارا بیٹا عمر کیسا ہے؟'' تب وہ مسکرائی۔

''اُف کتنا درد تھا پاپا......'' وہ کرب سے بولی۔

''جی پاپا کی جان۔'' وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے۔

''پاپا میں نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا جو مجھے بچپن میں ماں کا پیار نہیں ملا اور اب داؤد بھی مجھے چھوڑ گئے۔'' اور پھر وہ اپنے پاپا کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رو پڑی۔

''بیٹی تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا ابھی عمر بہت چھوٹا ہے ایک طویل مسافت تمہیں طے کرنی ہے۔ یہ حقیقت ماننا ہوگی کہ تمہیں یہ سفر تنہا طے کرنا ہوگا جیسے میں نے تمہاری ماں کے بعد کیا تھا یہ سچ ہے کہ ہمارے عزیز ترین رشتے ہمیں زندگی کے شروع سفر ہی میں تنہا کر گئے مگر ہم ایک دوسرے کی تنہائی دور کر سکتے ہیں۔ تم عمر کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دو گی اور مجھے بیٹی کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی مل گیا۔ اب ہم تینوں اپنی اپنی زندگیوں کی نئے سرے سے شروعات کریں گے۔ نگین نے باپ کی باتوں پر دھیرے سے سر ہلایا اور ایک نئے عزم کے ساتھ عمر کے ماتھے کو چوم لیا۔ باہر فضا اللہ اکبر کی آواز سے گونج رہی تھی نگین نے عمر کو بستر پر لٹایا اور پاپا سے بولی۔

''پاپا میں نماز پڑھ کر آپ کے لیے چائے بناتی ہوں آپ بھی نماز پڑھ لیں......''

اور فیصل صاحب کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا کیونکہ نگین نے کڑے وقت میں جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ اُسے منزل مقصود تک پہنچانے والا تھا۔

☆......☆☆......☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

منی ناول

نسرین اختر نینا

سپنے سہانے

''ہاں خود تو سارا دن گھر میں فارغ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی رہتی ہو اور میں دن آفس میں سر کھپا کر تھکی ہاری بسوں ویگنوں کے دھکے کھا کر گھر آتی ہوں تو تم سب کی چخ چخ چین نہیں لینے دیتی۔ کہاں جاؤں میں۔'' انیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر سے رونا شروع کر دیا۔ ''راحیلہ تمہیں......

معاشرے کے اُتار چڑھاؤ سے جڑا ایک بہت خاص ناول | پانچواں حصہ

''ٹھیک ہے تب تک میں انتظار کر لوں گی میں کون سا بوڑھی ہو رہی ہوں۔''

''طنز کر رہی ہو مجھ پر...... میری زیادہ عمر کا احساس دلانا چاہتی ہو مجھے۔''

''جو مرضی سمجھ لیں۔''

''خیر فی الحال جو میں کہہ رہا ہوں تم وہی کرو گی۔ آج تو تم نے مجھے بتائے بغیر چھٹی کر لی ہے۔ آئندہ ایسا مت کرنا۔ کل آفس آؤ تاکہ پھر تمہاری نئی ملازمت کے لیے میں کوشش کر سکوں۔''

''مگر کل تو چھٹی ہے سنڈے ہے۔''

''او کے...... پرسوں ہی سہی بہرحال آئندہ مجھ سے اجازت لیے بغیر چھٹی نہیں کرو گی تم سمجھیں۔ اچھا اب تم ریسٹ کرو، اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر حارث نے کال منقطع کر دی۔ اور انیلہ نے موبائل آف کر کے قریب ہی میز پر پڑے پرس میں رکھ لیا۔

☆......☆......☆

''راحیلہ کی بچی میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں کیوں لی تم نے شال...... کل سارا دن اِسے پہن کر بازار میں پھرتی رہیں ساری گندی کر دی۔ پتہ نہیں کیا الم غلم کھاتی ہو۔ اتنے داغ لگا دیے تم نے...... اب تم ہی اِسے دھوگی۔ نئی شال تھی میری۔'' بجیلہ اور راحیلہ آگے پیچھے تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ تو راحیلہ کو بازو سے پکڑ کر بجیلہ نے غصے سے چیخ کر کہا۔

''کیا مصیبت ہے تم لوگوں کو، اس گھر میں تو بندہ سکون کو ترس جاتا ہے۔ پہلے ابا لڑتا رہتا تھا اب تم دونوں نے یہ کام سنبھال لیا ہے۔ بچی تو نہیں ہو تم کوئی اور کام نہیں کیا تمہیں سوائے لڑنے جھگڑنے کے۔'' انیلہ نے اپنے دکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر غصے سے کہا۔

''توبہ ہے آپی تم آج کیا گھر میں رہ گئی ہو شامت ہی آ گئی ہے سارے گھر والوں کی۔'' راحیلہ نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں خود تو سارا دن گھر میں فارغ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی رہتی ہو اور میں دن آفس میں سر کھپا کر تھکی ہاری بسوں ویگنوں کے دھکے کھا کر گھر آتی ہوں تو تم سب کی چخ چخ چین نہیں لینے دیتی۔ کہاں جاؤں میں۔'' انیلہ نے بھرائی ہوئی آواز مین کہا اور پھر سے رونا شروع کر دیا۔

''راحیلہ تمہیں ذرا بھی تمیز نہیں جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہو دیکھ نہیں رہیں آپی کی طبیعت کس قدر

خراب ہے۔ ورنہ تو وہ کبھی چھٹی نہیں کرتیں۔ تم جاؤ جلدی سے چائے بنا کر لاؤ۔ میں آپی کا سر دباتی ہوں'' جمیلہ نے راحیلہ کو ڈانٹا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اور جمیلہ انیلہ کے سرہانے بیٹھ کر اُس کا سر دبانے لگی۔

☆......☆......☆

پیر کو انیلہ آفس گئی تو کچھ دیر بعد ہی حارث آدھمکا۔ اور پھر اُسے اوپر باس کے کمرے میں لے گیا۔ اُس نے شاید پہلے ہی اُن سے بات کرلی تھی۔ اس لیے انہوں نے انیلہ کا استعفیٰ منظور کرلیا۔ بلکہ اُسے پورے ماہ کی تنخواہ بھی دے دی۔ اور اپنی نیک تمناؤں کے ساتھ اُسے رخصت کیا۔ اُن کی اس مہربانی پر بے اختیار انیلہ کا دل بھر آیا۔ اور اُسے احساس ہوا کہ دنیا میں سبھی برے لوگ نہیں باس جیسے فرشتہ سیرت اور نیک نفس انسان بھی ہیں۔ اُس نے اس آفس میں تین سال کا عرصہ نہایت باعزت اور پُرسکون طریقے سے گزارا تھا۔

کبھی کسی نے اُس سے سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ سبھی اُس کا خیال رکھتے اگر وہ پہلے سکندر جیسے اوباش اور پھر حارث کی طرح کے بھیڑیا صفت شخص کے چکر میں نا پڑتی تو اُس کا کچھ بھی نہیں بگڑنا تھا۔ قصور تو اس کا اپنا تھا خوب سے خوب تر کے چکر میں نا صرف اپنی عصمت کے آئینے کو داغ دار کر بیٹھی تھی۔ بلکہ ایک صاف ستھری ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

اُس کے بعد حارث اُسے گلبرگ میں واقع ایک کال سینٹر میں لے گیا۔ اُس کے مالک ایوب شیخ صاحب حارث کے دوست تھے۔ ایک پلازہ کی تیسری منزل میں آفس تھا۔ ایک بڑا سا ہال تھا۔ اُس کے ایک سائیڈ میں کیبن بنے ہوئے تھے۔ ہال کے مرکزی دروازے کے ساتھ ہی ریسیپشن تھا۔ جہاں ایک اسمارٹ سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے سامنے تین چار ٹیلی فون سیٹ پڑے تھے۔ اُس نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ حارث کا استقبال کیا۔

''ہیلو مس ماریہ کیسی ہیں آپ؟'' حارث نے اُس سے کہا۔

''فائن سر تھینکس۔ ایوب صاحب اپنے آفس میں بیٹھے ہیں۔ میں نے انہیں آپ کی آمد کے بارے میں مطلع کردیا تھا آپ تشریف لے جائیں وہاں وہ آپ کے منتظر ہیں۔'' ماریہ نے اخلاق سے کہا۔

''تھیک یو مس ماریہ۔'' یہ کہہ کر حارث ہال کے دوسرے سرے کی جانب چل پڑا۔ اور انیلا سیاہ چادر اپنے گرد لپیٹے، بڑا سا سیاہ پرس کندھے سے لٹکائے اور سیاہ رنگ کی ہی اونچی ہیل والی سینڈل پہنے انیلہ حارث کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

سامنے ہی دروازے پر ایوب صاحب کے نام کی نیم پلیٹ سُنہری حروف میں لگی ہوئی تھی۔ حارث نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

''ییس کم اِن۔'' کسی نے اندر سے کہا تو حارث دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ جس پر نیلے رنگ کے بلائنڈرز لٹکے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے قریب ہی سیاہ رنگ کی آفس ٹیبل تھی۔ جس کے ساتھ ریوالونگ چیئر پر ایک گہرے سانولے رنگ کا لحیم شحیم شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ اُڑ چکے تھے عمر کی تقریباً چالیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ سرمئی رنگ کے تھری پیس سوٹ اور نیوی بلیو دھاریوں والی ٹائی میں اُس کی شخصیت خاصی بارعب لگ رہی تھی۔

''آؤ بھئی حارث کیسے ہو یار بڑے دنوں بعد چکر لگایا؟'' ایوب صاحب نے کھڑے ہوکر حارث سے پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''بس کیا کریں مصروفیات ہی ایسی ہیں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔'' حارث نے میز کے دائیں طرف پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور انیلہ کو اُس نے ایوب صاحب کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ایک روبوٹ کی طرح بیٹھ گئی۔

''ایوب بھائی یہ انیلہ ہے میری منگیتر...... بس اسے اپنے آفس میں ایڈجسٹ کرلیں۔ اس نے میٹرک پاس کیا ہے۔ پچھلے تین سال سے ایک کمپنی میں ٹیلی فون آپریٹر کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ چونکہ وہاں سیلری کم تھی۔ اس لیے میں نے سوچا اسے

آپ کے پاس لے آؤں۔"

"یار اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں میں نے فون پر کہہ دیا تھا کہ تمہارا کام ہو جائے گا۔" اور پھر اُس نے انیلہ کو مخاطب کیا۔

"مس انیلہ میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ میرے اسٹاف کا حصہ بن رہی ہیں۔ آپ کے کام کی نیچر تو وہی ہے جو پچھلی کمپنی میں تھی۔ البتہ ٹائم کا مسئلہ ہوگا۔ آپ کے گھر والوں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ واپسی کی آپ فکر نہ کریں آفس کی گاڑی دوسری لڑکیوں کے ساتھ آپ کو بھی ڈراپ کر دیا کرے گی۔"

اس سے پہلے کہ انیلہ کچھ کہتی حارث جلدی سے بولا۔

"میں نے اِس کے گھر والوں سے بات کر لی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں پھر میں جو اُس کا ہونے والا شوہر ہوں۔ وہ رضامند ہے تو کسی اور کا اس سلسلے میں کچھ کہنے سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے۔ مس انیلہ آپ جانے سے پہلے ریسپشن سے اپنا اپائمنٹ لیٹر لیتی جایئے گا۔ مس ماریہ آپ کو کام کے بارے میں بھی بریف کر دیں گی۔ میں آفس بوائے کو بلا رہا ہوں۔ آپ اُس کے ساتھ مس ماریہ کے پاس چلی جایئے۔" یہ کہہ کر ایوب صاحب نے اپنے سامنے ٹیبل کے ساتھ لگی گھنٹی کا بٹن پش کیا۔

تھوڑی دیر بعد گرے پینٹ اور سفید شرٹ پہنے ایک اسمارٹ سا نوجوان لڑکا آفس میں داخل ہوا۔

"فاروق یہ مس انیلہ ہیں ہماری نئی ٹیلی فون آپریٹر انہیں مس ماریہ کے پاس لے جاؤ۔ اور کچن میں کہہ دو کہ چائے بھیج دیں۔ ساتھ کچھ کھانے کو بھی ہو۔ مس انیلہ کو وزیٹرز روم میں چائے سرو کر دینا۔" ایوب صاحب نے آفس بوائے کو حکم دیا۔

"جی بہتر سر......" فاروق نے کہا۔ اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے انیلہ بھی باہر آ گئی۔ فاروق اُسے ماریہ کے پاس چھوڑ کر خود کچن کی جانب چلا گیا۔ ماریہ نے انیلہ کو اُس کی ٹائمنگ، اُس کی ڈیوٹی کے بارے میں سمجھایا۔ اور پھر کسی کو فون پر ہدایت دی کہ مس انیلہ کا اپائمنٹ لیٹر تیار کر دے۔ اس کے بعد انیلہ سے مخاطب ہوئی۔

"ویل کم مس انیلہ...... آپ ہماری ٹیم کا حصہ بن گئی ہیں۔ آپ دائیں سائیڈ پر وزیٹرز روم میں بیٹھیں۔ کچھ دیر میں آپ کا اپائمنٹ لیٹر آپ کو مل جائے گا۔ آپ یہ فارم فل کر دیں۔ اس کے ساتھ اپنے ڈاکومنٹس کی فوٹو کاپیاں اٹیچ کر دیں۔ آئی ڈی کارڈ کی کاپی بھی ہو تو وہ بھی لگا دیں ساتھ۔"

"میرے پاس ڈاکومنٹس تو نہیں ہیں۔ دراصل آج تو میں صرف انٹرویو دینے کے لیے آئی تھی۔" انیلہ نے کہا۔

"چلیے کوئی بات نہیں فی الحال یہ فارم فل کر دیں۔" انیلہ ماریہ سے سفید رنگ کا فارم لے کر وزیٹرز روم میں آ گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں براؤن رنگ کا کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ کھڑکی پر براؤن رنگ کے بلائنڈز تھے۔ جبکہ دو تین ٹو سیٹرز صوفے پڑے تھے۔

انیلہ وہاں بیٹھ کر فارم فل کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک آفس بوائے ایک ٹرے میں چائے کا کپ اور بسکٹس کی پلیٹ لے آیا۔ انیلہ چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لے کر ساتھ بسکٹس کھانے لگی۔ صبح اُس نے ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔ اور اب دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ بھوک سے اِس کا برا حال ہو رہا تھا۔ چائے اور بسکٹس سے کچھ بھوک کی شدت میں کمی ہوئی تو اُس نے اطمینان سے فارم فل کیا۔ اور ریسپشن پر جا کر ماریہ کو دے آئی۔ اور واپس وزیٹرز روم میں آ کر سامنے سینٹر ٹیبل پر پڑے اخبار کو دیکھنے لگی۔

"تقریباً آدھے گھنٹے بعد حارث ایوب صاحب کے آفس سے باہر آیا۔ اور وہ اُس کے ہمراہ ماریہ کے پاس گئی۔ جس نے ایک سفید رنگ کے لفافے میں اُس کا اپائمنٹ لیٹر اُس کے حوالے کیا۔ اور اُسے تاکید کہ وہ کل لازمی اپنی ڈاکومنٹس کی فوٹو کاپیاں لیتی آئے۔ انیلہ ماریہ کو خدا حافظ کہہ کر آفس کی لفٹ کے ذریعے نیچے آئی تو اس اثناء میں حارث گاڑی انڈر گراؤنڈ پارکنگ سے باہر لے آیا تھا۔

"آپ نے ایوب صاحب سے یہ کیوں کہا کہ آپ میرے منگیتر ہوں۔" جب گاڑی مین روڈ پر

آ گئی تو انیلہ نے حارث سے کہا۔

"کوئی غلط کہا ہے میں نے شادی تو ایک دن ہم نے کرنی ہی ہے اس طرح تمہیں یہاں زیادہ عزت ملے گی۔ اگر میں یہ کہتا کہ یہ میری گرل فرینڈ ہے تو تمہارا تاثر اچھا نا پڑتا۔" حارث نے سنجیدگی سے کہا۔

"اب اپنی بات پر قائم رہیے گا کہ آپ مجھ سے شادی کریں گے۔" انیلہ نے کہا۔

"ارے بابا میں نے کب انکار کیا ہے شادی سے میں تو تم سے شادی کے لیے کب سے مرا جا رہا ہوں۔ تم ہی راہِ راست پر نہیں آ رہی تھیں۔ خیر چھوڑو اس بات کو کیا کھاؤ گی بھوک تو لگی ہوگی؟" حارث نے موضوع بدل کر کہا۔

"نہیں کوئی خاص نہیں۔ آفس میں چائے پی لی تھی۔ ساتھ بسکٹ بھی تھے آپ مجھے بس آنٹی سعدیہ کے پارلر کے قریبی بس اسٹاپ پر اُتار دیں۔ میں اُن سے پارلر پر کام شروع کرنے کے بارے میں بات کرلوں۔" انیلہ نے مزید وقت حارث کی کمپنی میں گزارنے کے بجائے بہتر سمجھا کہ وہ سعدیہ بیگم کے پارلر پر چلی جائے۔

"او کے ایز یو وِش...... کل ٹھیک دو بجے میں تمہیں یہیں سے پک کرلوں گا۔" حارث نے گاڑی انیلہ کے بتائے ہوئے راستے کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر بعد حارث نے گاڑی سعدیہ بیگم کے پارلر کے قریبی بس اسٹاپ پر روک دی۔ انیلہ گاڑی سے اتری۔ چادر اچھی طرح اوڑھ کر وہ پارلر کی جانب چل پڑی۔ جب وہ پارلر میں داخل ہوئی۔ تو سعدیہ بیگم کاؤنٹر پر اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"اسلام علیکم سعدیہ آنٹی کیسی ہیں آپ؟"

"آؤ...... آؤ انیلہ کیسے آنا ہوا آج۔ آفس سے چھٹی کی ہے کیا؟" سعدیہ بیگم نے تپاک سے کہا۔

"نہیں میں نے آفس چھوڑ دیا ہے۔ اب میں صبح دس بجے سے دوپہر کے دو بجے تک آپ کے پاس ہی کام کیا کروں گی۔" انیلہ نے قریب پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اچھا ہے جو تم نے آفس میں جانا چھوڑ دیا ہے وہاں تھک جاتی تھیں تم۔" سعدیہ بیگم نے کہا۔

"آفس پرانا چھوڑا ہے اب نئی جاب ایک کال سینٹر میں ملی ہے۔ اس کے ٹائمنگ شام پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک ہیں۔"

"ہائیں...... انیلہ بیٹی تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ صبح یہاں آؤ گی۔ یہاں سے پھر کال سینٹر میں رات گئے تک سر کھپاؤ گی۔ اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ اتنی محنت کر کے۔" سعدیہ بیگم نے ڈانٹنے والے انداز میں انیلہ سے کہا۔

"بس آنٹی جی کیا کروں، مجبوری ہے۔" انیلہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ تو جواب میں سعدیہ بیگم خاموش ہوگئیں۔ وہ سمجھیں کہ شاید اُس کے لالچی باپ نے اُسے دو دو جگہ کام کرنے کے لیے مجبور کیا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ باپ کی بجائے ایک اور سنگدل اور بے رحم شخص نے اس مظلوم لڑکی کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا ہے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انیلہ سعدیہ بیگم سے رخصت ہوکر بس اسٹاپ پر آ گئی۔ اور وہاں سے اپنے گھر کی جانب جانے والی بس میں بیٹھ گئی۔ شکر ہے کہ یہاں سے ایک ہی بس سیدھی اُس کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

گھر جا کر جب اُس نے صغریٰ کو اپنی نئی ملازمت اور سعدیہ بیگم کے پارلر پر کام کرنے کے بارے میں بتایا۔ تو اُس نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا کہ وہ ہرگز اُسے اس خودکشی کی اجازت نہیں دے گی۔ مگر جب انیلہ نے کہا کہ اُسے نا صرف ملازمت مل گئی ہے بلکہ سعدیہ بیگم سے بھی وہ بات کر آئی ہے۔ تو بے چاری صغریٰ خاموش ہوگئی۔

رات کو صدیق گھر آیا تو انیلہ نے اُس کے کمرے میں جا کر اُسے اپنا اپائنٹمنٹ لیٹر دکھاتے ہوئے اُسے نئے آفس اور اُس کے ٹائم کے بارے میں بتایا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں گالی دے کر بولا۔ "پہلے ہی سارا دن گھر سے باہر رہتی ہو ملازمت کے بہانے اب آدھی رات کو بھی باہر رہنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا ہے تم نے۔ رات کو تمہیں لینے کون جایا کرے گا۔ میرے پاس نا وقت

ہے نا مجھ میں ہمت ہے کہ سارا دن دکان میں مغز ماری کروں اور رات کو تمہیں ڈھونڈنا شروع کر دوں۔''

''ابا اس دفتر کا ماحول بھی بہت اچھا ہے۔ اور تنخواہ بھی دگنی ہے۔ پھر میں دن کو سعدیہ آنٹی کے پارلر میں بھی کام کروں گی۔ وہاں سے بھی کافی پیسے مل جایا کریں گے۔ اس طرح ہماری آمدنی بڑھنے سے ہمارے کئی مسئلے حل ہو جائیں گے۔ جمیلہ اور راحیلہ جوان ہو رہی ہیں۔ اُن کی شادیاں کرنی ہیں ظفر اور اظہر کو آگے پڑھانا ہے۔ یہ سب پیسے ہی سے ممکن ہو سکے گا۔ میرے آنے جانے کی فکر نہ کریں آپ، میں بس پر چلی جایا کروں گی واپسی پر دفتر کی گاڑی چھوڑ دے گی۔

انیلہ نے تفصیل سے حالات بتائے تو صدیق دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔ مگر بظاہر کھردرے لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے جو مرضی کرو میرا سر نہ کھاؤ۔ میں پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' پھر اُس نے کہا۔

''شہزادی کھانا لاؤ میرے لیے لڑکی تم جاؤ اب یہاں سے۔'' اُس نے انیلہ کو نفرت سے گھورتے ہوئے کہا اور وہ چپکے سے کمرے سے نکل آئی۔

☆......☆......☆

''یہ تم کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہو؟'' وہاب احمد نے سامیہ کو تیار ہوتے دیکھ کر استفسار کیا۔

''حرا نے بلایا تھا اسی کی طرف جا رہی ہوں۔ اور میں نے کہاں جانا ہے۔'' سامیہ نے بالوں کو پونی ٹیل کی صورت میں سیٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ آخر تم روز روز حرا کے گھر کے چکر کیوں لگاتی رہتی ہو؟''

''روز روز کب جاتی ہوں۔ کبھی مہینے میں ایک دو مرتبہ جب کوئی ضروری کام ہو، ورنہ میرے پاس ٹائم ہی کہاں ہوتا ہے۔ دراصل اگلے ماہ اُس کے بھائی کی شادی ہے اور اُس سلسلے میں شاپنگ کرنا چاہتی ہے۔ ہانیہ کی منگنی کے موقع پر اُس نے میری بہت مدد کی تھی۔ تو اب اُس کا وقت آیا ہے تو میرا بھی کچھ فرض بنتا ہے نا۔''

سامیہ نے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی تم حرا ہی سے ملنے جاتی ہو؟'' وہاب نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب آپ کا؟ وہاں اور ہے ہی کون، حرا میری بچپن کی گہری دوست ہے۔ میری ساری فرینڈز ایک طرف اور وہ ایک طرف۔'' باڈی اسپرے کی بوتل ڈریسنگ پر رکھ کر کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ حرا تو کبھی ہمارے ہاں نہیں آئی۔ یہ فرینڈ شپ کچھ ون سائیڈڈ نہیں ہے۔'' وہاب نے بدستور مشکوک انداز میں جرح کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کونسی بات ہے بھلا...... حرا جانتی ہے کہ میں میرڈ ہوں۔ تو وہ اچھا نہیں سمجھتی یہاں آنا کہ کہیں آپ مائنڈ نہ کریں۔''

''مگر تمہاری دوسری فرینڈز تو اکثر آتی رہتی ہیں اُن کے لیے تو میں مائنڈ نہیں کرتا۔ میں نے کبھی تم پر بند تو نہیں لگائی کہ تم اپنی فرینڈز کو گھر میں نا بلاؤ۔''

''یہ آخر آپ کو ہوا کیا ہے آج...... کیوں جاسوسوں کی طرح سوال وجواب کیے جا رہے ہیں۔ آپ کو میرے کردار پر شک ہے کیا؟ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں ہوش سنبھالنے سے پہلے تو آپ مجھے بیاہ کر لے آئے تھے۔ پھر پڑھائی گھر داری اور بچوں کی مصروفیات نے مجھے اتنی مہلت ہی نا دی کہ میں کچھ اور سوچ سکتی۔ اور اگر مہلت ہوتی بھی تو میں ایسا ہرگز نا کرتی۔ ہمارے والدین نے دولت نہیں کمائی مگر اپنے بچوں کو رزق حلال کھلایا ہے اور اُن کی تربیت بہت سخت اصولوں پر کی ہے۔ تبھی ہم تینوں بہنوں کے رشتے کم عمری ہی میں والدین کی مرضی اور پسند سے ہوئے ہیں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ مگر اپنے کردار پر کسی کو انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' سامیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ تو چور کی داڑھی میں تنکا والی بات ہوگی۔ میں نے تو تمہارے کردار کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔'' وہاب نے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔

''پھر آپ یوں مجرموں کی طرح مجھ سے پوچھ گچھ

کیوں کر رہے ہیں؟'' سامیہ نے کہا۔

''اس لیے کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حرا کے گھر تم کس سے ملنے جاتی ہو؟''

''کس سے ملنے جاتی ہوں میں بتائیں ذرا؟'' سامیہ نے وہاب کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ جو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے شام کی چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے مسلسل اُسے اپنی تیز نظروں کے حصار میں لیے سوال پر سوال کیے جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تو سنو...... میری معلومات کے مطابق تم وہاں ڈاکٹر عدیل سے ملنے جاتی ہو۔ وہ ہر لمحہ وہاں موجود ہوتا ہے۔ تم گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھی اُس سے باتیں کرتی رہتی ہو۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے تمہارے چہرے کے ایسے تاثرات ہوتے ہیں جیسے کونین کھالی ہے جبکہ اُس غیر مرد کے ساتھ قہقہے لگ رہے ہوتے ہیں۔ اُس سے دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں کر رہی ہوتی ہو۔''

''آپ...... آپ اس حد تک گر جائیں گے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' وہاب احمد کی بات پوری ہونے سے قبل ہی سامیہ نے چیخ کر کہا۔

''اس میں گرنے کی کیا بات ہے میں تمہارا شوہر ہوں تم میرے بچوں کی ماں ہو۔ میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں خبر رکھوں کہ میری بیوقوف سی کم عمر بیوی کہاں جاتی ہے کس سے ملتی ہے۔''

''اگر آپ مجھے بیوقوف اور کم عمر کہتے ہیں تو مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی۔ کر لیتے اپنی کسی ہم عمر عقل مند عورت سے شادی، میں نے یا میرے والدین نے آپ کی منتیں تو نا کی تھیں۔ خود ہی پیچھے پڑ گئے تھے۔'' سامیہ نے غصے سے بلبلا کر کہا۔

''یہی تو میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی تم نے شوہر سمجھا ہی کب ہے۔ نا مجھے وہ عزت اور احترام دیتی ہو جو ایک شوہر کے حق ہوتا ہے۔ نا تمہیں بچوں سے لگاؤ ہے نا ہی گھر پر توجہ دیتی ہو۔ پڑھائی کی آڑ میں دن بھر گھر سے باہر رہتی ہو۔ اور ویک اینڈ پر سہیلیوں کے ساتھ سیر سپاٹے کرنے یا پھر ماں کے گھر چلی جاتی ہو۔ میں تمہاری پڑھائی اور دیگر اخراجات پر پانی کی طرح پیسہ بہا رہا ہوں۔ اور تم ہو کہ بجائے میرا احسان مند ہونے کے...... غیر مردوں کے ساتھ عشق کی پینگیں چڑھا رہی ہو۔ دنیا کا کوئی بھی شوہر یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ اتنے سالوں سے تمہاری بدتمیزی کے باوجود تم سے نبھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر اب یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ چھوڑو یہ پڑھائی کا چکر اور گھر بیٹھ کر بچوں کی دیکھ بھال کرو اور گھر کو سنبھالو بہت ہو گیا۔ ''Engough Is Engough'' وہاب احمد نے چائے کا خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر حتمی لہجے میں کہا۔

''سوری مسٹر وہاب احمد میں اس مرحلے پر اپنی تعلیم ادھوری نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ نے شادی سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ میری تعلیم مکمل ہونے تک آپ مجھ پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں لگائیں گے۔ اور اب جبکہ محض دو سال ہی رہ گئے ہیں میری تعلیم کے اور آپ جھوٹے بہانے بنا کر مجھے گھر بٹھانا چاہتے ہیں۔ جو مجھے ہرگز قبول نہیں۔''

''اگر تو تم سیدھے راستے پر چلتی رہتیں۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دو کی بجائے تم مزید چار سال تک پڑھتی رہتیں۔ مگر میں ایک شریف اور غیرت مند شخص ہوں۔ اور یہ بات میرے لیے ذلت آمیز ہے کہ میری بیوی اور میرے تین بچوں کی ماں غیر مردوں سے دوستیاں کرتی پھرے۔''

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ آج آپ کو ہو کیا گیا ہے کس نے آپ کو میرے خلاف ورغلایا ہے۔ میں کبھی کبھار اپنی دوست حرا کے گھر ضرور جاتی ہوں۔ وہ بھی میری امی کے گھر ہمیشہ سے آ رہی ہے بلکہ ہم ایک دوسرے کے گھروں میں رات کو بھی رہ جایا کرتی تھیں اور ہم دونوں کے والدین نے بھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ رہی بات ڈاکٹر عدیل خاں کی تو وہ حرا کا کزن ہے۔ یہاں چونکہ ہاسٹل میں رہتا ہے۔ اس لیے اکثر اُس کے گھر آ جاتا ہے۔

وہ ایک پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا دولت مند گھر کا فرد ہے۔ اُسے ہزاروں لاکھوں نوجوان خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اُس کی شادی حرا ہی سے ہو جائے۔ اُسے مجھ جیسی متوسط طبقے کی ایک

شادی شدہ عام سی شکل وصورت کی تین بچوں کی ماں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ جب میں حرا کے گھر جاتی ہوں تو وہ بھی آیا ہوتا ہے ظاہر ہے جہاں سارے گھر والے بیٹھے ہوں وہاں ہی مجھے بیٹھنا پڑتا ہے۔ چونکہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اس لیے میری پڑھائی کے بارے میں وہ ایک آدھ بات مجھ سے کرلیتا ہے۔ تو اس میں حرج کیا ہے۔ کالج میں بھی تو میرے مرد اساتذہ ہیں۔ وہ بھی مجھ سے خاصا سینئر ہے۔ سوائے میڈیکل پروفیشن کے اور ہم نے کبھی کسی موضوع پر بات نہیں کی۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تا تو آپ حرا کو فون کر کے پوچھ لیں میں یہ سب وضاحت آپ کو اس لیے دے رہی ہوں کہ میں یہ مرکر بھی برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی اس طرح میرے کردار پر کیچڑ اچھالے" سامیہ نے نم آنکھوں سے اپنی طویل بات ختم کی۔

"مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ثبوت ہے تو میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں چھ ماہ پہلے میں نے ہی ڈرائیور حنیف کو کہا تھا کہ وہ اپنی بہن کو گاؤں سے بلوا کر تمہاری وساطت سے حرا کے گھر میں ملازمت دلوائے۔ کیونکہ تمہارے حرا کے گھر روز روز جانے اور پھر ڈرائیور کے، وہاں عدیل خان نامی ایک ڈاکٹر کے ہر وقت موجود ہونے پر مرا ماتھا ٹھنکا تھا کچھ معلومات ڈرائیور نے حرا کے مالی سے لی تھیں۔ اور پھر باقی سارا کچا چٹھا اُس کی بہن نے معلوم کیا اب آیا محترمہ کی سمجھ میں کہ میں کیوں اِس قدر مشتعل ہوں۔" وہاب نے کڑے تیوروں سے سامیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"او کے...... یہ بات ہے...... تا تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ چونکہ میرے کردار کے بارے میں بدگمان ہو چکے ہیں اور میں ایسے شخص کے ساتھ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رہ سکتی۔ جو میرے کردار کے بارے میں ملازموں کے ذریعے چھان بین کرواتا پھرتا ہو جسے مجھ سے زیادہ اپنے ملازموں پر اعتماد ہو اس لیے میں جا رہی ہوں یہاں سے، رکھو اپنے بچوں کو اپنے پاس، طلاق بھجوا دینا۔ میں اب یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔" یہ کہہ کر سامیہ نے اپنی کتابیں، چند جوڑی کپڑے اور دیگر ضروری چیزیں ایک

بڑے سے بیگ میں ڈالیں۔ اور پھر ٹیکسی منگوا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاب احمد کی زندگی سے نکل گئی۔

وہاب ایسے شخص کی طرح اُسے جاتے دیکھتا رہا جو تیر نشانے پر لگنے کے بعد گومگو کی کیفیت میں ہو۔ اُس نے اُسے روکنے کی کوشش کی نا ہی کسی قسم کی معذرت کی ضرورت محسوس کی۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ وہ اُس وقت غصے میں ہے۔ فی الحال جانے دو، بعد میں جب غصہ اُتر جائے گا تو پہلے کی طرح خود ہی لوٹ آئے گی کہ پہلے بھی اسی طرح کئی بار وہ لڑ جھگڑ کر ماں باپ کے گھر چلی جاتی تھی۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد والدین کے سمجھانے بجھانے اور وہاب احمد کے ترلے منتوں کے بعد واپس آجاتی تھی۔ مگر یہ اُس کی غلطی تھی۔ اُس نے اُس کے کردار کے بارے میں رکیک زبان استعمال کر کے اور اُس کی جاسوسی کر کے ایسی حرکت کی تھی جس کی وجہ سے سامیہ کی اُس سے نفرت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ اور وہ کسی بھی طرح سمجھوتہ نا کرنے کے ارادے سے گئی تھی۔

☆......☆......☆

کئی روز تک سعدیہ بیگم نے سامیہ سے نا پوچھا کہ وہ کیوں کر بغیر بچوں کے اتنے دنوں کے لیے اُن کے ہاں آئی ہے۔ پہلے انہوں نے خیال کیا کہ شاید امتحان کی تھکان اُتارنے کی غرض سے آئی ہو مگر جب وہاب احمد نے نا کوئی فون کیا نا ہی خود آیا۔

دوسرے سامیہ بھی چپ چاپ اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑی جانے کن سوچوں میں مستغرق رہتی۔ نا کمرے سے باہر نکلتی نا کپڑے بدلتی نا کہیں آتی جاتی...... ایک دو بار حرا کا فون آیا تو اُس نے اِس سے بھی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر بات کرنے سے انکار کر دیا تو سعدیہ بیگم کا ماتھا ٹھنکا چنانچہ ایک رات کو وہ ضروری کام نمٹا کر اُس کے کمرے میں آئیں تو وہ ملگجے کپڑوں اور بکھرے بکھرے بالوں کے ساتھ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر زردیاں کھنڈی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ سوجھے ہوئے پپوٹے اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ وہ کئی راتوں سے سوئی نہیں۔ آنکھوں کی سرخی اُس کے بے تحاشا رونے کی نشان دہی کر رہی تھی۔

سعدیہ بیگم گھرداری اور پارلر کی مصروفیات میں اُلجھی رہتیں۔ باقی بچے بھی اپنی پڑھائی میں مصروف تھے۔ کیونکہ سبھی کے امتحانات ہو رہے تھے۔ باپ کی کاروباری مصروفیات تھیں۔ اس لیے سامیہ کی جانب دھیان دینے کی کسی کو بھی فرصت نہیں تھی۔ اور وہ اپنی ہی آگ میں دھیرے دھیرے گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی۔ مگر کسی سے بھی اپنا دکھ بیان نہیں کر سکتی تھی۔ دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ وہ ٹوٹ کر رہ گئی تھی اور اپنے کرچی کرچی وجود کو سمیٹنے کی تگ و دو میں اُس کی ساری حسیات فگار ہو چکی تھیں۔ رو رو کر آنکھوں سے اشک بھی خشک ہو چکے تھے۔ وہ عجیب سی خود ترسی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اور اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ حالات اُسے جس نہج پر لے آئے تھے۔ اُس سے کیسے نبرد آزما ہو۔

اپنی چہیتی بیٹی کی یہ اجاڑ حالت دیکھ کر سعدیہ بیگم دل مسوس کر رہ گئی تھیں۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی کہ اُن کی ہنستی کھیلتی زندگی سے بھرپور بیٹی یوں کسی کلی کی طرح مرجھا کر رہ گئی ہے۔

''سامی میری چندا! میری جان بتاؤ نا کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' سعدیہ بیگم نے سامیہ کے بیڈ پر بیٹھ کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھ کر پیار سے پوچھا۔ تو وہ کسی بھرے ہوئے پھوڑے کی طرح پھوٹ پڑی اور ماں کی گود میں سر چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

''کیا ہوا میری پیاری گڑیا کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہو؟ کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟'' سعدیہ بیگم نے سامیہ کے کئی روز سے کنگھی اور شیمپو سے ناآشنا کھردرے اُلجھے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''امی...... امی...... آپ کی لاڈلی بیٹی کو آپ کے چہیتے داماد نے جیتے جی مار ڈالا۔''

''آخر پوری بات تو بتاؤ۔ کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو'' سعدیہ بیگم نے اُلجھ کر کہا۔ اور پھر جواب میں ہچکیوں کے ساتھ سامیہ نے ساری بات بتا دی۔

''ک...... کیا......؟ اتنا کچھ اُس شخص نے تمہیں کہہ ڈالا۔ جس...... نے ایک طرح سے ہمارے پاؤں پڑ کر تمہارا رشتہ مانگا تھا۔ یہی تھی اُس کی محبت اور چاہت [illegible]

کا ایک باشعور شخص ہو کر وہ اس حد تک گر سکتا ہے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس کی جرأت کیسے ہوئی تم سے اِس طرح کی بکواس کرنے کی۔ اور تم...... جو ڈاکٹر بننے جا رہی ہو اور تم میں عقل کی ذرا بھی رمق موجود نہیں تم نے فوراً ہی کیوں نہیں بتایا مجھے...... ایک ہفتے سے یوں مُردوں کی طرح بے سدھ پڑی ہو۔'' سعدیہ بیگم کا غصے اور صدمے سے اس قدر برا حال ہوا کہ وہ اُلٹا سامیہ ہی کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگ پڑیں۔

''میں کیا کرتی امی...... مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں آپ لوگوں کو کیسے اصل صورتِ حال سے آگاہ کروں۔ پھر اتنے گھناؤنے الزام پر میں تو خود اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ میں پتہ نہیں کیسے گھر تک پہنچ پائی تھی۔''

''تمہارے پاپا آتے ہیں تو میں اُن سے بات کرتی ہوں کہ اُس ذاتِ شریف کا مزاج درست کریں۔ کچھ زیادہ ہی اپنے آپ کو سمجھنے لگ گیا ہے۔ پیسے والا ہے تو ہو ہمیں کیا پروا ہے ہم کون سا اُس کا دیا کھاتے ہیں۔ جو یوں اُس کی ہر غلط بات برداشت کریں۔ ہماری بیٹی گری پڑی ہے نا ہم پر بوجھ ہے۔ جو اُسے یوں ذلیل کرتا پھرتا ہے۔'' سعدیہ بیگم نے دکھی لہجے میں کہا۔

''امی مجھے پاپا سے کوئی امید نہیں کہ وہ وہاب کو کچھ کہیں گے۔ وہ اُلٹا مجھے ہی الزام دیں گے مگر ایک بات میں آپ لوگوں سے صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں کہ اب میں مر کر بھی اِس گھٹیا شخص کے گھر میں نہیں جاؤں گی اگر آپ لوگوں نے مجھے پناہ نہ دی اور اُس کے گھر میں جانے پر مجبور کیا تو میں یہ گھر بھی چھوڑ دوں گی، سنا آپ نے۔'' سامیہ نے اپنے آنسو صاف کر کے پُرعزم لہجے میں کہا۔

پھر جب سعدیہ بیگم نے عظیم صاحب سے بات کی تو اُن کا ردِعمل وہی تھا۔ جس کا سامیہ نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

''دیکھو بیگم جب تک ہم وہاب سے بات کر کے اصل حقائق نہیں جان لیتے تب تک ہمیں منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں نکالنی چاہیے جس سے مسئلہ سنبھلنے کے بجائے مزید اُلجھ جائے۔''

''مگر آپ سامیہ کی حالت تو دیکھیں۔ اُس نے رو

روکر اپنا برا حال کرلیا ہے۔ اور وہ صاف کہہ رہی ہے کہ وہ اب کسی صورت بھی وہاب احمد کے گھر واپس نہیں جائے گی۔" سعدیہ بیگم نے دھیرج سے کہا۔

سامیہ کا کیا ہے وہ تو اُس وقت سے رو رہی ہے۔ جب سے ہم نے اُس کی مرضی کے بغیر شادی کی ہے۔

"آپ تو اپنی ہی اولاد کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ سامیہ نے پہلے کبھی اس قدر شدید ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اتنے سالوں سے وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر داری اور بچوں کی ذمہ داریاں نبھا رہی ہے۔ اُس نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ اُسے دکھ تو اس بات کا ہے کہ وہاب نے ایک ملازمہ کی الٹی سیدھی باتوں میں آ کر اُس کی کردار کشی کی ہے اور دنیا کی کوئی عورت بھی اپنے کردار کے بارے میں غلط بات برداشت نہیں کرسکتی۔" سعدیہ بیگم نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"بہرحال جو بھی ہے۔ میں جب تک وہاب احمد سے خود اس سلسلے میں بات نہیں کرلیتا۔ کوئی بھی حتمی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تم بھی اپنے جذبات کو ذرا کنٹرول کرو۔ پانچ پانچ بیٹیوں کی ماں ہو، ہانیہ اور سمعیہ کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ اگر بڑی بیٹی یوں شوہر اور بچوں کو چھوکر میکے میں آ بیٹھی تو اُن دونوں بہنوں کے سسرال والے کیا سوچیں گے؟"

میاں بیوی کے درمیان شکر رنجی ہوتی ہی رہتی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان سب کچھ چھوکر بیٹھ جائے۔ ابھی تو اُس کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔ ہمارے اتنے وسائل نہیں کہ ہم اُس کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرسکیں پھر اُس کے بچوں کا کیا بنے گا۔ وہ بے چارے تو رُل جائیں گے کیا وہ یہ برداشت کرے گی کہ اُس کے بچے سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سہہ کر پروان چڑھیں۔ بیگم تم آرام آرام سے سامیہ کو سمجھاؤ۔ اُسے اونچ نیچ بتاؤ۔ یقیناً وہ سمجھ جائے گی۔" اور یہ کہہ کر عظیم صاحب یوں آرام سے سوگئے جیسے کوئی بات ہی نا ہوئی ہو۔ جبکہ سعدیہ بیگم کی ساری رات آنکھوں ہی میں کٹ گئی۔ یہی حال سامیہ کا تھا۔

دوسرے دن عظیم صاحب وہاب احمد سے ملنے کے لیے گئے اور کافی دیر بعد لوٹے تو تینوں بچے اور وہاب احمد اُن کے ہمراہ تھے۔ وہاب احمد نے عظیم صاحب اور سعدیہ بیگم کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اُن سے معافی مانگی کہ وہ آئندہ سامیہ کو اُف تک نہیں کہیں گے۔

جیسے ہی سامیہ کو وہاب احمد کی آمد کی خبر ملی۔ وہ چپکے سے گھر سے نکل کر اپنے کالج کے ہاسٹل میں اپنی دوست ماہ رخ کے پاس چلی گئی۔ پھر والدین کی منتوں اور سمجھانے بجھانے کے باوجود سامیہ کی ناں ہاں میں نا بدل سکی۔ اُس کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ وہاب احمد کے ساتھ نہیں رہے گی خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ ماں باپ نے بہنوں کے مستقبل اور اپنی عزت کے واسطے دیے مگر اُس کا دل پتھر ہو چکا تھا۔

اُس نے صاف کہہ دیا کہ "میں نے بہت قربانیاں دی ہیں اب میں اپنی ذات کو کسی کے احسانات کا بدلہ چکانے، کسی کی عزت بچانے یا بہنوں کے مستقبل کی کاطر مزید اذیتوں کی سولی پر نہیں چڑھا سکتی۔ وہاب احمد نے بھی بہت رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر اُس نے صاف کہہ دیا کہ اس کا ایسے شکی مزاج شخص سے کوئی تعلق واسطہ نہیں جواب میں وہاب احمد نے دھمکی دی کہ وہ اُس کی تعلیم کے اخراجات نہیں دے گا۔

"نا دے مجھے کوئی پرواہ نہیں۔" سامیہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تمہیں تمہارے بچے بھی نہیں ملیں گے۔" اُسے پیغام پہنچایا گیا۔

"نا ملیں۔ اُس خودغرض شخص کے بچوں سے مجھے کوئی غرض نہیں۔" اُس کا جواب تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ مجھ سے طلاق لے کر تم اپنے عاشق سے بیاہ رچا لوگی۔" وہاب احمد نے دھمکی دی۔

"تم مجھے پہلے ہی نکاح نامے میں طلاق کا حق دے چکے ہو اس لیے میں جب چاہے تم سے عدالت کے ذریعے طلاق لے سکتی ہوں" سامیہ نے جواب دیا۔

وہاب احمد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا جب اُس نے پتہ نہیں کس رو میں آ کر نکاح نامے میں اُس شق کو نہیں کاٹا تھا جس کے تحت عورت کو خود بخود طلاق کا حق مل جاتا ہے پھر اُس نے سوچا کہ جب سامیہ اُس کے ساتھ رہنا

ہی نہیں چاہتی تو اس زبردستی کے بندھن کو قائم رکھنے کا کوئی جواز بھی نہیں اس کے پاس...... ویسے بھی عدالتوں میں خوار ہونے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ خود ہی اُسے طلاق دے دے اس صورت میں وہ بچوں اور حق مہر سے دستبردار ہونے کو تیار تھی۔

☆......☆......☆

''مبارک ہو عالی کے ابا...... آپ دادا بن گئے ہیں۔'' مبارک احمد گھر میں داخل ہوئے تو عفیرہ بیگم نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ارے بھئی تمہیں بھی مبارک ہو خیر سے تم بھی دادی کے رتبے پر فائز ہو گئی ہو۔'' مبارک احمد نے بے طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔ جب سے عالی نے فون کر کے اپنے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی تھی۔ عفیرہ بیگم اور صباحت کے خوشی کے مارے قدم ہی زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

سیانے صحیح کہتے ہیں کہ اصل زر سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ اَن دیکھے پوتے کی پیدائش کی خوشی میں مبارک احمد فوراً بازار گئے اور ڈھیر ساری مٹھائی خرید کر لائے۔ سب سے پہلے صباحت کے سسرال میں مٹھائی دینے گئے۔ پھر شہاب کے سسرال یعنی عظیم صاحب کے گھر بڑا سا مٹھائی کا ڈبہ لے کر پہنچ گئے۔ عفیرہ بیگم اور صباحت نے سارے محلے میں مٹھائی تقسیم کی۔ بلکہ دوسرے دن صباحت کالج میں بھی اپنی کلاس فیلوز کے لیے مٹھائی لے کر گئی۔ اور پھر کئی روز تک گھر میں مبارک باد دینے کی غرض سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔

سعدیہ بیگم اور عظیم صاحب بھی مٹھائی لے کر مبارکباد دینے آئے تھے صباحت کے سسر ضمیر احمد اور ساس رقیہ بیگم نے بھی گھر آ کر خوشی کا اظہار کیا اور مبارکباد دی۔ مبارک احمد اور عفیرہ بیگم تو اپنے پرانے محلے میں بھی عزیز رشتے داروں اور دوست احباب کو مٹھائی دینے گئے۔

صغریٰ اور صدیق کے ہاں بھی ایک عرصے بعد گئے تو سب نے اُن کا خوشدلی سے استقبال کیا اور پوتے کی پیدائش پر دلی مبارکباد پیش کی۔ اِدھر تو عالی کے والدین اور بہن اُس کے پہلے بچے کی پیدائش کی دل کھول کر خوشیاں منا رہے تھے اور وہ لوگ بچے، پنکی اور عالی کے لیے قیمتی تحفے خریدنے کے لیے بے تحاشا پیسہ خرچ کر رہے تھے۔ کئی ماہ کی جمع پونجی انہوں نے مٹھائی کی خریداری اور تحائف خریدنے کے لیے خرچ کر ڈالی تھی۔

کراچی چونکہ تینوں نے جہاز سے جانا تھا اس مقصد کے لیے عفیرہ بیگم نے صباحت کے جہیز کے لیے ڈالی ہوئی کمیٹی کے پیسے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تا کہ باعزت طریقے سے بیٹے کے گھر میں پہلی مرتبہ جا سکیں۔ جبکہ دوسری طرف پنکی کی والدہ محترمہ بچے کی پیدائش سے دو ماہ قبل ہی کراچی پہنچ چکی تھیں۔ تا کہ بیٹی کو پہلے پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر کوئی مسئلہ درپیش نہ ہو اور جیسے ہی بچے کی پیدائش کی اطلاع ملی پنکی کے والد اور دونوں بھائی بھی فوراً وہاں پہنچ گئے۔

عالی بے چارہ پریشان ہو رہا تھا کہ گھر میں تو اس قبضہ گروپ نے ڈیرے ڈال لیے ہیں تو اُس کے والدین اور بہن کہاں ٹھہریں گے۔ جو اُس کی شادی کے بعد پہلی مرتبہ خوشی خوشی آ رہے تھے جب اُس نے پنکی کو اپنے گھر والوں کے آنے کے فیصلے کے بارے میں آگاہ کیا تو اُس کے ماتھے پر سو بل پڑ گئے اور منہ بنا کر بولی۔

''میں نے کچھ دنوں بعد لاہور تو جانا ہی تھا۔ وہاں پر وہ لوگ بچے کو دیکھ لیتے۔ یہاں بھلا اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی خواہ مخواہ اتنا خرچ کر کے آئیں گے آنے جانے کے کرائے کے سلسلے میں اُن کا کون سا کوئی خاص ذریعہ آمدنی ہے۔ ایک بے چارہ شہاب ہی تو کما رہا ہے۔

''دیکھو پنکی وہ پہلی مرتبہ اپنے بیٹے کے گھر آ رہے ہیں۔ تم اس سلسلے میں کسی قسم کی بد مزاجی کا مظاہرہ نہیں کرو گی۔ ورنہ پھر تمہارے والدین اور بھائی بھی یہاں نہیں آ سکیں گے۔'' عالی نے سخت لہجے میں کہا۔

''میری بلا سے جو مرضی یہاں آتا رہے۔''

پنکی بدتمیزی سے جواب دے کر کسی فیشن میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔

☆......☆......☆

پنکی کے والدین اور بھائیوں کے جانے کے ایک ہفتے بعد مبارک احمد' عفیرہ بیگم اور صباحت آ گئے۔ پنکی کا خشک رویہ اُن کے لیے باعث دکھ تھا۔ وہ اتنی خوشی اور چاہ

سے بچے کے لیے قیمتی کپڑے کھلونے اور دوسری ضروری چیزیں لے کر آئے تھے۔ پنکی اور عالی کے لیے خوبصورت سوٹ اور دوسرے بہترین قسم کے تحائف تھے مگر پنکی نے اُن شوق سے خریدے گئے تحائف کی تعریف کرنا تو درکنار انہیں ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ بلکہ اُن کی پیکنگ بھی یہ کہہ کر کھولنے نا دی کہ ابھی اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں جب وہ صحت یاب ہوگی تو پھر اُن چیزوں کو کھول کر دیکھ لے گی۔ چنانچہ ملازمہ نے سب بنڈل اُٹھا کر اسٹور میں رکھ دیے۔ وہ لوگ پانچ کلو کی مٹھائی کی ٹوکری بھی لائے تھے۔ جس میں سے کچھ تو عالی اپنے کولیگز کے لیے آفس میں لے گیا باقی یونہی کچن میں پڑی سڑتی رہی۔ عالی کا رویہ بھی اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ آفس سے واپس آ کر لاؤنج میں بیٹھے والدین اور بہن سے علیک سلیک کے بعد اپنے کمرے میں گھس جاتا۔ اور وہاں بیوی اور بچے کے چاؤ چونچلوں میں مصروف رہتا۔

صباحت بے چاری خود ہی کچن میں جا کر جو کچھ فریج میں پڑا ہوتا لے کر ناشتہ اور کھانا بنا لیتی۔ جمیلہ بوا کے علاوہ ایک ملازمہ اوپر کے کاموں کے لیے آتی تھی۔ جبکہ دفتر کا ایک چپڑاسی کھانا پکانے اور سودا سلف لانے کا کام کرتا تھا۔ وہ صبح دس بجے آتا تھا۔ تب تک مبارک احمد اور عفیرہ بیگم کو صباحت ناشتہ بنا کر دے چکی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ فجر کے وقت اٹھنے اور جلدی ناشتہ کرنے کے عادی تھے۔ جبکہ یہاں پر تو ناشتہ ہی بارہ ایک بجے کیا جاتا تھا۔

عالی صبح بغیر ناشتے کے ہی آفس چلا جاتا تھا۔ اور آفس ہی میں ناشتہ کر لیتا تھا دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتا تھا کہیں چھ بجے آفس سے واپس آتا تھا۔ نو بجے تک اپنے کمرے ہی میں سوتا رہتا یا بیوی بچے کے ساتھ مصروف رہتا اور پھر نو بجے تیار ہو کر گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتا۔ دس گیارہ بجے ہی اُس کی واپسی ہوتی تھی۔ والدین اور بہن کے آنے کے بعد بھی اُس نے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ اُس سے اتنا بھی نا ہو سکا تھا کہ ایک دو دن کی چھٹی لے کر والدین اور بہن کو کراچی کی مشہور جگہیں ہی دکھا لائے کچھ اور نہیں تو سمندر کی سیر ہی کروا دے۔

مگر وہ پنکی کے ڈر سے ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ کہے گی کہ وہ گھر میں بستر پر پڑی ہے اور یہ اپنے گھر والوں کو سیریں کرواتا پھرتا ہے۔

اگرچہ بچے کی پیدائش میجر آپریشن سے ہوئی تھی۔ مگر پنکی کی صحت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ اچھی خوراک، آرام اور بہترین دیکھ بھال اور علاج معالجے کی وجہ سے دو ہفتے ہی میں وہ بھلی چنگی ہوگئی تھی۔ مگر اب جان بوجھ کر عالی کے والدین کی آمد پر اپنی ناگواری کے اظہار کے طور پر اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ جمیلہ بواء بھی ہر وقت اُسی کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔

مبارک احمد' عفیرہ بیگم اور صباحت تو یہاں خود کو قیدی محسوس کر رہے تھے۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ فوراً ہی واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ مگر چونکہ وہ صباحت کے سسرال والوں اور سعدیہ بیگم سے کہہ کر آئے تھے کہ وہ دو ہفتے تک کراچی میں رہیں گے۔ اس لیے محض اپنی عزت اور بھرم کی خاطر بن بلائے مہمانوں کی حیثیت سے یہاں اپنے جانے کے دن گن رہے تھے۔ ورنہ اُن کا دل بہت کھٹا ہو چکا تھا۔

دو ہفتے خدا خدا کر کے گزرے تو وہ واپس لاہور آ گئے۔ عالی نے اتنا احسان ضرور کر دیا تھا کہ واپسی کے لیے اُن کے لیے نا صرف جہاز کے ٹکٹ خرید لیے تھے بلکہ انہیں ایئرپورٹ تک الوداع کہنے بھی آیا تھا۔ بے چارے غریب والدین اس پر بھی خوش ہو گئے تھے اور اُس کو ڈھیروں ڈھیر دعاؤں کے تحفے دے کر رخصت ہوئے تھے۔

عالی نے بھی شرمندگی سے سر جھکا کر انہیں خدا حافظ کہا تھا۔ بیوی کی خوشی کی خاطر والدین اور بہن کے ساتھ اس طرح بے گانگی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اُس کا دل دکھ سے بوجھل ہو جاتا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے ذرا بھی اپنے گھر والوں کو اہمیت دی تو پنکی بغیر کسی لحاظ کے اپنی اصلی فطرت کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آئے گی۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے والدین کے سامنے لڑائی جھگڑا ہو اور یہ غنیمت تھا کہ دو ہفتے سکون سے گزر گئے

تھے۔

☆......☆......☆

عفیرہ بیگم، مبارک احمد اور صباحت کراچی سے واپس آئے تو پہلے اُن سے ملنے کے لیے صباحت کے ہونے والے سسر اور ساس آئیں۔ عفیرہ بیگم نے دل کی دکھن کو دل ہی میں دباتے ہوئے بڑی خوشی کے ساتھ اپنے اتنے دنوں بیٹے کے گھر میں قیام کی روداد بتائی کہ کس طرح اُن کے بیٹے اور بہو نے اُن کی خدمت اور دیکھ بھال میں کوئی کسر نا اٹھا رکھی۔

دونوں میاں بیوی بہت متاثر ہوئے اور انہیں کہا کہ وہ خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قدر سعادت مند بیٹا اور اس طرح خیال رکھنے والی بہو عطا کی ہے یہ سن کر مبارک احمد اور عفیرہ بیگم دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ اصلیت تو وہی جانتے تھے۔ جو اُن کے بیٹے اور بہو نے عزت افزائی کی تھی اسے تو وہ شاید مرتے دم تک فراموش نا کرسکیں۔

کچھ دنوں بعد عظیم صاحب اور سعدیہ بیگم بھی آئے تو اُن کے ساتھ بھی ایسی ہی باتیں کیں۔ اور حلوے کے ڈبے عالی کی طرف بھجوائے گئے کہہ کر دیے گئے اور وہ دونوں میاں بیوی بھی دیر تک عالی اور اُس کی شاندار بیوی کے گن گاتے رہے۔

''اماں آپ لوگوں کو کیا ضرورت تھی ان دونوں گھرانوں کے سامنے عالی بھائی اور اُن کی چہیتی بیوی کی جھوٹی تعریفیں کرنے کی...... ایک نا ایک دن تو اُن لوگوں کو اصلیت پتہ چل ہی جانی ہے۔

''مجھے تو شہاب بھائی نے کافی دن پہلے ہی عالی بھائی اور پنکی بھابی کے رویے کے بارے میں بتادیا تھا بے چارے بھائی کا وہاں گھر موجود ہونے کے باوجود ہوٹلوں میں ٹھہراتے رہے اور ٹیکسی وغیرہ میں سفر کرتے رہے۔'' صباحت بہت تلخ ہو رہی تھی۔

''اچھا چلو چھوڑو بیٹا تم بھول جاؤ یہ سب کچھ۔ غلطی ہوگئی نا آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' عفیرہ بیگم نے شرمندہ شرمندہ سا ہوتے ہوئے کہا تو صباحت مزید کوئی بات کیے بغیر اپنے کمرے میں جا کر کل کے ٹیسٹ کی تیاری کرنے لگی۔ اور عفیرہ بیگم شام کی چائے تیار کرنے کی غرض سے کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

اپنے والدین اور بہن کے ساتھ پنکی کے رویے اور اپنی سرد مہری کا عالی کو بہت قلق تھا۔ اُن لوگوں نے واپس جا کر اُس سے فون پر بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ شہاب کا بھی کافی دنوں سے فون نہیں آیا تھا۔ اُس نے بس بچے کے پیدا ہونے کے بعد مختصر سی کال کر کے اُسے مبارکباد دی تھی اور پھر اس کے بعد دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ عالی مانتا تھا کہ اس میں پنکی کے ساتھ ساتھ وہ بھی قصوروار ہے۔ جو اپنی بیوی اور سسرال والوں کو خوش رکھنے کے چکر میں اپنوں سے روز بروز دور ہوتا چلا جارہا تھا۔ وہ غریب ہے کم حیثیت ہے مگر اُس کے اپنے تھے اُن کے ساتھ اُس کا خون کا رشتہ تھا، ناخن سے گوشت تو کبھی بھی جدا نہیں ہوسکتا۔ مگر اُس کا خون پتہ نہیں کیوں سفید ہوگیا تھا۔ شاید اپنے گھر کے سکون کو برقرار رکھنے کی کوشش میں وہ نادانستہ یا دانستہ طور پر اپنوں کے ساتھ بے رخی برتتا تھا۔ جس پر بعد میں اُسے پچھتاوے کے زہریلے ناگ ڈسنے لگتے تھے۔ کیونکہ خون کی کشش تو اپنی جگہ حقیقت تھی۔ جس سے وہ انکار نہیں کرسکتا تھا۔ مگر بعد کے پچھتاووں کا کیا فائدہ جب اُس کے والدین اور بھائی بہن اُس سے بدگمان ہوچکے تھے۔

☆......☆......☆

''یہ لو عفیرہ بیگم تمہارے بیٹے نے ہماری جمع پونجی لوٹنے کا ایک اور ڈرامہ رچانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

مبارک احمد نے عالی کے سسر کی جانب سے بھیجے گئے تین سنہری لفافوں میں بند عقیقے کا کارڈ دے کر بیوی سے کہا۔

''کیوں کیا ہوا ہے؟'' عفیرہ بیگم نے لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر پوچھا۔

''خود ہی کھول کر دیکھ لو۔ مجھے تو عالی کے سسر کا ملازم یہ کہہ کر دے کر گیا ہے کہ یہ بچے کے اگلے ہفتے ہونے والے عقیقے کے کارڈ ہیں ایک کارڈ ہمارے لیے ہے جبکہ باقی دو صباحت اور شہاب کے سسرال والوں کے لیے ہیں اب یہ ہمارے نئے سمدھیوں کی نظروں

میں ہمیں گرانے کا نیا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔'' مبارک احمد نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''ہمیں نا عالی سے غرض ہے نا اُس کے بچے سے...... تو پھر ہمیں کیا پڑی ہے ایسی تقریبات میں جانے کی۔ جہاں ہماری دو کوڑی کی بھی عزت نہ ہو۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو وہ بچہ ہمارا پوتا ہے ہماری نسل ہے۔ اُس کے عقیقے کی رسم کرنا ہمارا حق تھا۔ یا اُس کے ننھیال کا...... عجیب ہی رواج ہے اِن امیر لوگوں کے...... دوسروں کے پالے پوسے بیٹے بھی ہتھیا لیتے ہیں اپنی عیب دار بدشکل بیٹیاں دے کر اور اُن کی اولاد پر بھی قبضہ جما لیتے ہیں۔'' عفیرہ بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور تینوں لفافے ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔

☆......☆......☆

''عالی بیٹا آپ کے والدین، صباحت بیٹی اُس کے سسرال والے اور شہاب بیٹے کے سسرال والے نہیں آئے کیا ابھی تک...... اُن سے فون کر کے پوچھو کہ وہ کب تک آئیں گے تا کہ عقیقے کی رسم ادا کی جائے۔'' عالی کے سسر نے سارے مہمانوں کا طائرانہ انداز میں جائزہ لے کر کہا۔

''میرا خیال ہے انکل آپ لوگ رسم کر لیں۔ اُن لوگوں نے آنا ہوتا تو اب تک آ جاتے۔'' عالی نے لاپرواہی سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... جیسے تمہاری مرضی۔''

آج پنکی کی سج دھج دیکھنے والی تھی۔ انتہائی خوبصورت سنہری بارڈر والی شیفون کی ساڑھی میں ملبوس وہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ بیوٹیشن نے اُس کا میک اپ بھی بے حد مہارت سے کیا تھا۔ اونچی ہیل والی سنہری تلے والی سینڈل میں اُس کا قد خاصا نمایاں لگ رہا تھا۔ سونے کے ڈائمنڈ جڑے نازک سی جیولری سیٹ نے اُس کی سج دھج کو چار چاند لگا دیے تھے۔ بچہ جس کو عالی موبی کہتا تھا جبکہ پنکی نے اُس کا نام دانیال رکھا تھا۔ نیوی بلو کلر کے خوبصورت ڈریس میں بہت سج رہا تھا۔ چونکہ ڈیڑھ ماہ کا ہو چکا تھا۔ اس لیے اب کافی صحت مند اور موٹا تازہ لگ رہا تھا۔ رنگ بھی قدرے صاف لگ رہا تھا۔

عالی سفید لان کے کرتے اور سفید کاٹن کی شلوار زیب تن کیے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ پاؤں میں خوبصورت ملتانی کھسہ پہن رکھا تھا۔ یہاں ماں تو نہیں تھی جس کی نگاہیں اُس کی بلائیں لیتیں۔ نا بہن تھی جو دعائیں پڑھ پڑھ کر دور ہی سے اُس پر دم کرتی کہ اللہ اُسے نظر بد سے محفوظ رکھے۔ نا ہی اُس پر فخر کرنے والا باپ تھا۔ نا اُسے چاہنے والا بھائی تھا۔ وہ تو غیر لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔

جب سارے مہمان آ چکے تو عقیقے کی رسم ادا کی گئی۔ دو بکروں کو صدقے کے طور پر ذبح کیا گیا جن کا گوشت یتیم خانے میں بھجوا دیا گیا۔ پھر مہمانوں نے باری باری اسٹیج پر آ کر پنکی اور بچے کے تحائف پیش کیے۔ کئی لوگوں نے لفافوں میں بند کیش دیا۔ خوبصورت گفٹ پیپرز میں پیک کیے گئے تحفے ایک بڑی سی میز پر رکھے جا رہے تھے۔ جو اسٹیج ہی پر ایک طرف پڑی تھی۔ تحائف کے بعد کھانے کا دور چلا۔ کئی قسم کے مزیدار کھانے تھے ایک طرف باربی کیو کا انتظام تھا۔ تا کہ مہمان گرم گرم تکے یا سیخ کباب سے لطف اندوز ہو سکیں۔

عالی، پنکی اور گھر کے دوسرے افراد ایک ایک مہمان کے پاس جا کر اُن کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ مہمان خوش دلی سے کھانے سے انصاف کرتے ہوئے انہیں مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ ننھا دانیال یا موبی جمیلہ بوا کی گود میں مزے سے سو رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ اُس کی دنیا میں آمد کی خوشی میں اتنی شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔

یہ قدرت کا اپنا ہی انتظام ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس جائز و ناجائز طریقوں سے کمایا ہوا اتنا پیسہ ہے کہ وہ اُسے خرچ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ شادیوں برتھ ڈے پارٹیوں اور دیگر تقریبات میں اتنا بے تحاشا کھانا بنایا جاتا ہے اور ضائع بھی کیا جاتا ہے کہ اُس سے کئی غریب کنبوں کا کئی مہینے کا راشن آ سکتا ہے۔ مگر ایسا سوچتا ہی کون ہے۔ صدقہ خیرات

کرتے ہوئے اپنے غریب ملازموں اور غریب رشتے داروں کی مدد کرتے ہوئے لوگوں کی جان جاتی ہے۔ مگر مختلف قسم کی تقریبات اور فنکشنز پر دل کھول کر روپیہ لٹاتے ہوئے انہیں ذرا بھی ملال نہیں ہوتا۔

تقریب کے اختتام پر مہمانوں کو رخصت کر کے جب پنکی اور عالی اپنے کمرے میں آئے تو وہ بے حد تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے لباس تبدیل کر کے فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ گفٹ سارے اُن کے کمرے میں پہنچا دیے گئے تھے مگر انہیں کھولنے کا فیصلہ اگلے دن تک ملتوی کر دیا گیا۔

اگرچہ پنکی دل ہی دل میں بے حد خوش تھی کہ عالی کے والدین اور اُس کی بہن تقریب میں شریک نہیں ہوئے۔ مگر یونہی تجاہل عارفانہ سے کام لے کر بولی۔

''عالی امی ابو کیوں نہیں آئے پاپا نے تو سب کے کارڈ ملازم کے ہاتھ بھجوائے تھے، کیا ناراض ہیں وہ؟''

''نہیں بہت خوش ہیں۔ اُن کے پہلے پوتے کا عقیقہ اُن کے بیٹے کے امیر کبیر سسرال کے گھر میں کیا گیا ہے۔ انہیں تو بھنگڑے ڈالتے ہوئے آنا چاہیے تھا۔ ہیں نا......'' عالی نے اپنے اندر کی ساری تلخی اور فرسٹریشن ایک ایک لفظ میں سمو کر کہا۔

''تم تو بس نا ہر بات پر لڑنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہو۔ اب اگر پاپا نے اپنی خوشی سے اپنے گھر میں اپنے نواسے کے لیے ایک تقریب کر لی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے تمہارے والدین نے تو جھوٹے منہ بھی ہمیں نہیں پوچھا۔ کراچی سے واپس آنے کے بعد فون تک بھی نہیں کیا۔ ہم ایک ہفتہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بلایا ہمیں اپنے گھر میں...... اگر وہ یہ کہتے کہ عقیقے کی تقریب وہ اپنے ہاں کریں گے تو ہم کوئی انکار کرتے بلکہ بھی خوشی خوشی شامل ہوتے۔ شہاب اور صباحت کی منگنی میں بھی تو میرے سارے گھر والے گئے ہی تھے نا۔'' پنکی نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔

''تم نے اپنے گھر میں اُن کی بڑی عزت افزائی کی تھی نا۔ جو وہ تم سے رابطہ کرتے یا تمہارے بیٹے کے اعزاز میں وہ کوئی جشن مسرت مناتے کہ اُن کے اتنے چاؤ سے لائے ہوئے تحفے تم نے کھولنے کی زحمت بھی گوارا نا کی۔ وہ اتنے اہتمام سے مٹھائی بنوا کر لے کر آئے اور تم نے وہ نوکروں کے حوالے کر دی۔ کوئی کتنا ہی غریب اور گرا پڑا ہو۔ ہر انسان میں عزت نفس ہوتی ہے اور کوئی شخص بھی اپنی انسلٹ برداشت نہیں کرتا۔ اگر میں تمہارے والدین اور بھائیوں کے ساتھ بدسلوکی تو دور کی بات ہے تھوڑی سی بھی بے رخی اختیار کروں تو تم میرا جینا حرام کر دو۔'' عالی بے حد دکھی ہو رہا تھا۔

''اصل بات یہ ہے محترم عالی صاحب کے آپ لوگ جو نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ لوگوں میں حسد اور احساس کمتری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ خود تو اپنی حیثیت بہتر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دوسرے پیسے والے اور صاحب حیثیت لوگوں سے نفرت کا اظہار کر کے اپنی محرومیوں کا انتقام لیتے ہیں۔ اتنی سی بات ہے آیا سمجھ میں۔'' پنکی نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

دو ہفتے تک لاہور میں قیام کے بعد عالی کراچی واپس چلا گیا۔ اس دوران باوجود خواہش کے اُس نے اپنے گھر والوں سے رابطہ نہیں کیا نا ہی اُن سے ملنے کے لیے گیا۔ اصل میں وہ شرمندہ تھا۔ ایک تو اپنے گھر میں اُن کے ساتھ روا رکھنے والے رویے کی وجہ سے، دوسرا بچے کے عقیقے کی رسم سسرال میں کرنے پر وہ ڈرتا تھا کہ ماں باپ اُسے آڑے ہاتھوں لیں گے۔ حالانکہ اس سلسلے میں اُس کا تو کوئی قصور ہی نا تھا۔ پنکی ایک خود سر عورت تھی۔ وہ ہر معاملے میں اپنی مرضی چلاتی تھی۔

☆......☆......☆

ٹھیک ڈھائی بجے سعدیہ بیگم کے پارلر سے انیلہ نکل کر قریب واقع بس اسٹاپ کی طرف چلی گئی۔ وہاں کھڑے ابھی اُسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک سیاہ ٹیوٹا کرولا اُس کے پاس آ کر رک گئی۔ چونکہ انیلہ نے حارث احمد کی یہ گاڑی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس لیے وہ پہلے یہی سمجھی کہ کوئی اوباش شخص اُسے تنگ کرنے کے لیے اُس کے قریب آ کر رکا ہے۔ مگر جب حارث احمد نے اُس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ اور اُسے اندر گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ تو وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اُس نے اپنی بڑی سی سیاہ رنگ کی چادر کے ساتھ لگے نقاب کو چہرے پر ڈال لیا۔

''تم صبح سے پارلر میں کام کر رہی تھیں۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ چلو پہلے کہیں بیٹھ کر کھانا کھالیں۔'' حارث احمد نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں نے کھانا کھالیا ہے۔ دراصل سعدیہ آنٹی کے آنے تک میں پارلر کی ذمہ داری سنبھالتی ہوں۔ پہلے بھی میں ایسے ہی کرتی تھی۔ دو بجے آنٹی آگئی تھیں وہ میرے لیے گھر سے کھانا بھی لے آتی ہیں۔''

''اچھا چلو کھانا نا سہی کچھ اور کھالو۔''

''ہاں بس مجھے ریگل سے دہی بھلے کھلا دیں۔ وہ مجھے بہت پسند ہیں۔'' انیلہ نے منہ میں پانی بھر کر کہا۔ اُس کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ریگل چوک پر بکنے والے مشہور و معروف دہی بھلے کھائے۔ وہ جب بھی وہاں سے وین یا بس پر گزرتی تھی تو وہ لوگوں کو اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر چٹ پٹے دہی بھلے کھاتے دیکھ کر بہت رشک آتا تھا۔ اس لیے آج جب اُسے موقع ملا تو اُس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کر ڈالا جو برسوں سے اِس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی تھی۔ اُس کی اس معمولی سی خواہش پر حارث احمد دل ہی دل میں ہنسا۔ اور سوچنے لگا کہ بے چاری غریب لڑکی کی خواہشات بھی اُس کی طرح ادنیٰ سی ہیں۔

ریگل چوک کے قریب گاڑی رکی تو دو تین لڑکے بھاگے بھاگے آئے حارث احمد نے انہیں ایک پلیٹ دہی بھلے لانے کو کہا۔

''آپ نہیں کھائیں گے کیا؟''

''نہیں میں نے ناشتہ دیر سے کیا تھا۔ اس لیے میں دوپہر کو کچھ نہیں لیتا...... اب رات ہی کو کھانا کھاؤں گا۔'' تھوڑی دیر میں لڑکا دہی بھلوں کی ڈس پوزیبل پلیٹ لے آیا۔ حارث نے پلیٹ انیلہ کے حوالے کی۔ اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

حارث کی بیوی چونکہ میکے گئی ہوئی تھی۔ ملازمہ کو حارث نے چھٹی دے دی تھی۔ اس لیے وہ انیلہ کو اپنے گھر میں لے آیا۔ ایک کینال کی جدید انداز کی بنی کوٹھی بہت اچھی طرح ڈیکوریٹ کی گئی تھی۔ حارث انیلہ کو اپنے بیڈ روم میں لے آیا۔ کمرے میں فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ بڑے سے ڈبل بیڈ روم کے سائیڈ ٹیبل پر حارث کی بڑی سی تصویر پڑی تھی۔ جبکہ سامنے دیوار پر حارث اور ایک خوبصورت سی لڑکی اور دو بچوں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

''یہ میری بیوی اور بچوں کی تصویر ہے۔'' حارث نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

انیلہ کو اُس کی بیوی کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگی مگر اُسے یاد نہیں آیا کہ اُس نے اُسے کہاں دیکھا تھا۔

ساڑھے چار بجے حارث انیلہ کے ہمراہ اپنے گھر سے نکلا اور اُس کے نئے آفس کی طرف روانہ ہوگیا۔

''حارث صاحب کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم لوگ فی الحال خفیہ طور پر ہی سہی نکاح کر لیں میرا مطلب ہے کہ بغیر نکاح کے......'' انیلہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''او کے...... او کے...... ڈونٹ وری وقت آنے پر سب کچھ ہو جائے گا۔ فکر نا کرو۔ میں نے تم سے کمٹمنٹ کی ہے تو اُسے پورا بھی کروں گا۔ فی الحال جیسے چل رہا ہے چلنے دو۔'' حارث نے نرم لہجے میں کہا۔

تو جواب میں انیلہ خاموش ہوگئی۔ اب اُس کی تمام تر امیدیں حارث کی ذات ہی سے وابستہ تھیں۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اُسے شادی کے لیے قائل کر لے اس لیے وہ اُس کی ہر بات مان رہی تھی۔ اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ اس شکاری نے ایسے طریقے سے پھانسا تھا کہ وہ بس بس پنچھی کی طرح اُس کے جال میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی تھی۔ اور چاہتے ہوئے بھی اُس کے چنگل سے آزاد نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے اُس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

اُسے آفس کے سامنے ڈراپ کر کے حارث باہر ہی سے چلا گیا۔ وہ آفس میں داخل ہوئی تو سامنے ہی ماریہ فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھی۔ انیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ ماریہ نے فون کا سلسلہ منقطع کیا۔

"ہائے انیلہ ہاؤ آر یو؟" ماریہ نے کہا۔

"جی فائن...... آپ کیسی ہیں؟" انیلہ نے پوچھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" پھر اُس نے ایک بزر کو دبایا۔ کچھ دیر بعد ایک آفس بوائے کہیں سے نمودار ہوا۔

"ذیشان یہ مس انیلہ ہیں ہماری نئی ٹیلی فون آپریٹر انہیں اِن کے کیبن میں لے جاؤ اور شرمیلا سے کہو کہ انہیں اِن کے کام کے بارے میں بریف کردے۔"

"جی بہتر مس......" ذیسان نے ماریہ سے کہا۔ اور پھر انیلہ سے مخاطب ہوا۔

"آیئے مس......" کچھ دیر چلنے کے بعد ذیشان ایک کیبن کے پاس رکا اور اُس کے کالے گلاس ڈور پر ہولے سے دستک دی۔

"آجاؤ......" اندر سے آواز آئی۔ ذیشان اور انیلہ کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ کیبن کے دروازے کے پاس آمنے سامنے دوصوفے پڑے تھے۔ درمیان مین ایک چھوٹا سا سینٹر ٹیبل تھا۔ سامنے دیوار کے پاس آفس ٹیبل تھی جس پر ٹیلی فون سیٹ اور کمپیوٹر پڑا تھا اور اُس کے ساتھ پڑی ریوالونگ چیئر پر ایک سانولی سلونی تیکھے نین نقش والی اسمارٹ سی لڑکی بیٹھی تھی۔

"اسلام علیکم مس شرمیلا...... یہ مس انیلہ ہیں ہماری نئی آپریٹر...... مس ماریہ نے انہیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ انہیں ان کے کام کے بارے میں بریف کردیجیے۔" ذیشان نے تفصیل سے کہا۔

"ٹھیک ہے...... ذیشان آپ جاؤ، ہیلو انیلہ کیسی ہیں آپ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" شرمیلا نے اپنا سانولا لمبے لمبے ناخنوں والا ہاتھ انیلہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی اچھا لگا آپ سے مل کر۔" انیلہ نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ اپنے نرم و نازک گلابی ہاتھ میں تھام کر کہا۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھ جائیں نا۔" شرمیلا نے کہا تو انیلہ شکریہ کہہ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ پھر کافی دیر تک شرمیلا اُسے اُس کے کام کے بارے میں ہدایات دیتی رہی اور پھر اُسے خود اُس کے کیبن تک چھوڑ کر آئی۔

شرمیلا خاصی ماڈرن لڑکی تھی اُس نے نیلے رنگ کی چست جینز پہن رکھی تھی۔ نیلی ہی دھاریوں والی چھوٹی سی ٹی شرٹ تھی۔ جس کے بازو ہاف تھے۔ پاؤں میں سیاہ پنسل ہیل والی سینڈل تھی۔ گلے میں موٹے موٹے بینڈز والی لمبی سی مالا کانوں میں مالا کے ہمرنگ موتیوں والی ایئر رنگ' اور دائیں ہاتھ میں چوڑا سا بریسلیٹ پہنا ہوا تھا۔ اُس کا قد اگرچہ چھوٹا تھا۔ مگر اونچی ہیل نے اُس کی کمی پوری کردی تھی۔ سانولے رنگ کے باوجود اس کے چہرے میں بلا کی جاذبیت تھی۔ سلیقے سے کیے میک اپ کی وجہ سے وہ اور بھی پُرکشش لگ رہی تھی۔ انیلہ کو اُس کے سامنے عجیب سا احساس کمتری محسوس ہوا۔ اُس نے سستا سا پنک کلر کا لان کا گھر ہی میں اسٹیچ کیا ہوا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سوٹ کے ہمرنگ چند سو میں خریدی ہوئی معمولی سی چپل پہن رکھی تھی۔ پنک لپ اسٹک اور نیل پالش لگا رکھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں بھی معمولی سی تھیں۔

اب اُس نے سوچا تھا کہ وہ صرف آفس سے ملنے والی دس ہزار تنخواہ ابا کو دیا کرے گی جبکہ پارلر سے جو بھی تنخواہ ملے گی وہ کچھ اماں کو دے کر باقی اپنی ضروریات کے لیے رکھ لیا کرے گی۔ مگر ایسا وہ صرف سوچ ہی سکتی تھی صدیق اسے کبھی بھی اتنے پیسے اپنے پاس نہیں رکھنے دے گا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی اور اُس کا ثبوت اُسے دو دن بعد ہی مل گیا۔ جب ایک رات وہ آفس سے آئی تو صدیق نے اُسے بلا کر کہا۔

"سنو لڑکی کل رات کو نو بجے دکان سے فارغ ہو کر میں تمہارے آفس آؤں گا۔ تمہارے باس سے ملوں گا۔ اور اُس سے تمہاری تنخواہ کے بارے میں معلوم کروں گا۔ اور اُسے کہوں گا کہ تمہاری تنخواہ میں خود وصول کیا کروں گا۔ اسی طرح کسی دن سعدیہ بیگم کے پارلر کا چکر لگاؤں گا۔ اور وہاں سے بھی تمہاری تنخواہ میں خود لیا کروں گا۔ تمہارا کیا ہے سارا پیسہ اپنے

فیشنوں میں اُڑا دو۔ تمہیں پیسے کی کیا قدر...... پھر جس کو اچانک ہی اتنی رقم مل جائے تو اُس کا وہی حال ہوتا ہے جو پنجابی میں محاورہ ہے نا کہ بھوکے کی بیٹی رجی اور خاک اڑانے لگی۔'' صدیق نے کرخت لہجے میں کہا۔

''اب جاؤ یہاں سے کھڑی کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو۔'' اور انیلہ آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی ہوئی تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گرنے کے انداز میں پڑ گئی۔ جہاں پہلے ہی بجیلہ بھی سو رہی تھی۔

دونوں بہنیں بچپن ہی سے ایک ساتھ ہی سونے کی عادی تھیں۔ چھوٹے سے کمرے میں بمشکل چار تو چار پائیاں آتی تھیں۔ ایک چار پائی راحیلہ اور اُس سے چھوٹی بہن کے لیے مخصوص تھی۔ جبکہ چوتھی چار پائی پر سارے دن کی آوارگی یا پھر محنت مزدوری کے بعد تھکے ہارے ظفر اور اظہر بے سدھ ہو کر سو جاتے تھے۔

''عجیب ہی زندگی ہے ہماری، کہیں بھی سکھ چین نصیب میں نہیں ہے۔ گھر میں باپ ذلیل کرتا ہے اور گھر سے باہر بھیڑیے نما مرد ہڑپ کرنے کو تیار رہتے ہیں ہمارا ہی مقدر اس قدر برا کیوں ہے مالک دو جہاں؟'' انیلہ بستر پر ایک جانب سکڑی ہوئی لیٹی سوچ رہی تھی۔ اتنے افراد کے کمرے میں سونے کی وجہ سے عجیب سی گھٹن اور حبس ہو رہا تھا۔ سارے دن کی بارش کی وجہ سے گرمی کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا اوپر سے ہر گھنٹے دو گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ الگ عذاب تھی۔ جولائی کا حبس زدہ مہینہ تو ویسے بھی اذیت ناک ہوتا ہے۔ اوپر سے بجلی کی بندش، انیلہ کا سارا دن بہت سکون سے گزر جاتا تھا۔ پارلر میں بھی اے سی تھا۔ پھر جنریٹر بھی تھا۔ جب لائٹ جاتی تھی تو جنریٹر آن ہو جاتا تھا۔

آفس میں بھی بڑے بڑے اے سی کے پلانٹ تھے۔ اس لیے سارے دن گرمی کا احساس چھو کر بھی نہیں گزرتا تھا۔ انیلہ کا دل چاہتا تھا کہ اپنے آفس ٹیبل پر سر رکھ کر گہری اور پُرسکون نیند سو جائے کبھی نا بیدار ہونے کے لیے۔

سپنوں کی ایسی حسین وادیوں میں پہنچ جائے جہاں نا ظالم اور بے رحم ابا ہو، نا حارث اور سکندر جیسے عزتوں کے لٹیرے ہوں اور نا ہی غربت و افلاس کی خوں آشام چڑیلیں اپنے شکنجوں میں دبوچنے کے لیے ہر لمحہ تیار ہوں۔ بس ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے سارے دن کا تھکا ہوا ذہن اور جسم کسی نا کسی طرح نیند سے ہم آغوش ہو ہی جاتا تھا اور وہ رات کے چند گھنٹوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سپنوں کی وادیوں میں گھومتی پھرتی تھی۔ اور خوشی کے چند انمول لمحے کشید کر لیتی تھی۔ جس سے زندگی کے دکھوں اور محرومیوں کی اذیت قدرے کم ہو جاتی تھی۔ اور وہ ایک نئے دن کی شروعات کرنے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

جیسے صدیق نے کہا تھا اُس نے ویسے ہی کیا۔ رات کو ٹھیک نو بجے اُس کے آفس پہنچ گیا۔ اور سیدھا اُس کے باس کے پاس گیا تھا۔ وہاں پندرہ بیس منٹ تک بیٹھ کر پتہ نہیں کیا کیا باتیں کرتا رہا تھا اُن سے، پھر وہ باہر جا کر گیٹ کے چوکیدار کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ دس بجے انیلہ فارغ ہو گئی تو اُسے آفس کی گاڑی کی بجائے اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھا کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

''یہ حارث کون ہے؟'' موٹر بائیک چلاتے چلاتے صدیق نے اپنے مخصوص کرخت لہجے میں پوچھا۔

''مجھے کیا پتہ کون ہے۔'' انیلہ نے انجان بنتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

''جھوٹ بکتی ہے حرام زادی، میں تیرے سارے کرتوتوں کے بارے میں جان گیا ہوں۔ اسی لیے تو یہاں آیا تھا۔ مجھے چوکیدار نے بتایا ہے کہ تمہارے باس کے دوست کسی حارث کے ساتھ اُس کی بڑی سی گاڑی میں تم ہر روز دفتر آتی ہو۔ بتاؤ وہ مجھے کون ہے؟ ورنہ ابھی تمہیں کسی گاڑی کے نیچے گرا کر ہمیشہ کے لیے تمہارے منحوس وجود سے چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔'' صدیق نے غصے سے بلبلا کر کہا۔

''آ...... اچھا...... حارث نام ہے اُن کا۔'' وہ دراصل ایک دو مرتبہ میں بس اسٹاپ سے پیدل آفس آ رہی تھی تو انہوں نے مجھے راستے میں رُک کر اپنی

گاڑی میں لفٹ دے دی تھی۔ وہ چونکہ باس کے دوست ہیں اکثر اُن کے پاس آفس آتے رہتے ہیں انہوں نے مجھے آفس میں دیکھا تھا اس لیے مجھے اپنی گاڑی میں پیدل چلتے دیکھ کر بٹھالیا۔ مجھے تو اُن کا نام بھی نہیں پتہ۔''

''آپ کو اتنے سالوں سے میرا جاب کرنے کے باوجود مجھ پر اعتبار نہیں تو گھر بٹھالیں میں آپ کی مرضی اور اجازت سے کام کرتی ہوں۔ مجھے کوئی شوق تو نہیں یوں سارا سارا دن اور آدھی رات تک محنت مشقت کرنے کا۔'' انیلہ نے بڑے اعتماد سے کہا تو جواب میں صدیق خاموش ہو گیا اور باقی راستہ خاموشی ہی میں کٹا تھا۔ اور اُس نے مزید انیلہ سے کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ دوسرے دن صدیق سعدیہ بیگم کے پارلر میں بھی پہنچ گیا تھا اور وہاں بھی اُن سے انیلہ کی تنخواہ کے بارے میں چھان بین کی تھی۔ مگر سعدیہ بیگم نے صدیق کو کھری کھری سنائی تھیں اور اُسے غیرت دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس طرح بیٹی کی کمائی کھا رہا ہے۔ مگر وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا سب تلخ و ترش باتیں سن کر بھی دانت نکالتا رہا۔

بہرحال چونکہ سعدیہ بیگم جانتی تھیں کہ اگر انہوں نے صدیق کو زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کی یا اُس کو انیلہ کی تنخواہ دینے سے انکار کیا تو وہ اُسے وہاں آنے ہی نہ دے گا۔ انیلہ اپنے کام میں ماہر ہو چکی تھی اور صدیق اُسے کسی اور پارلر میں ملازمت دلوا دے گا۔ اس لیے سعدیہ بیگم نے طے شدہ تنخواہ سے آدھی تنخواہ صدیق کو بتائی تھی۔ تاکہ آدھی انیلہ کو دے سکے جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ سعدیہ بیگم کو ویسے بھی اُس چھوٹی سی مظلوم لڑکی سے دلی ہمدردی تھی۔ جس کا سگا باپ ہی اُسے محنت مشقت کی چکی میں پسنے کے لیے معاشرے کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اُس کے پیسے سے عیش کر رہا تھا اور اس عمر میں دوسرا بیاہ رچا کر پہلی بیوی اور بچوں کے فرائض سے ہمیشہ کے لیے بری الذمہ ہو گیا تھا۔ نشہ واقعی انسان کے ہوش و حواس چھین کر اُسے بے غیرت اور خود غرض بنا دیتا ہے۔ صدیق کی مکروہ شکل کو دیکھ کر سعدیہ بیگم کا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔

''حارث آپ مجھے آفس کے گیٹ کے بجائے کسی قریبی بس اسٹاپ پر اتار دیا کریں۔'' اگلے دن حارث جب انیلہ کو اُس کے آفس ڈراپ کرنے جا رہا تھا تو انیلہ نے اُسے کہا۔

''کیوں؟'' حارث نے رُخ موڑ کر اُسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ جواب میں انیلہ نے صدیق کے آفس میں آنے اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بارے میں بتا دیا۔ تو حارث نے کچھ سوچ کر حامی بھر لی۔ اور اُسے ایک بس اسٹاپ کے قریب اُتار کر چلا گیا۔

ہفتے میں دو تین مرتبہ صدیق دکان سے چھٹی کے بعد انیلہ کو لینے پہنچ جاتا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل بہت خستہ حال ہو چکی تھی۔ جب وہ اس پھٹ پھٹ کرتی موٹر سائیکل پر اُسے لینے کے لیے آتا تو اُسے بہت شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک دن اُس نے حارث سے اس سلسلے میں بات کی تو اُس نے اُسے نئی موٹر سائیکل کے لیے پیسے دے دیے اور انیلہ نے یہ کہہ کر وہ رقم صدیق کو دی کہ اُس نے آفس سے قرضہ لیا ہے اس سے وہ نئی موٹر سائیکل لے لے۔ چنانچہ صدیق نے خوش ہو کر نئی چم چماتی ہنڈا سی ڈی 70 خرید لی۔ اس طرح انیلہ نے ایک تیر سے دو شکار کیے ایک تو صدیق کا منہ بند کر دیا تھا کہ وہ بلاوجہ اُس کے بارے میں مزید چھان بین نا کرتا پھرے...... دوسرے حارث سے بھی ایک بڑی رقم بٹور کر اُس کی زیادتیوں کا بدلہ لیا تھا۔

اب وہ اکثر ہی کسی نا کسی بہانے اُس سے پیسے اینٹھتی رہتی تھی۔ کپڑے خریدنے کے لیے، کبھی میک اپ کا سامان لینے...... اور کبھی جیولری وغیرہ کے لیے اور وہ بڑی فراخ دلی سے اُس کی منہ مانگی رقم اُسے دان کر دیتا تھا اور انیلہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ ایک فیشن میگزین نکالنے کی وجہ سے وہ اس قدر پیسہ کما لیتا ہے کہ اپنے گھر اور بیوی بچوں کے اخراجات کے بعد اِدھر اُدھر بھی لٹاتا پھرتا ہے اب وہ بہت چالاک ہوتی جا رہی تھی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ ایک موٹی آسامی اُس کے جال میں پھنس چکی ہے اور وہ دل کھول کر اُسے لوٹے گی۔

اور اگر اُس نے اُس سے شادی نا بھی کی تو کم از کم اُس سے اتنا پیسہ تو بٹور ہی لے گی کہ اپنی زندگی آرام سے گزارے۔ ویسے اُسے اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ حارث اُس سے شادی ضرور کرے گا۔ کیونکہ وہ اُس کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ ایک روز بھی اُس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

سارا دن وہ چونکہ فارغ ہوتا تھا۔ اس لیے دن میں کئی بار اُسے فون کرتا تھا۔ باقاعدگی سے اُسے پارلر کے قریبی بس اسٹاپ پر لینے آتا تھا۔ پھر کبھی اُسے کسی ہوٹل میں بک کیے گئے کمرے میں لے جاتا۔ کبھی کسی دوست کے خالی اپارٹمنٹ میں تو کبھی اپنے گھر میں جب کبھی اُس کی بیوی گھر میں نا ہوتی۔ اور یوں دونوں ہی ایک دوسرے کو بیوقوف بنا رہے تھے۔ انیلہ اکثر اُس سے اپنے باپ کے دکھڑے روتی رہتی تھی اُس نے حارث سے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے تعلیم حاصل نا کرنے اور فاقے کرنے کے بارے میں اس قدر رقت آمیز انداز میں ذکر کیا کہ اُس کا دل پسیج گیا۔ اور وہ اُس کے باس کے دوست کی حیثیت سے ایک دن اُس کے گھر پہنچ گیا۔ اور اُس نے صدیق کو سمجھایا کہ وہ سارے بچوں کو تعلیم دلائے اُس نے اُسے کہا کہ بچوں کی پڑھائی کے اخراجات کے بارے میں فکر نا کرے۔ یہ سارے اخراجات آفس کی طرف سے ادا کیے جائیں گے۔ چنانچہ ظفر اور اظہر کو ورکشاپ سے نکال کر ایک اکیڈمی میں داخل کروا دیا گیا۔ جہاں وہ میٹرک کی تیاری کرنے لگے۔ اسی طرح جمیلہ اور راحیلہ کو بھی لڑکیوں کے ایک ٹیوشن سینٹر میں داخلہ مل گیا۔ جہاں دو سال کی تیاری کے بعد وہ لوگ میٹرک کر سکیں گی۔

چھوٹی نبیلہ اور چھوٹے دونوں بچوں کو بھی اسکول میں داخلہ دلا دیا گیا۔ حارث گھر کے دیگر اخراجات کے لیے بھی صدیق کے علم میں لائے بغیر انیلہ کو خاصی رقم دینے لگا۔ اور یوں اپنی ذات کی قربانی دے کر انیلہ اپنے بہن بھائیوں اور گھر کی حالت بدلنے میں کامیاب ہو گئی اور اپنے ذاتی دکھ کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر اُس نے سوچا کہ اگر اُس کی حقیر اور بے مصرف ذات اُس کے خاندان کی حالت کو بہتر کرنے میں کسی طرح معاون ہو سکتی ہے تو یہی سہی، البتہ حارث کے ساتھ گناہ آلود تعلقات پر اُس کا ضمیر اِسے ملامت کرتا تھا۔ اور وہ اکثر ہی اُسے دبے دبے لفظوں میں شادی کا کہتی رہتی تھی۔ مگر حارث ہوں ہاں کر کے ٹال دیتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ حارث کی بیوی نے ایک بڑی رقم حق مہر کے طور پر لکھوائی تھی۔ پھر جس گھر میں حارث رہ رہا تھا۔ یہ بھی اُس کے والدین نے اُسے جہیز میں دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اُس کے والد گاہے بگاہے اپنی بیٹی کی مدد کرتے رہتے تھے۔ اسی لیے تو حارث بے فکری اور عیش و عشرت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ جیسے ہی اُس نے انیلہ یا کسی اور لڑکی سے شادی کی تو اُس کی بیوی اُسی لمحے اسے چھوڑ دے گی اور اُس سے طلاق لے کر اُسے سڑک پر آنے پر مجبور کر دے گی۔ اور وہ خالی ہاتھ رہ جائے گا۔ یوں بھی وہ انیلہ کے ساتھ محض وقت گزاری کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

جب ہاسٹل کے ایڈریس پر سامیہ کو براؤن کلر کا رجسٹرڈ لیٹر موصول ہوا تو دستخط کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ بری طرح کانپنے لگ گئے۔ کیونکہ یہ لیٹر وہاب کی طرف سے تھا اور اچھی طرح جانتی تھی کہ اُس کے اندر کیا ہے۔ خط ہاتھ میں پکڑے وہ بوجھل قدموں سے اپنے اور ماہ رخ کے مشترکہ کمرے میں آ گئی۔ ماہ رخ کمرے میں نہیں تھی۔ وہ ساتھ والے کمرے میں مقیم اپنی کلاس فیلوز زیب النساء اور فریحہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے انارکلی گئی ہوئی تھی۔

سامیہ کمرے میں آ کر دروازہ بند کر کے گرنے کے انداز مین اپنے بیڈ پر لیٹ گئی اور پھر لرزتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کر لیا۔ وہاب احمد نے اُسے اس شرط پر طلاق بھیج دی تھی کہ وہ حق مہر اپنے جہیز اور بچوں سے دست بردار ہو جائے گی۔ اور زندگی کے کسی موڑ پر بھی وہ نا بچوں پر اپنا حق جتائے گی اور نا ہی حق مہر اور اپنے جہیز کا مطالبہ کرے گی۔

کہاں تو وہ اس زبردستی کے ناپسندیدہ رشتے کو ہمیشہ سے ختم کرنے کی آرزومند تھی مگر پتہ نہیں کیا ہوا کہ اُس کا دل اچانک بھر آیا اور وہ تکیے میں منہ چھپا کر دھواں دھار رونے لگی۔ اُسے اپنی اس کیفیت کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ خوشی کے آنسو تھے یا دکھ کے......

دراصل اُسے یقین نا تھا کہ وہاب اُسے اس قدر آسانی سے طلاق دے دے گا۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہاب اُس کے عشق میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ وہ اُس سے جدائی کا تصور بھی محال سمجھے گا۔ کئی مرتبہ اُس نے اُس سے بدتمیزی کی تھی۔ اُس کا گھر چھوڑ کر والدین کے گھر جا بیٹھی تھی۔ اُسے نظرانداز کرتی تھی...... کبھی اُس کے ساتھ لگاوٹ سے بات کی نا ہی اُسے شوہر کی حیثیت سے وہ عزت اور احترام دیا جس کا وہ آرزومند ہی رہا۔ وہ جب تک اُس کے گھر میں رہی ہمیشہ ہی من مانی کرتی رہی۔ اس کے باوجود پتہ نہیں کیوں اُسے امید واثق تھی کہ وہاب اُسے چھوڑنے کا کبھی بھی فیصلہ نہیں کرے گا۔

دنیا کی کوئی بھی عورت نہیں چاہتی کہ اُس کا بسا بسایا گھر اجڑ جائے۔ وہ گھر سے بے گھر ہو جائے اور طلاق جیسا کلنک اُس کی ذات پر لگے۔ شوہر ظالم ہو، بے وفا ہو، بدصورت ہو، جاہل ہو، دنیا بھر کے عیب اُس میں کیوں نا ہوں پھر بھی عورت کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ دنیا والوں کی نظروں میں اُس کا بھرم قائم رہے اندرونِ خانہ اُس کے ساتھ کیسا ہی برابرتاؤ ہو مگر پھر بھی وہ اپنے گھر کو بچانے کی تگ و دو کرتی رہتی ہے۔

اگرچہ سامیہ عام عورتوں کی طرح نا تو شوہر پرست تھی نا ہی اُسے گھر کے بسنے یا اجڑنے کی کوئی فکر تھی بلکہ وہ تو اس ناگوار اور بے جوڑ بندھن کے ٹوٹنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ تاکہ آزادی اور بے فکری سے اپنی تعلیم مکمل کرے اور پھر کسی آئیڈیل بندے کو اپنا جیون ساتھی بنا کر سکھ چین سے ایک آئیڈیل زندگی بسر کرے۔ اور آج اُس کی ایک خواہش تو بر آئی تھی کہ وہاب جیسے قابلِ نفرت شخص سے اُسے چھٹکارا مل گیا تھا۔ تو وہ رو رہی تھی جب کافی دیر رونے کے بعد دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو پھر اُس نے سعدیہ بیگم کو فون کیا۔ وہ اس وقت پارلر میں تھیں۔

''کیا بات ہے سامی کیسے فون کیا؟ خیریت ہے نا؟'' سعدیہ بیگم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... وہ...... امی...... مجھے...... طا...... طا...... طلاق...... مل گئی ہے۔'' سامیہ نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بمشکل اپنی بات مکمل کی اور پھر رونے لگی۔

''ک...... کیا...... کہہ...... رہی ہو؟'' سعدیہ بیگم نے بوکھلا کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو واضح طور پر بتا دیا ہے اچھا خدا حافظ میں پھر فون کروں گی فی الحال میری کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ میں اس سلسلے میں مزید بات کر سکوں۔'' یہ کہہ کر سامیہ نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

سعدیہ بیگم کچھ دیر تو ہکا بکا سی ہاتھ میں پکڑے موبائل کو گھورتی رہیں۔ پھر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے ہاتھ پیروں میں جان ہی نا رہی ہو سر میں عجیب سے دھماکے ہو رہے تھے۔ سارا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

''امی...... امی پ...... آپ ٹھیک تو ہیں کس کا فون تھا...... کیا ہوا؟'' سمعیہ جو ایک کلائنٹ کے بالوں کو ڈرائی کر رہی تھی۔ ماں کے زرد پڑتے چہرے پر نظر پڑی تو ماں کے پاس چلی آئی۔

''سمعیہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے گھر چلے جانا چاہیے۔'' سعدیہ بیگم نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''لیکن امی آپ اکیلی کیسے جائیں گی چلیے میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔'' پھر وہ پارلر میں کام کرنے والی ایک سینئر اور ذمہ دار لڑکی سے کہنے لگی۔

''عالیہ ہم لوگ گھر جا رہے ہیں تم لوگ پارلر میں موجود کلائنٹس کو فارغ کر کے گھر چلی جانا۔ چابی تو تمہارے پاس ہوتی ہے نا۔''

''جی بہتر باجی۔'' عالیہ نے جواب دیا۔ تو سمعیہ ماں کو سہارا دے کر پارلر سے باہر نکل آئی اور انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑے کشنز سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر نہایت محتاط

انداز میں گاڑی ڈرائیو کرنے لگی۔

''کیا بات ہے...... اتنی جلدی کیسے آ گئے آپ لوگ؟ امی کہاں ہیں؟'' گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر گیٹ کھولتے ہوئے ہانیہ نے پوچھا۔ مگر سمعیہ کوئی جواب دیے بغیر گاڑی کو گیراج میں لے گئی۔ پھر دونوں بہنوں نے سہارا دے کر ماں کو گاڑی سے اُترنے میں مدد دی۔ اور انہیں اُن کے کمرے میں لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ شیراز اور چھوٹی دونوں بہنیں ڈرائنگ روم میں اپنی ٹیوٹر سے پڑھ رہی تھیں۔ گاڑی کی آواز سن کر وہ بھی گھبرا کر باہر نکل آئے تھے۔

''کیا ہوا ہانی آپی...... امی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' تینوں بچوں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں...... وہ امی کی تھوڑی سی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے سمعیہ انہیں گھر لے آئی ہے۔ تم لوگ جاؤ جا کر پڑھو، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' ہانیہ نے تینوں بچوں سے کہا۔ تو وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

''امی یہ جوس پی لیں۔ آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی۔'' ہانیہ نے بیڈ پر نڈھال پڑی سعدیہ بیگم کے پاس جا کر کہا۔ تو سمعیہ نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا۔ اور ہانیہ نے جوس کا گلاس اُن کے لبوں سے لگا دیا۔ دو گھونٹ جوس لے کر کہا۔

''نہیں پلیز امی پورا گلاس پی لیں...... گرمی بھی تو بہت ہے موسم بھی حبس آلود ہے۔ سمعیہ اے سی آن کر دو۔ کولنگ کم رکھنا۔'' ہانیہ نے جوس کا گلاس دوبارہ سعدیہ بیگم کے لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ پھر گھونٹ گھونٹ کر کے سعدیہ بیگم نے جوس پی لیا۔ تو اُن کی طبیعت قدرے بحال ہوئی۔

''امی اس قدر گرمی میں آپ پارلر نا جایا کریں۔ سارا دن وہاں اکیلی ہوتی ہے پھر عالیہ بھی بہت سمجھدار ہے۔ میں اور سمعیہ بھی باری باری چلی جاتی ہیں۔ آپ تھک جاتی ہیں اب آپ سے اتنی محنت نہیں ہوتی۔ پھر پچھلے کچھ دنوں سے آپ سامی آپی کی وجہ سے بھی ٹینشن میں ہیں۔'' ہانیہ نے ماں کے سر کو ہولے ہولے دباتے ہوئے کہا۔ سامیہ کا نام سن کر سعدیہ بیگم کو دوبارہ گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ اور پھر وہ بے اختیار رونے لگیں۔

''امی جی...... پیاری امی...... کیوں رو رہی ہیں۔ آپ...... اس سے تو آپ کی طبیعت اور زیادہ بگڑ جائے گی۔ کہیں سامیہ آپی نے تو کچھ نہیں کہا آپ کو...... کیونکہ جب سے پارلر میں آپ کو فون آیا ہے۔ اُس وقت سے ہی آپ کی یہ حالت ہے میں نے آپ کے موبائل کو چیک کیا ہے۔ سامیہ آپی ہی کے نمبر سے کال آئی تھی۔'' اچانک سمعیہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

''وہ...... کیسے بتاؤں؟'' سعدیہ بیگم نے اپنی کنپٹیوں کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔

''امی پلیز آپ کے ذہن پر جو بھی بوجھ ہے۔ اُس سے چھٹکارے کی یہی صورت ہے کہ جو بات بھی آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ وہ کہہ دیں ورنہ آپ کا بی پی اور شوگر لیول پریشانی سے مزید بڑھ جائے گی۔'' سمعیہ نے ماں کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں امی...... سمعیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پلیز آپ یوں خود کو ہلکان نا کریں۔ اور جو بھی بات ہے فوراً کہہ ڈالیں۔ ہماری پریشانی کا خیال نا کریں۔'' ہانیہ نے ماں کے بالوں کو سمیٹ کر کلپ لگا دیا۔ جو بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔

''کیا کہوں...... کیسے کہوں...... تقدیر نے یہ دن بھی دکھانا تھا۔ یہ سب سامیہ کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ وہاب ایسا نہیں تھا۔ اُس نے اتنے برسوں تک اُس کی بدتمیزیوں کے باوجود اُس سے نبھاہ کرنے کی کوشش کی۔ اب جب تم دونوں کے سسرال والوں کو پتہ چلے گا کہ بڑی بیٹی کی طلاق ہو گئی تو وہ کیا سوچیں گے۔ وہ یہی سمجھیں گے نا کہ سامیہ ایسی ویسی تھی تبھی تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اُس کے شوہر نے اُسے طلاق دے دی کس قدر بدنامی ہوگی پورے خاندان میں اس نا ہنجار لڑکی نے ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' یہ کہہ کر سعدیہ بیگم ہچکیوں سے رونے لگیں۔

''امی...... امی پلیز آپ نا روئیں۔ کچھ نہیں ہوگا

کوئی ہمیں کچھ نہیں کہے گا جو تقدیر میں لکھا تھا وہ ہو گیا یہ پاپا کا بھی قصور ہے کہ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے سامی آپی کے انکار کے باوجود اتنی چھوٹی عمر میں اُس سے دوگنی عمر کے شخص سے اُس کی شادی کر دی۔ ایسی بے جوڑ شادیوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ آپ لوگ سامی آپی کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ پڑھی لکھی ہیں ڈاکٹر بن رہی ہیں اُن کا مستقبل محفوظ ہے۔

رہی بات ہم دونوں کے سسرال والوں کی تو اگر وہ ایسے ہی چھوٹی ذہنیت کے مالک ہیں کہ محض بہن کی طلاق ہو جانے پر ہمارے ساتھ رشتہ ختم کر دیں گے تو کر دیں۔ ہم کوئی گری پڑی نہیں کہ ایسے لوگوں کے لیے پریشان ہوتے رہیں کہ وہ یہ کہیں گے وہ کہیں گے ۔ اب زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے آج کی پڑھی لکھی عورتیں باشعور اور پُراعتماد ہیں وہ کسی کا دستِ نگر بن کر رہنے کے بجائے اپنے زورِ بازو کے بل پر جینا چاہتی ہیں۔ آپ نے بھی تو ساری زندگی پارلر چلا کر گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پاپا کا بھرپور ساتھ دیا ہے نا۔''

سامی آپی کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ اُن کی قسمت تھی۔ اور اِس سلسلے میں وہاب بھائی کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انہوں نے کیوں اُن کے کردار پر حملہ کیا۔ ملازموں کے ذریعے اُن کی ٹوہ لینے کی کوشش کی۔ سامی آپی بہت مضبوط کردار کی مالک ہیں۔ وہ کبھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتیں۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ یہ سب کچھ وہاب بھائی کی شکی طبیعت کی وجہ سے ہوا ہے۔'' ہانیہ نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ ہی بہتری فرمائیں ورنہ تو میں بہت مایوس اور پریشان ہوں۔ میری لاڈلی بچی پر ہمیشہ کے لیے گھر کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ تمہارے پاپا نے سختی سے کہہ دیا ہے کہ اُن کے جیتے جی وہ اِس گھر کی دہلیز پار نہیں کر سکتی۔ وہ تو انہوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی کبھی بھی اُس سے کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ سامیہ خود ہی مجھے فون کر لیتی ہے کیا کروں ماں ہوں نا۔ اُس سے بات کیے بغیر رہ نہیں سکتی۔ پتہ نہیں اب کیسے اپنی تعلیم مکمل کرے گی۔ وہ تو بالکل تہی داماں ہے۔'' سعدیہ بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''نہیں امی آپی اتنی بھی تہی داماں نہیں ہیں۔ وہاب بھائی نے میڈیکل کی پڑھائی کے پورے پانچ سالوں کے اخراجات اُن کے نام بینک میں جمع کروا دیے تھے اور اُس کے علاوہ سارے زیورات بھی بینک کے لاکر میں ہیں۔ یہ لاکر بھی آپی کے نام پر ہے بینک کی چیک بک اور لاکر کی چابی ہر وقت آپی کے پرس میں ہوتی ہے یہ بات کچھ عرصہ پہلے ہی آپی نے مجھے بتائی ہے۔ انشاء اللہ اُن کی تعلیم بغیر کسی رکاوٹ کے مکمل ہو جائے گی۔ اُن کا تعلیمی ریکارڈ ہمیشہ ہی شاندار رہا ہے میڈیکل کالج کے فرسٹ پروف میں بھی انہوں نے سیکنڈ پوزیشن لی تھی۔ اور اب بھی یقیناً وہ اچھے نمبر ہی لیں گی۔ فی الحال تو کالج میں دو ماہ کی چھٹیاں ہیں۔ وہ اپنی دوست ماہ رخ کے ساتھ ہاسٹل کے کمرے میں رہ رہی ہیں۔ ہاسٹل کے اخراجات بھی انہوں نے ادا کر دیے ہیں۔ اس لیے انہیں اس سلسلے میں کوئی ٹینشن نہیں ہے آپ بس اُن کی کامیابی کے لیے دعا کیا کیجیے۔ رہی پاپا کی ناراضگی کی بات تو وہ بھی جب انہیں آپی کی بے گناہی کا یقین ہو جائے گا تو وہ انہیں معاف کر کے خود ہی گھر لے آئیں گے۔ ہانیہ نے نہایت تفصیل سے ماں کو بتایا تو سعدیہ بیگم نے اطمینان کی سانس لی اور ہر قسم کے اندیشوں سے اُن کا ذہن آزاد ہوا تو اُن کی طبیعت بھی کافی بہتر ہو گئی۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے سامیہ تم اتنی پریشان کیوں ہو ابھی تک بیڈ پر کیوں لیٹی ہوئی ہو اتنا دن چڑھ آیا ہے۔ تم نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا اور اب بھی ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال میں نہیں گئیں۔ خیریت ہے نا۔'' ماہ رخ نے کمرے میں داخل ہو کر بیڈ پر ویران چہرہ لیے لیٹی ہوئی سامیہ کو دیکھ کر پوچھا۔

''وہ وہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' سامیہ نے کمزور آواز میں کہا۔

''مگر یہ اچانک تمہاری طبیعت کیسے خراب ہو گئی۔

کل شام کو جب میں تمہیں کمرے میں چھوڑ کر گئی تھی۔ تو تم ٹھیک ٹھاک تھیں۔ پھر اچانک کیا ہو گیا؟ گھر میں تو سب ٹھیک ہیں ایک تو مجھے تمہاری یوں اچانک ہاسٹل میں آ کر رہنے کی وجہ بھی سمجھ نہیں آ رہی۔ کوئی گڑبڑ ہے کیا۔ تم اگر مجھے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھتیں تو تمہاری مرضی۔'' ماہ رخ نے قدرے ناراض ناراض سے لہجے میں کہا۔ تو سامیہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

'' آؤ یہاں بیٹھو میرے پاس...... پلیز تم تو مجھ سے ناراض نا ہو۔ ایک تم ہی تو اس بھری دنیا میں واحد مخلص ہستی ہو جس پر میں آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی ہوں۔ اسی لیے تو سیدھی تمہارے پاس ہی آئی ہوں۔'' سامیہ نے آنکھوں میں بے اختیار امڈ آنے والے آنسو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر پرس سے طلاق نامہ ماہ رخ کی جانب بڑھا دیا۔

'' ہوں...... تو یہ بات ہے۔ تم تو اپنے شوہر کو ناپسند کرتی تھیں۔ پھر طلاق ملنے پر اس قدر سوگ منانے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔'' ماہ رخ نے حیران ہو کر پوچھا۔

'' تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی نا۔ اس لیے تم نہیں سمجھو گی کہ ایک شادی شدہ عورت کو بغیر کسی وجہ اور قصور کے طلاق دے دی جائے تو یہ معاشرہ عورت ہی کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ کوئی اُس مرد سے باز پرس نہیں کرتا۔

'' یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ کسی حد تک اُس سے نفرت ہی کرتی تھی۔ مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس طرح مجھے طلاق دے کر میرے والدین اور بہن بھائیوں کی نظروں میں مجھے گرا دے گا۔ میرے پاپا سراسر مجھے قصوروار سمجھتے ہیں۔''

'' محض میری وجہ سے نا صرف میرے والدین کو رسوائی ہوئی ہے بلکہ میری معصوم اور بے قصور بہنوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگ چکا ہے۔ کاش ایسا نا ہوتا۔'' یہ کہہ کر سامیہ ماہ رخ کے کندھے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔

'' حوصلہ کرو سامی میری پیاری دوست' میری پیاری بہنا جو ہو گیا سو ہو گیا اب تم رو رو کر اپنی صحت تباہ نا کرو۔ انشاء اللہ کچھ نہیں ہو گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آئے روز اتنی عورتوں کی طلاقیں ہوتی ہیں وہ بھی تمہاری طرح ہو جائیں یا رونے دھونے لگیں تو دنیا والے مزید اُن کا تماشا بنائیں گے۔ تم پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ تم اپنے حوصلے بلند رکھو۔ اپنی تعلیم مکمل کرو اور اپنے قدموں پر کھڑی ہو کر دنیا کو بتا دو کہ تم اتنی بھی کمزور نہیں ہو کہ ایک خود غرض اور گھٹیا ذہنیت کے مرد کی وجہ سے اپنی زندگی برباد کر لو۔ رہے والدین تو کچھ عرصے بعد اُن کا غصہ بھی اتر جائے گا۔ والدین اپنی اولاد کو کبھی بھی بے یارومددگار نہیں چھوڑتے۔ بس اب اٹھو اور اپنا حلیہ درست کرو۔ میں تمہارے لیے کھانے کے لیے کچھ منگواتی ہوں۔'' ماہ رخ نے سامیہ کو پیار سے کہا تو اُس کا دکھ کافی حد تک کم ہو گیا۔ اور اُسے اپنے اندر ایک توانائی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

'' مگر ماہ رخ ایک بات اور ہے جس پر میں نے اب غور کیا ہے۔ دیکھو نا مجھے طلاق ہوئی ہے۔ اس لیے اب میں عدت میں ہوں۔ مگر دو ماہ بعد تو کالج کھل جائیں گے۔ بلکہ وارڈز کی ڈیوٹیاں تو ہم لوگ اب بھی دے رہے ہیں تو پھر میں کیا کروں گی؟'' سامیہ نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

'' ہاں اس سلسلے میں کسی سے پوچھنا پڑے گا۔ کیونکہ اس طرح تو تمہاری پڑھائی کا حرج ہو گا۔ میں زیب النساء اور فریحہ سے بات کرتی ہوں۔ وہ ضرور کسی کو جانتی ہوں گی جو اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکے۔'' ماہ رخ نے کچھ سوچ کر کہا۔

'' اس طرح تو بات بہت پھیل جائے گی۔ میں نے تو سوائے چند ایک قریبی دوستوں کے کبھی کسی کو اپنے شادی شدہ ہونے کا بھی نہیں بتایا تھا اور اب طلاق......'' سامیہ نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

'' زیب النساء اور فریحہ کے بارے میں فکر نا کرو وہ ہماری کلاس فیلو اور میری بہت اچھی دوست ہیں وہ کسی سے بھی ذکر نہیں کریں گی۔ میں انہیں سختی سے منع کر دوں گی بس اب الٹی سیدھی باتیں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان نا کرو۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے کوئی نا

کوئی بہتری کی صورت نکل ہی آئے گی۔" ماہ رخ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ تو سامیہ کی جان میں جان آئی اور وہ غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے کے لیے باتھ روم چلی گئی۔

جب ماہ رخ نے زیب النساء سے بات کی تو اُس نے اپنے والد کے ایک دوست قاری صاحب کے بارے میں بتایا۔ زیب النساء کے والد ہی نے قاری عبدالجبار صاحب سے رابطہ کیا اور سامیہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو انہوں نے یہی مشورہ دیا کہ بچی چونکہ زیرِ تعلیم ہے۔ اس لیے وہ باپردہ لباس پہن کر وارڈز کی ڈیوٹی بھی کر سکتی ہے اور اپنی کلاسز بھی اٹینڈ کر سکتی ہے۔ البتہ اس کے علاوہ اُسے ہاسٹل کی چار دیواری ہی میں رہنا ہوگا۔ اور بلاوجہ وہاں سے نکلنا اُس کے لیے نامناسب ہوگا۔

چنانچہ قاری صاحب کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق سامیہ نے نہایت صبر اور حوصلے کے ساتھ شرعی طور پر ضروری عدت کی مدت گزاری۔ تو پھر وہ تمام بندشوں سے آزاد ہوگئی۔ اب اُس پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ اور وہ ساری فکروں کو ذہن سے جھٹک کر اپنی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہوگئی۔ اسی دوران اُس کا سکینڈ پروف کا رزلٹ بھی آچکا تھا۔ اور حسبِ معمول اُس نے اس امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔

والدین کے گھر میں اُس کا داخلہ ہنوز بند تھا۔ ہفتے میں ایک دو مرتبہ اُس کی امی اور باقی بھائی بہنوں سے بات چیت ہو جاتی تھی۔ جس سے اُسے گھر کے حالات بھی پتہ چلتے رہتے تھے۔ اور سب کی خیریت بھی معلوم ہو جاتی تھی۔ ہانیہ نے اُسے بتایا تھا کہ پاپا بہت زیادہ چپ چپ رہنے لگے ہیں اُن کی طبیعت بھی اکثر ناساز رہتی ہے۔ کاروبار بھی مندا جا رہا تھا۔ کیونکہ وہاب نے کاروبار سے اپنا حصہ نکال لیا تھا۔ اور پاپا کے اتنے وسائل نا تھے کہ وہ اپنے طور پر کاروبار کو منافع بخش پیمانے پر چلا سکیں۔ یہ سن کر سامیہ کو بہت دکھ ہوا تھا مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔

وہاب نے خود ہی اُسے اپنی زندگی سے علیحدہ کیا تھا۔ اُس کی اتنے سال کی سمجھوتے کی کوشش اور قربانیوں کا اچھا صلہ تھا۔ اُسے مگر سامیہ کو کبھی بھی اپنے پاپا پر بھی یہ سوچ کر غصہ آتا تھا کہ ساری زندگی وہ اتنا بھی نا کر سکے کہ اپنا کاروبار اپنے بل پر چلا سکیں۔

پاپا سے تو امی بہتر ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے پارلر کو اپنی محنت اور کوشش سے چلایا اور کبھی کسی کی مدد طلب نا کی۔ تبھی تو آج اُن کا پارلر بڑے بڑے نامور پارلرز کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اور بے حد منافع بخش ہو چکا ہے۔

"بس آپ کی مجھے بہت فکر ہے کہ یوں اپنے لوگوں سے کٹ کر تمہارے لیے کتنا مشکل ہے زندگی گزارنا...... پھر میڈیکل کی ٹف پڑھائی کا بوجھ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔" ہانیہ نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

"میری فکر نا کرو، اتنے سالوں تک ایک بددماغ شخص کے ساتھ رہ رہ کر میں خاصی مضبوط ہو چکی ہوں۔ انشاء اللہ میری تعلیم بھی بہت اچھی طرح سے مکمل ہو جائے گی۔ اور پھر ہمارے کافی مسائل حل ہو جائیں گے۔ اور تم بتاؤ کہ تمہارے اور سمعیہ کے سسرال والے کیسے ہیں؟" سامیہ نے اپنی بات مکمل کر کے پوچھا۔

"وہ لوگ ٹھیک ہیں اکثر شہاب کا فون بھی پاپا کو آتا رہتا ہے۔ نعمان بھائی بھی کال کرتے رہتے ہیں انکل مبارک اور آنٹی عفیرہ ہفتے دو ہفتے بعد چکر لگا لیتے ہیں۔ نعمان بھائی کے گھر والے تو گجرات میں ہوتے ہیں۔ وہ خود تو نہیں آسکتے مگر نعمان کے ذریعے خیریت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ ہانیہ نے تفصیل سے بتایا۔

"اُن لوگوں کو میری ...... طا...... طلاق کے بارے میں علم ہوا ہے کہ نہیں؟" سامیہ نے تیز تیز دھڑکتے دل کے ساتھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ابھی تو ذکر نہیں کیا۔ امی کہتی ہیں کہ ہم لوگ خود سے کچھ نہیں بتائیں گے اگر اپنے طور پر اِدھر اُدھر سے انہیں معلوم ہو گیا تو پھر دیکھیں گے کہ اُن کا کیا ردِعمل ہوتا ہے۔" ہانیہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"مجھے یقین کامل ہے کہ وہ لوگ کسی بھی ایسے ویسے ردِعمل کا اظہار نہیں کریں گے۔ دونوں گھرانے

ہی پڑھے لکھے اور مثبت سوچ رکھتے ہیں۔''

''اچھا آپی...... کافی لمبی کال ہوگئی ہے موبائل کی بیٹری بھی چارج نہیں پھر بات کریں گے۔ او کے اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ......'' یہ کہہ کر سامیہ نے کال منقطع کردی۔ اور پھر رات کی وارڈ کی ڈیوٹی کے لیے تیاری کرنے لگی۔

سامیہ ہاسپٹل کے میڈیکل وارڈ میں ایک مریضہ کی ہسٹری لے رہی تھی کہ کوئی چپکے سے اُس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ سامیہ کو عجیب سا احساس ہوا۔ اُس نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو ڈاکٹر عدیل اُس کے بے حد قریب کھڑا اُسے اپنی والہانہ نگاہوں سے تک رہا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''بس جی رہی ہوں۔'' سامیہ نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''آپ اچانک کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ ہم لوگ جب بھی اکٹھے ہوتے آپ کو بہت یاد کرتے۔ حرا سے آپ نے تمام رابطے منقطع کردیے وہ کئی روز تک بہت دکھی اور پریشان رہی کہ بچپن کی اتنی گہری اور پُر خلوص دوستی یوں ایک دم ہی ختم ہوگئی۔

ایاز کی شادی میں بھی آپ شامل نہیں ہوئیں حرا نے آپ کے گھر کے کئی چکر لگائے مگر کسی نے بھی آپ کے بارے میں کچھ نا بتایا پھر ایک روز وہ ایاز کے ساتھ آپ کے سسرال گئی تو وہاں گیٹ ہی پر چوکیدار نے بتایا کہ آپ وہاں سے چلی گئی ہیں اور آپ کے شوہر نے آپ کو طلاق دے دی ہے۔ پھر حرا نے آپ کے کالج سے پتہ کروایا تو اُسے بتایا گیا کہ آپ ہاسٹل میں رہ رہی ہیں اور جب وہ آپ سے ملنے ہاسٹل میں آئی تو وہاں یہی بتایا گیا کہ آپ وہاں نہیں رہتیں اور کسی کو بھی آپ کے ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔'' عدیل نے حسب عادت تیز تیز بولتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''پہلے تو سامیہ کا دل چاہا کہ جس شخص کی وجہ سے اُس کی بدنامی ہوئی اُس کا گھر اجڑا اُس کے والدین اور بہن بھائیوں کو ذہنی اذیت اٹھانی پڑی۔ اِسے جھڑک دے۔ یا پھر نظر انداز کردے۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ اس میں اس شخص کا کیا قصور یہ تو وہاب جیسے شکی اور گھٹیا فطرت تھی جس کی وجہ سے اِس نے اُس پر اس قدر گھناؤنا الزام لگا کر اُس سے اپنے راستے علیحدہ کرلیے۔ پھر میں کیوں ایسے مخلص اور مذہب لوگوں سے منہ موڑوں جنہوں نے ہمیشہ مجھے احترام خلوص اور ذہنی سکون ہی مہیا کیا تھا۔

اُسے رہ رہ کر حرا کے ساتھ روا رکھے جانے والے اپنے رویے کی بدصورتی کا بھی شدت سے قلق ہو رہا تھا۔ وہ بے چاری بار بار اُسے فون کرتی مگر وہ اُس کا نام موبائل کی اسکرین پر دیکھ کر موبائل آف کردیتی۔ وہ اُس سے ملنے ہاسٹل آئی مگر اُس نے کہلوادیا کہ وہ وہاں نہیں رہتی۔ کتنی دکھی ہوئی بے چاری۔ سامیہ چپ چاپ کھڑی ایسی ہی باتیں سوچ رہی تھی۔ اُسے عدیل سے بھی شرمندگی محسوس ہورہی تھی کہ وہ کیا سوچے گا کہ وہ اس قدر غیر مہذب ہے۔ مگر ان دنوں اُس کی ذہنی کیفیت ہی ایسی ہورہی تھی کہ اُسے کسی پر بھی اعتماد نہیں رہا تھا۔ اور ہر شخص اُسے اپنا دشمن محسوس ہوتا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہیں میری بات کا جواب بھی دینا گوارا نہیں ہے آپ کو۔'' عدیل نے اُسے یوں گم صم کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

''پلیز ڈاکٹر صاحب ڈیوٹی روم میں تشریف رکھیے میں بس تھوڑی دیر میں وہاں آپ سے ملتی ہوں۔'' بالآخر سامیہ نے عدیل سے کہا۔

''او کے ایز یو وش۔'' یہ کہہ کر عدیل بھاری قدموں سے چلتا ہوا وارڈ سے نکل گیا۔

سامیہ نے جلدی جلدی باقی مریضوں کی ہسٹری لی اور پھر وہ وارڈ سے نکل کر ڈیوٹی روم کی طرف چلی گئی۔ اندر داخل ہوئی تو عدیل نائٹ ڈیوٹی کے انچارج ڈاکٹر فرخ کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا۔

''آیئے آیئے مس سامیہ...... کام مکمل ہوگیا آپ کا؟'' ڈاکٹر فرخ نے سامیہ سے پوچھا۔

''جی سر جن مریضوں کی ہسٹری لینے کی آپ نے ہدایت کی تھی وہ میں نے لے لی ہے بس اب رپورٹ تیار کرنی ہے ابھی کچھ دیر میں تیار کر کے آپ کو دے

دوں گی۔'' سامیہ نے جواب دیا۔

''گڈ......

''ڈاکٹر عدیل یہ مس سامیہ میری اسٹوڈنٹ ہیں اور بہت محنتی اور ذہین ہیں ہر امتحان اور ٹیسٹ میں نمایاں کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ اور وارڈز کی ڈیوٹی بھی باقاعدگی سے توجہ سے دیتی ہیں انشاء اللہ یہ مستقبل میں بہت اچھی ڈاکٹر ثابت ہوں گی۔'' ڈاکٹر فرخ نے سامیہ کی ستائش کی۔

''تھینک یو سر......'' سامیہ نے جواب دیا۔

''اچھا مس سامیہ آپ رپورٹ بعد میں تیار کر لیجیے گا یہ ڈاکٹر عدیل کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔''

''جی سر......'' سامیہ نے مختصراً کہا۔

''پھر آپ لوگ یہاں بیٹھ کر بات کریں۔ میں ذرا وارڈز کا چکر لگا آؤں۔'' ڈاکٹر فرخ نے اپنی کرسی کی بیک پر پڑے اپنے سفید اوور آل کو اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر وہ ڈیوٹی روم سے باہر چلے گئے۔

☆......☆......☆

پنکی کے ہاں چند ماہ بعد دوسرے بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ اور اس کی ایک رٹ تھی کہ عالی لاہور ٹرانسفر کروا لے۔ اس ضد پر وہ زچ ہو چکا تھا۔

''میں ایک اٹھارہ اسکیل کا معمولی آفیسر ہوں۔ نا ہی میرے کوئی لنکس ہیں کہ میں اپنی مرضی کے اسٹیشن پر جب چاہوں ٹرانسفر کروا سکوں۔''

''ٹھیک ہے اگر تم لاہور ٹرانسفر نہیں کروا سکتے تو مجھے لاہور میں گھر لے کر دو۔ میں یہاں اکیلی اس ڈربے میں نہیں رہ سکتی یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ پنکی غصے سے کہتی۔

''میرے اتنے وسائل نہیں کہ میں دو دو گھروں کے اخراجات برداشت کروں۔ رہنا ہے تو یہیں رہو ورنہ اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ۔'' عالی مشتعل ہو کر بولا۔

''تمہاری غیرت کیسے گوارا کرے گی کہ تمہارے بیوی بچے تمہارے سسرال میں رہیں۔''

''اس میں غیرت کی کیا بات ہے جب تم یہاں رہنا نہیں چاہتی ہو اپنے والدین اور بھائیوں کے قریب رہنا چاہتی ہو تو بہتر یہی ہے کہ تم جا کر اُن کے گھر میں ہی رہو تا کہ تمہیں اُن کی جدائی کی اذیت برداشت نا کرنی پڑے۔'' عالی اطمینان سے بولا۔

''ہاں...... ہاں تا کہ تم اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر اپنے گھر والوں پر ساری تنخواہ لٹا دو۔''

''ایک تو تمہیں میرے گھر والوں سے بڑی تکلیف ہے پتہ نہیں یہ تم عورتوں کی کیسی ذہنیت ہے کہ شادی کے بعد اپنے سارے رشتے ساتھ لے کر چلتی ہو اور شوہر اگر اپنے والدین اور بھائیوں بہنوں کا نام بھی لے لے تو تم لوگوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔''

بس آئے روز دونوں میں اسی قسم کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں ہی ضدی اور ہٹ دھرم تھے۔ بلکہ پنکی زیادہ ہی تھی۔ اور وہ ہر ممکن طریقے سے اپنی بات منوا کر رہتی تھی۔ ہار عالی ہی کو ماننی پڑتی تھی۔ کئی روز کی تکرار کے بعد بالآخر وہی ہوا جو پنکی چاہتی تھی۔ اُس نے والدین اور عالی سے ملنے والے زیورات بیچ دیے۔ عالی نے آفس سے لون لیا کچھ پیسے پنکی نے اپنے والدین سے لیے اور یوں اتنی رقم ہو گئی کہ پنکی نے اپنے والدین کے گھر کے قریب ایک دو بیڈ روم کا فلیٹ خرید لیا۔

جب اُس نے عالی کو فون پر خوشخبری سنائی کہ اُس نے فلیٹ خریدا ہے۔ تو عالی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ آئی اور اس نے جلے کٹے لہجے میں طعنے دینے کے انداز میں کہا۔

''یہاں تین بیڈ روم کے اپارٹمنٹ کو تو آپ ڈربہ کہتی تھیں اس میں آپ کا دم گھٹتا تھا تو اُس دو بیڈ روم کے فلیٹ میں کیا حال ہوگا۔''

''بس تمہیں تو موقع چاہیے میری ہر بات کی مخالفت کرنے کا میں نے یہ فلیٹ اس لیے لیا ہے کہ یہاں میں نے جمیلہ بواء کے ساتھ اکیلے رہنا ہے اس لیے فلیٹ زیادہ سیف رہے گا۔ پھر جب تم لاہور آ جاؤ گے تو ہم اس فلیٹ کو بیچ کر کچھ اور پیسے ملا کر بڑا گھر خرید لیں گے۔'' پنکی نے چہک کر کہا۔

''بڑے گھر کے خواب ہی دیکھتی رہنا اب کیونکہ کئی برس تو آفس سے لیا گیا لون ہی ادا کرنے میں لگ جائیں گے جو تھوڑی بہت بچت تھی وہ لون کی قسط ادا کرنے میں استعمال ہو جایا کرے گی۔ پھر تمہارا اور بچوں کا وہاں کا خرچہ...... یہاں میرا خرچہ...... پھر لاہور اور کراچی آنے جانے کا خرچ الگ...... پہلے تو سال میں ایک دو چکر ہی لگا کرتے تھے۔ اب محترمہ کی خواہش ہوگی کہ میں ہر ماہ لاہور آؤں کسی بچے کو چھینک بھی آئے گی تو فوراً بلاوا آجایا کرے گا۔'' عالی نے کھری کھری سناتے ہوئے کہا۔

پنکی کی دلی تمنا پوری ہو چکی تھی اس لیے اُس نے عالی کی کسی بات کا برا نہیں منایا اور خوشی خوشی بتانے لگی کہ اس نے اپنے فلیٹ کی ڈیکوریشن کے لیے نیا فرنیچر پردے کارپٹ ڈیکوریشن پیس اور دوسرا ضروری ساز و سامان خرید لیا ہے۔ گاڑی بھی لے لی ہے اور ان سب اخراجات کے لیے پیسے اُس نے پاپا سے لیے ہیں جواب میں عالی نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

''جو مرضی کرو...... میری طرف سے تم آزاد ہو۔''

پنکی کے لاہور جانے کے بعد عالی نے اپنا فلیٹ چھوڑ دیا تھا۔ اور ایک نسبتاً چھوٹے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ جہاں اُس کے دو اور کولیگز بھی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک غیر شادی شدہ تھا جبکہ دوسرے کے بیوی بچے اسلام آباد میں رہتے تھے۔ کیونکہ اُس کی بیوی وہاں ایک کالج میں لیکچرار تھی۔ اس کے چار بچے تھے۔ اور وہ اسلام آباد ہی میں زیر تعلیم تھے۔ یہ آفیسر عالی اور آفیسر جنید سے سینئر تھا۔ فلیٹ میں دو بیڈ روم اور ایک اسٹڈی روم تھا۔ اسٹڈی کے ساتھ ہی ایک باتھ روم تھا اِس میں عالی نے اپنا ٹھکانا بنا لیا اس طرح تینوں کے درمیان تقسیم ہو کر کرایہ زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کھانا پکانے اور دوسرے کاموں کے لیے انہوں نے آفس ہی کا ایک کا ملازم رکھ لیا تھا۔ صفائی کے لیے بھی آفس کا سوئیپر آجاتا تھا۔

پنکی کے جانے کے بعد عالی نے سکھ کی سانس لی تھی روز روز کی چخ چخ سے اُس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ اپنے اخراجات کے لیے پیسے رکھ کر تنخواہ کا بڑا حصہ پنکی کو بھیج دیتا تھا آفس سے فارغ ہو کر وہ گھر آتا کھانا کھاتا کچھ دیر آرام کرتا اور پھر سیر و سیاحت کے لیے نکل جاتا۔

☆......☆......☆

پنکی کے والدین نے اُس کی پرورش ہی اچھے طریقے سے نہیں کی تھی اور اب بھگتنا عالی کو پڑ رہا تھا۔ مگر جب وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنوں کی محبت سے مجبور ہو کر اُن کے قریب رہنے کی خواہش کی تکمیل کے لیے لاہور چلی گئی تو عالی کو یوں محسوس ہوا کہ اُس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کرنے لگا تھا اور اپنے وہ تمام مشاغل دوبارہ اختیار کر لیے تھے جو شادی کے بعد اُس سے چھوٹ گئے تھے۔ ان مشاغل میں سر فہرست سیر و سیاحت تو تھی ہی اس کے علاوہ اپنے فرینڈز کے ساتھ کارڈز کھیلنا' ہوٹلنگ کرنا اور فلمیں دیکھنا اُس کے پسندیدہ مشغلے تھے جن سے وہ اب بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بلکہ شہاب کے بلانے پر عالی دو ہفتے کی چھٹی لے کر دبئی بھی چلا گیا شہاب وہاں اپنے تین دوستوں کے ساتھ ایک فلیٹ کرائے پر لے کر رہ رہا تھا۔ اُس نے کھلے دل کے ساتھ عالی کا استقبال کیا دونوں بھائی عرصے بعد اکٹھے ہوئے تھے۔

شہاب نے عالی کو کمپنی دینے کی خاطر آفس سے دو ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ دونوں بھائی صبح ناشتے کے بعد گھر سے نکل جاتے اور سارا دن خوب گھومتے پھرتے۔

''بھائی آپ کے ساتھ ٹائم گزارنا کتنا اچھا لگ رہا ہے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے جب ہم اکٹھے کھیلتے تھے اکٹھے اسکول جاتے تھے ایک چھوٹی سی گلی میں چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے غربت تھی، تنگ دستی تھی مگر پھر بھی ہم ایک پُرسکون زندگی گزار رہے تھے والدین کی چھتر چھاؤں اور محبت دنیا کی ہر دولت سے بڑھ کر تھی۔ کاش وہ دور پھر لوٹ آئے۔ شہاب نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تو عالی جواب دینے کی بجائے گاڑی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ لوگ دو روز کے لیے ابوظہبی جا رہے تھے شہاب نے اپنے ایک دوست سے ڈرائیور سمیت اُس کی بی ایم ڈبلیو

گاڑی لے لی تھی۔ نئی چم چم کرتی گاڑی موٹروے پر فل اسپیڈ سے بھاگی جارہی تھی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شہاب دوبارہ بولا۔

''بھائی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ وہ بہن بھائی جو بچپن میں ایک گھر میں اکٹھے رہتے ہیں۔ ایک جگہ کھاتے پیتے ہیں ایک کمرے بلکہ بعض اوقات ایک ہی بستر پر سوتے ہیں ایک جیسے اسکولوں میں پڑھتے اور ایک ساتھ کھیلتے ہیں۔ مگر جوان ہونے پر جب کچھ بن جاتے ہیں اور شادیاں کر لیتے ہیں تو یوں ایک دوسرے سے اجنبی بن جاتے ہیں جیسے کبھی آپس میں کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔ صرف اپنے اہل خانہ ہی کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں ماضی کو فراموش کر کے ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہوئے پرانے رشتوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بوڑھے والدین اُن کی راہ تکتے رہتے ہیں اُن کے لیے ہر لمحہ دعا گو رہتے ہیں مگر وہ دو گھڑی کے لیے اُن کی خیریت پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ آخر یہ بیویاں ایسا کیا سحر پھونک دیتی ہیں کہ بندہ اُن کا بے دام کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔''

''تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی نا...... اس لیے تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہاری شادی ہو جائے پھر میں تم سے پوچھوں گا آٹے دال کا بھاؤ۔'' بالآخر عالی نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

''بھائی میں یہاں اختلاف کروں گا آپ سے...... میرا خیال ہے کہ اگر انسان خود صحیح ہو۔ اُسے رشتوں میں توازن رکھنا آتا ہو۔ تو کسی بیوی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ شوہر کو اُس کے والدین اور دیگر قریبی رشتوں سے دور کر سکے۔ شہاب نے دھیرج سے کہا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پنکی جو برتاؤ تم لوگوں کے ساتھ کرتی ہے اس میں میرا قصور ہے۔ میں اسے تم لوگوں کے خلاف ورغلاتا ہوں۔'' عالی نے دبے دبے غصے سے کہا۔

''پلیز بھائی آپ ناراض نہ ہوں۔ میرا مقصد آپ پر الزام تراشی کرنا نہیں معاف کیجیے گا۔ پنکی بھابی جیسی عورتیں، ہم جیسے سیدھے سادے غریب لوگوں کے گھروں میں کسی بھی طرح ایڈجسٹ نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ ایسی عورتوں کو اپنے باپ کے عہدے اور دولت کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ وہ نا شوہر کو کچھ گردانتی ہیں نا سسرال والوں کو...... عزت اور احترام دینا تو بہت دور کی بات ہے مگر آپ کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔

آپ کا جب سے رشتہ طے ہوا ہے آپ نے سسرال کے چکر لگانا شروع کر دیے شادی کے بعد اپنے والدین کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا آپ اپنی دانست میں نئے رشتے داروں کو خوش کرنے کے چکر میں یہ بھول گئے کہ ایسے لوگ کبھی خوش نہیں ہوتے کیونکہ انہیں داماد کی صورت میں ایک بے دام کا غلام چاہیے ہوتا ہے۔ جو اُن کے آگے پیچھے پھرتا رہے اپنی ہستی کو مٹا ڈالے۔ کیونکہ احساس برتری میں مبتلا لوگ اپنے علاوہ کسی اور کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔

اگر آپ کی شادی اپنے ہی طبقے کی کسی سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکی سے ہوتی جسے رشتوں کا احترام ہوتا تو آج نا آپ یوں الگ تھلگ سارے گھر والوں سے کٹ کر رہتے۔ نا ہی والدین یوں دکھی ہوتے۔

''تم ٹھیک کہتے ہو شہاب۔ میں خود اس جنجال میں پھنس کر پچھتا رہا ہوں۔ مگر کیا کروں اگر اس اسٹیج پر پنکی کو چھوڑتا ہوں تو پھر میرے بچوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی ایک بچہ ڈیڑھ سال کا ہے دوسرا چند ماہ بعد دنیا میں آنے والا ہے۔''

''ٹوٹے ہوئے گھروں کے بچے نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو کر اپنا مستقبل برباد کر لیتے ہیں۔ اسی لیے میں اس بندھن کو نبھانے پر مجبور ہوں۔ ورنہ پنکی کسی لحاظ سے بھی میرے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ نا مجھے اُس کی شکل و صورت پسند ہے نا عادتیں اور نا ہی مزاج...... ان لوگوں نے جھوٹ بول کر ہم لوگوں کو دھوکے سے اپنے جال میں پھنسایا تھا۔ مجھے بھی اُن دنوں یہی جنون تھا کہ اپنی کمتر حیثیت کو بلند کر کے اپنے کولیگز کی نظروں میں معتبر ہو سکوں اور اُس کا میرے خیال میں ایک ہی طریقہ تھا کہ کسی اونچے خاندان سے رشتہ جوڑا جائے۔ تب میں بھول گیا تھا کہ شادی بیاہ کا معاملہ ساری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اچھا خاندان، شرافت اور تہذیب و تمدن دیکھنی چاہیے نا کہ دولت اور جھوٹی چمک

دکھ...... اور وہی عورت ایک اچھی جیون ساتھی ثابت ہوسکتی ہے جو سلجھی ہوئی تعلیم یافتہ' بااخلاق' سگھڑ' سیرت' صورت اور کردار کے لحاظ سے بہتر ہو۔ مگر میری آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جو میں نے جانتے بوجھتے ہوئے آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی۔

''اب نا چھوڑ سکتا ہوں نا رکھ سکتا ہوں۔'' عالی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''خیر بھائی اب تو ہوگیا سو ہوگیا۔ بس آپ اپنی طرف سے اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کرتے رہیے اللہ بہتر کرے گا۔ بچے بڑے ہوجائیں گے تو حالات بہتر ہوجائیں گے۔'' شہاب نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں بھی تو اب تک اس رشتے کو قائم رکھنے کی تگ ودو کررہا ہوں تاکہ دنیا کی نظروں میں بھرم قائم رہے۔''

عالی کی بات سن کر شہاب کچھ دیر تک خاموش اور متفکر سا رہا اور پھر بات کا موضوع بدل کر بولا۔

''عالی بھائی آپ کوشش کیا کیجیے کہ جب بھی وہاں رہتے رہتے بور ہوجایا کریں تو کچھ دنوں کی چھٹی لے کر میرے پاس آجائیں۔ اس طرح ہم لوگ ریلیکس ہوکر کچھ وقت اکٹھے گزار لیا کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں میں آپ کو آنے جانے کا ٹکٹ بھیج دیا کروں گا۔''

''واقعی یار میں نے بہت انجوائے کیا ہے یہاں آکر...... زندگی تو یہاں کے لوگوں کی ہے۔ روپے پیسے کی ریل پیل نا کوئی مسئلہ نا لوڈشیڈنگ نا بم دھماکے نا ہنگامے نا بھتہ خوری کراچی میں تو گھر سے باہر نکلتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ پتہ نہیں کدھر سے کوئی ٹارگٹ کلر یا بھتہ خور آکر راستہ روک لے اور پستول کی نوک پر ساری جمع پونجی اور موبائل فون چھین کر رفوچکر ہوجائے یا پھر پستول کی گولیاں سینے میں اتار دے۔ عالی نے پریشانی سے کہا۔

''واقعی بھائی مہنگائی' بے روزگاری اور جرائم کی وجہ سے کراچی اور ملک کے دیگر شہروں میں زندگی گزارنا عذاب ہوگیا ہے۔ ملک کے حالات سدھارنے کا احساس کسی کو بھی نہیں۔ نا حکمرانوں کو اور نا ہی دیگر ذمہ داران کو...... ہر کوئی دونوں ہاتھوں سے ملک کے وسائل کو لوٹ رہا ہے۔ ہر شخص کی کوشش یہی ہے کہ کسی طرح امریکہ یورپ یا مڈل ایسٹ میں جاکر آباد ہوجائے۔

باتوں کے دوران وقت گزرنے کا احساس ہی نا ہوا اور یوں ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ ابوظہبی پہنچ گئے جو کہ متحدہ عرب امارات کا ایک دوسرا بڑا اور ترقی یافتہ شہر ہے۔ دو دن تک وہاں گھومنے پھرنے کے بعد وہ دبئی واپس آگئے۔ اس طرح اپنے وہاں دو ہفتے کے قیام کے دوران عالی نے شہاب کے ہمراہ متحدہ عرب امارات کے تقریباً تمام بڑے شہر اور اہم مقامات دیکھ لیے۔ روانگی سے ایک روز قبل شہاب نے اُسے سمندر کے کنارے واقع دنیا کے سب سے بڑے شاپنگ مال میں ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کروائی۔ جس میں پنکی بچے اور عالی کے لیے بہت سے تحائف تھے۔

''بھائی میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ چیزیں امی ابو اور صباحت کے لیے بھی لے جائیں۔ انہیں اپنی طرف سے دیجیے گا۔ یہ نا کہیے گا کہ میں نے لے کر دی ہیں۔'' شاپنگ مال میں گھومتے ہوئے شہاب نے عالی سے کہا۔

''لے جانے کو تو خوشی سے لے جاؤں مگر پتہ نہیں وہ مجھ سے ملنا بھی پسند کریں گے کہ نہیں...... ڈیڑھ سال سے انہوں نے مکمل طور پر میرا بائیکاٹ کیا ہوا ہے۔''

''پریشان نا ہوں بھائی...... والدین اولاد سے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکتے۔ بلکہ آپ کیا جانیں کہ امی اور ابا آپ کو کتنا یاد کرتے ہیں ہر وقت آپ کی صحت و تندرستی اور سلامتی کے لیے دعاگو رہتے ہیں جب بھی میں ان کو فون کروں۔ امی اور ابا آپ ہی کی بات کرتے ہیں انہیں آپ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوسکتا بھی نہیں کہ آپ اُن کے سب سے زیادہ چہیتے اور عزیز ترین بیٹے ہیں آپ کو یاد ہے نا کہ بچپن میں میری کسی شرارت میں امی مجھے بہت ڈانٹتی تھیں بلکہ ابا سے شکایت کرکے پٹواتی بھی تھیں مگر آپ کو کبھی کچھ نہیں کہا۔ اگرچہ آپ کم کم ہی شرارتی تھے مگر پھر بھی آپ کی ہر غلطی کو امی نظرانداز کرتی تھیں میں اور صباحت تب آپ پر رشک کیا کرتے تھے کہ امی ابا آپ سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔'' شہاب نے ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ تو عالی کے اُداس اُداس چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

(جاری ہے)

افسانہ

قرۃ العین سکندر

دوستی کے رنگ عجب

''ویسے جی مجھے لگتا ہے کہ اُن کی لو میرج ہی ہوئی ہے آپ سے، دیکھوں ناں جب آپ دونوں بائیک پر گھر سے نکلتے ہو تو وہ بڑا ہنس ہنس کر آپ سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔'' اب مجھے یاد آرہا تھا کہ بڑے کیوں ہمیں کہتے ہیں کہ......

''بس پھر کیا بتاؤں باجی جی...... اس شبانہ نے تو میرا سارا بھرم پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ صبح سویرے ہی آ گئی۔ میں نے اتنے اشارے کیے آنکھوں کے کہ نہ بول کچھ یا ہولی بول لیتا ہے بندہ، پرنا جی...... اس نے تو میرے میاں کی پرواہ کیے بنا ہی بول دیا۔

''نی کتھے سی تو کل دو پہر سے۔''

''ہائے باجی کچھ پردے بھی تو رکھنے پڑتے ہیں ناں۔ اس نے تو میرا ایک پردہ بھی نہیں رکھا۔ منہ بھر کے بول گئی کہ میں کل اور پرسوں دونوں دن عین دوپہر کے ٹائم گھر سے غائب تھی اور پھر جو میرے میاں کا موڈ خراب ہو گیا تپتی دوپہر کے وہ الگ......''

رفعت اپنی اردو ملی پنجابی میں مجھے اپنا قصہ گوش گزار کر رہی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ شبانہ اور رفعت دو گہری سہیلیاں مگر پیٹ کی دونوں ہی ہلکی واقع ہوئی تھیں۔ جوں ہی دونوں کے میاں کام کاج پر روانہ ہوتے روزی روٹی کی تلاش میں۔

اِدھر دونوں محلے کے دورے پر روزانہ نکل کھڑی ہوتیں۔ اور گھر گھر کی ٹوہ لیتی رہتی تھیں اور پھر ایک کی بجھائی دوسرے گھر میں جا کر لگائی۔ یوں سارا دن ایک نئی ہی سرگرمی میں گزر جاتا۔ مزے مزے کے جھگڑے دیکھنے کو ملتے، نت نئے فسانے بنتے۔ جب کچھ عرصہ محلے والے ان کی اس طرح کی لگائی بجھائی کی حرکتوں کے سبب ان دونوں کو نظرانداز کرتے تو پھر کیا تھا۔

یہ رفعت ونڈو شاپنگ پر نکل کھڑی ہوتی۔ خوب سج سنور کر، آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں بھر کے......

وہ فطرتاً دل پھینک اور اپنی نمائش کا منہ بولتا اشتہار تھی۔

دکاندار بھی خوش اور رفعت بھی خوش، کبھی جب ایک جوتا خرید کر گھر لاتی تو وہ اُس کو بعد میں کچھ خاص نہ بھاتا۔ تو جھٹ تبدیل کرنے چل پڑتی۔ دکاندار بھی خوب جان گئے تھے اور وہ بھی مزہ لیتے تھے۔ کچھ رونق پسند دکاندار ہنس بول بھی

لیتے تھے۔ اور بس وہیں رفعت کے ٹھکانے بن گئے تھے۔

نامعلوم کیوں رفعت اور شبانہ دونوں کے ہی پاؤں گھر میں نہ ٹکتے تھے۔ پچھلے دنوں رفعت اور شبانہ کی گہری دوستی کے باوجود آپس میں سخت قسم کی لڑائی ہوگئی۔ وجہ یہی تھی کہ ایک دن شبانہ نے صبح سویرے آ کر رفعت کے گھر میں با آواز بلند پکار کر کہا کہ تم کل اور پرسوں گھر پر نہ تھیں۔ اندر کمرے میں موجود رفعت کا میاں ناشتہ کر رہا تھا۔ اُس نے یہ سب سن لیا، اور سخت طیش میں آ گیا۔ شبانہ رفعت کے آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے بھی نہ سمجھ سکی کہ وہ خاموش ہی ہو جاتی، وہ اپنی بات میں اس قدر محو تھی کہ شبانہ بات مکمل کر کے ہی گئی۔ شبانہ کے جانے کے بعد رفعت کے میاں نے رفعت کے خوب لتے لیے۔

"تمہیں ہزار دفعہ منع کیا ہے لور لور نہ پھرا کر، دوسروں کے گھروں میں ٹوہ لینے کی بجائے اپنے گھر اور اپنے بچوں پر توجہ دے، مگر مجال ہے کہ تم پر کوئی اثر ہو جائے۔"

رفعت کا میاں اُس کو برا بھلا کہہ کر کام پر روانہ ہو گیا۔ اُس کے جاتے ہی رفعت نے دوپٹہ سر پر ٹکایا اور شبانہ کے گھر روانہ ہو گئی۔ لڑنے

بھڑنے کے لیے، رفعت نے شبانہ کے گھر جا کر خوب واویلا کیا۔ شبانہ کی ساس کی پرواہ نہ کی اور شبانہ کو خوب کوسا پھر دونوں کی گہری دوستی کو جلد ہی گہری دشمنی میں تبدیل ہونے میں لمحہ نہ لگا۔ اور دونوں جانی دشمن بن گئیں۔

اب ان دونوں کے درمیان میں گھن چکر بن گئی تھی جب رفعت آتی تو شبانہ کی برائیاں کرتی اور جب شبانہ آتی تو رفعت کو خوب کوستی۔

رفعت اپنی ہی لے میں بتاتی جارہی تھی۔ میری نگاہ ٹیوشن آنے والے بچوں پر پڑی۔ وہ سب مزے لے لے کر رفعت کی باتیں سن رہے تھے۔ میں نے سب بچوں کو تنبیہی نظروں سے دیکھا اور پڑھائی پر فوکس کرنے کو کہا۔

''او کے جی پھر میں چلتی ہوں۔ آپ نے میری زری پر خاص توجہ دینی ہے۔ میرے پاس تو ٹائم ہی نہیں ہوتا۔'' رفعت نے اپنی بیٹی کی تعلیم کے حوالے سے کہا تو میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی اور رفعت لہکتی ہوئی مین گیٹ عبور کر گئی۔

رفعت اور اس کے میاں کی لومیرج تھی۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ دونوں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی ہے۔ پھر ایک دن رفعت نے بھی فخریہ انداز میں بتلا دیا۔

''محبت تو میرے فخرو نے کی ہے پکی والی کورٹ میرج کی تھی۔ جی ہم نے دیکھو لو میرے فخرو کی کیا ہی بات ہے۔''

رفعت کی بات پر میں نے ٹیوشن آئے ہوئے بچوں کو بوکھلا کر دیکھا۔

بچے ہمہ تن گوش تھے میں اس نئی افتاد پر حیران پریشان تھی ہر روز ایک نئی کہانی اور ایک نئی بات وہ لاکر میرے گوش گزار کر دیتی، بسا اوقات تو اس قدر کھلم کھلا بولتی تھی کہ میری نظریں شرم سے جھک جایا کرتی تھی اور پھر میں گھبرا کر بچوں کی جانب دیکھتی جو میری نگاہ پڑتے ہی پڑھائی کی جانب منہمک ہو جایا کرتے تھے۔ مگر ان کے انداز صاف بتا رہے ہوتے تھے کہ وہ ساری رام کتھا سن چکے ہیں۔

میں نے بارہا رفعت کی توجہ اس جانب مبذول کروانی چاہی کہ اگر اُس نے کوئی بھی بات کرنی ہو تو برابر والے کمرے میں آکر مجھ سے کر لیا کرے۔ یوں بچوں کے سامنے واشگاف الفاظ استعمال مت کیا کرے۔ مگر وہ رفعت ہی کیا جو بات کو سمجھ جائے۔ میری دھیمی آواز میں کی گئی التجا کو سن کر وہ ایک بلند قہقہہ لگاتی۔

''لو جی باجی تسی وی ناں آج کل کے بچوں کو سب معلوم ہوتا ہے۔ یہ بچے بھی کہاں بچے رہے ہیں۔ باپ بن گئے ہیں استاد بن گئے ہیں۔'' وہ جواز تراشتی تھی۔

''مگر پھر بھی آپ احتیاط کیا کریں۔ یہاں میرا اپنا بیٹا بھی ہے اُس پر کیا اثر پڑے گا۔'' میں نے بھی ایک مدلل تاویل پیش کی جسے رفعت سن کر اَن سنی کر دیتی۔

میرے میاں جی کو رفعت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ بہت ہی سوبر اور نائس قسم کے انسان ہیں۔ جب بھی انہیں معلوم ہوتا کہ 'زری کی والدہ' آئی ہے۔ تو کمرے میں جا کر بیٹھ جاتے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب رفعت آدھے گھنٹے سے پہلے ٹلنے والی نہ تھی۔

میں اس قدر باظرف اور بامروت واقع ہوئی ہوں کہ منع ہی نہ کر پاتی۔

حالانکہ میرے میاں جی نے بارہا احساس دلایا کہ اُس کو کہا کرو کہ کام کی بات کرے اور چلتی بنے۔ مگر میں اب میاں جی کو کیا بتاتی کہ اُس کی

کام کی بات آدھے گھنٹے پر محیط ہو جایا کرتی ہے اور پھر ہم جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی نا معلوم کیوں مروت کی چادر کی بُکل اوڑھے خاموش ہو کر رہ جاتے ہیں بسا اوقات۔

پھر ایک دن میرے میاں جی نے ایسی بات کہہ دی کہ میرا تو طیش سے برا حال ہو گیا۔

''یار تم اس زری اور اس کی ماں کو آج سے فارغ کر دو۔'' میرے میاں زچ ہو کر بولے۔

''مگر کیوں......؟'' میں حیرت زدہ تھی۔

''اب کیا کہوں جانے دو۔'' میرے میاں نے بات کو ٹالنا چاہا تو میں بضد ہو گئی۔

''بس مجھے بتانا عجیب سا لگتا ہے مگر وہ اچھی عورت نہیں ہے عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہے۔'' میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔

''ہائے اللہ میرے معصوم فرشتہ صفت شوہر کو تو کوئی یوں بھی دیکھ لے تو میرا پارہ گھوم جاتا، کہاں بری نظر سے دیکھنا۔ مجھے تو بالکل یہ بات ہضم نہ ہو رہی تھی۔ میرا لال گلابی ہوتا چہرہ دیکھ کر وہ ہنس پڑے۔

''تمہاری قسم میں نے تو پلٹ کر دیکھا بھی نہ تھا۔''

ایک عورت ذات پر یہ ایک طمانچے سے کم لفظ نہیں کہ وہ اچھی عورت نہیں۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب ہر مروت کو بالائے طاق رکھ دوں گی۔ اپنے دل میں اس رفعت کو اس قدر کوسا خوب برا بھلا کہا۔ اور جان چھڑا لینا طے کر لیا۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم باجی!'' رفعت نے داخلی حاضری لگائی۔

لفظ 'باجی' پر میں جز بز ہو گئی۔

بار ہا رفعت مجھے بتلا چکی تھی کہ وہ مجھ سے پورے چار سال بڑی ہے اور پھر بھی لفظ باجی...... میں نے اُس کا طائرانہ جائزہ لیا۔ لب اسٹک سجائے آنکھوں کو کاجل لگائے۔

وہ پورے اطراف میں نظریں گھماتی جا رہی تھی۔ آج میں نے بھی اُسے کسی اور ہی نظروں سے جانچا اور تولا۔

''بھائی جان نظر نہیں آرہے؟'' اُس نے آتے ہی سوال داغا۔

میرے کان اپنے میاں کے نام پر کھڑے ہو گئے۔

''کیوں خیریت ہے ناں کوئی کام تھا اُن سے؟'' اب ماضی کے دریچے وا ہو رہے تھے یاد آرہا تھا کہ وہ ہمیشہ آتے ساتھ ہی 'اُن' کا ہی کیوں پوچھا کرتی تھی۔

''ناں جی مجھے کیا کام۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ میں نے اُسے اگنور کرنے کے لیے بچوں کی کاپیاں چیک کرنا شروع کر دیں۔ جو ٹیبل پر بجی تھیں۔

زری جو ماں کے ساتھ پڑھنے آئی تھی۔ اپنی جگہ پر بیٹھ کر ہوم ورک کرنے لگی۔

''ویسے باجی مجھے لگتا ہے کہ آپ کی لو میرج ہوئی ہے میری طرح؟''

وہ نا معلوم کیا ٹوہ لینا چاہ رہی تھی۔

''جی...... بالکل بھی نہیں۔ ہماری شادی بڑوں کی مکمل رضا مندی اور دعاؤں کے سایہ میں انجام پذیر ہوئی ہے۔'' میں نے اس کو دو بدو جواب دیا۔

''اچھا جی مگر وہ تو لگتا ہے آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' اُس کے لہجے میں کرید تھی۔

قبل اس کے کہ میں اُس کو کوئی کرارا سا جواب دیتی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے

میاں جی کے آفس سے آنے کا ٹائم ہوتا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے میاں جی تھے۔ میرے آف موڈ کو دیکھ کر بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کیا زری کی امی آئی ہے؟''

اُن کا پوچھنا مجھے سخت ناگوار گزرا۔ حالانکہ اُن کا کوئی قصور نہ تھا۔ مگر میری نظروں کا زاویہ دیکھ کر وہ سمجھ چکے تھے کہ وہی ہے۔ خاموشی سے وہ لاؤنج پار کر کے کمرے میں جا کر بند ہو کر بیٹھ گئے۔ معلوم ہی تھا کہ اب زری کی امی جان نہیں چھوڑنے والی۔ کبھی کبھار مرد کو ہی اپنی نظر اپنی آنکھ کا پردہ رکھنا پڑتا ہے اور خاص کر تب جب وہ خوش قسمتی سے شریف النفس بھی واقع ہوا ہو۔

''بھائی جان بھی ناں بڑے شرمیلے سے ہیں نہ دائیں دیکھتے ہیں نہ بائیں، بندہ کم از کم سلام دعا ہی کر لیتا ہے۔'' رفعت کی دل کی بات زبان پر آن کر رُکی۔ شاید اُسے اپنی ساری کی گئی محنت اکارت جاتی نظر آ رہی تھی۔ خوب سجا سنورا انداز، میری نظروں کے زاویہ پر وہ بات پلٹ کر بولی۔

''ویسے جی مجھے لگتا ہے کہ اُن کی لو میرج ہی ہوئی ہے آپ سے، دیکھوں ناں جب آپ دونوں بائیک پر گھر سے نکلتے ہو تو وہ بڑا ہنس ہنس کر آپ سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔'' اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ بڑے کیوں ہمیں کہتے ہیں کہ جب بھی گھر سے نکلو آیت الکرسی کا ورد کر کے خود پر حفاظتی حصار پھونک کر نکلا کرو۔ نجانے کتنی نگاہیں تعاقب میں ہوتی ہیں جو نظرِ بد کا کام کر جاتی ہیں۔

آج میں نے اس پہلو پر سوچا تو ایک نئی منطق بھی سمجھ میں آئی۔

''ہاں اللہ کا بڑا احسان ہے ہم بہت خوش ہیں۔'' میں نے سرد لہجے میں جتلا دیا تھا۔

''ویسے اب وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے میری وجہ سے؟'' رفعت کی بات سن کر میں سخت متعجب ہوئی۔

اُسے سب معلوم تھا اور پھر بھی ایسی گھٹیا حرکتیں۔

''ہاں ماشاء اللہ آنکھ کا بھی پردہ ہوتا ہے اور میرے میاں جی بہت نمازی اور پرہیز گار ہیں۔'' میں نے متانت سے اپنے میاں کی تعریف کی۔

''لو بھلا نماز سے کیا ہوتا ہے۔'' رفعت نے حیرت سے کہا۔

''کیوں بھئی کیا آپ کو نہیں معلوم نماز برائی اور بے حیائی سے بچاتی ہے۔ وہ نماز جو سچے دل سے اپنے معبود برحق کے سامنے سجدہ ریز ہو کر پڑھی جائے۔ نماز ایک دعا ہے جو اللہ کے سامنے ہمیں اپنی بندگی کے طریقے سکھلاتی ہے۔ الحمدللہ میرے میاں اسی لیے بہت پارسا ہیں؟'' میں نے کھل کر آج اسے جتا دیا تھا۔ وہ خاصی دیر میرے میاں کے باہر آنے کی منتظر رہی اور پھر مایوسی سے چل دی۔

میں جانتی تھی کہ وہ کیا جاننے کی متمنی تھی۔ میرے میاں کے حوالے سے کوئی ایسی بات جو وہ گھر گھر جا کر بتلائے، مگر میرا اور میرے میاں کا ایک ہی اصول زندگی تھا۔ ایک چھت تلے ایک کمرے میں بند چاہے جو مرضی بحث کرو، لڑو، بھڑو مگر اپنی چھت سے باہر کوئی لفظ بھی نہ جانے پائے اور ہم دونوں کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز بھی یہی تھا۔

ہم دونوں اپنا جھگڑا محض اپنے بیڈ روم تک ہی رکھتے تھے۔ باہر نہ نکالتے تھے اور یہ بھی ایک اٹل

حقیقت تھی کہ ہماری لو میرج نہ تھی مگر نکاح کے مقدس بولوں نے ہمیں رشتہ ازدواج میں باندھ دیا تھا اور اس نکاح کے رشتے میں رب العزت نے ایسی کشش ایسا پیار رکھا ہے کہ دو اجنبی انسان اس میں منسلک ہو کر ایک دوسرے کے بے حد قریب آ جاتے ہیں اور دل میں سما جاتے ہیں اور ہم دونوں بے حد محبت کرتے تھے ایک دوسرے سے، اور کوئی بھی رفعت آ کر اس محبت میں دراڑ نہیں ڈال سکتی تھی اور نہ ہی میری محبت پر نقب زنی لگا سکتی تھی۔

☆......☆......☆

''میں تو اس شبانہ کا منہ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ کل میں سبزی خرید رہی تھی۔ وہیں آ گئی میرا دل چاہا ایک تھپڑ رسید کر دوں اس بندریا کے منہ پر...... اور خود میں بہت حسین بنتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی بندریا نے میک اپ کر لیا ہو۔''

جب رفعت کا زور بیاں عروج پر پہنچا تو میں نے سخت بے زاری سے پہلو بدلا۔

''میں اب بچوں کو پڑھا لوں۔ پھر کبھی بات کرتے ہیں۔ بہت حرج ہو رہا ہے اُن کی پڑھائی کا۔''

میں نے اُسے احساس دلانا چاہا۔

''ہاں جی آپ پڑھاؤ جی، میں اب چلتی ہوں۔ ایک دو گھر بھی جانا ہے ناں۔ فخرو کے آنے سے پہلے پہلے چکر لگا لوں۔ بعد میں تو فخرو جانے ہی نہیں دیتا مجھ کو۔''

وہ اُٹھ کر چل دی اور میں سوچنے لگی کہ کل یہ دونوں ایک دوسرے کے قصیدے بیان کرتی نہ تھکتی تھیں اور آج اس قدر نازیبا الفاظ استعمال کر رہی تھی۔ ہر وقت رفعت کے لبوں پر اپنے میاں کی تعریف رہتی تھی۔ مجھے بھی رفعت کے ساتھ رہ رہ کر ایک اشتیاق سا ہو چلا تھا کہ دیکھوں آخر ایسا کیا تھا اُس فخرو میں جو اپنی ماں کی عزت پر دھبہ لگا کر رفعت نے گھر کی دہلیز پار کر لی۔

مگر میں ایک باپردہ عورت ہوں۔ اپنے گھر کی چار دیواری میں تحفظ کے احساس کو خود میں مدغم ہوتے دیکھنے والی عورت، مجھے تو کبھی مجبوری میں بھی باہر نکلنا پڑتا تھا کبھی گھر سے تو سخت وحشت کا شکار ہو جایا کرتی تھی۔ کجا یہ کہ گھر گھر کے چکر کاٹوں، کئی بچوں کی مائیں مجھے بارہا اپنے گھر آنے کی دعوت دے چکی تھیں مگر میں اس لیے نہیں جاتی تھی کہ مجھے ہجوم سے گھبراہٹ ہوتی تھی اور میں فطرتاً ہی کم گو تھی۔

اگلے دن شبانہ آ گئی۔ الفاظ اور انداز لہولہو رفعت جیسے ہی تھے۔ اور میں درمیان میں 'چارہ گر' لیکن خدا گواہ تھا کہ میں نے کبھی رفعت کی بات شبانہ کے کانوں تک نہ جانے دی اور نہ شبانہ کی بات رفعت کے کانوں تک۔ یہ تو ایک راز ہوتا ہے۔ جس کی امین بن کر حفاظت کرنی ہوتی ہے۔

''آپ کے بارے میں ایسی فضول باتیں کرتی ہے رفعت کہ توبہ توبہ......'' شبانہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''میرے بارے میں۔'' میں ہونق سی منہ دیکھتی رہ گئی۔

''جی آپ کے بارے میں کہ بڑی مغرور ہے اور منہ نہیں لگاتی کسی کو۔'' میں ہنس دی۔

''دیکھو بہن یہ تو اپنی اپنی فطرت اور عادت کی بات ہے کہتی ہے تو کہنے دو۔ مگر تم کو کیا لگتا ہے میں واقعی مغرور ہوں کیا؟'' میں نے شبانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تو وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

''ناں جی...... توبہ کریں۔ میں کیوں ایسا

سمجھنے لگی۔ وہ رفعت تو خود اپنے آپ کو کسی قلوپطرہ سے کم نہیں سمجھتی۔'' شبانہ کی تشبیہ پر میں زیر لب مسکرا دی۔

''رہنے دو شبانہ چغلی اور غیبت دونوں گناہ عظیم ہیں۔ تم آتی ہو تو اپنی بات کیا کرو اور جایا کرو۔ یوں اچھا نہیں ہوتا کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔''

میں نے متانت سے ناصحانہ انداز میں کہا تو وہ مسکرا دی۔

''ہائے آپ تو بہت ہی اچھی ہو جو آپ کی برائی کرتی پھرتی ہے آپ اسی کی بات نہیں کرتی۔ حیرت ہے جی۔'' شبانہ نے کہا تو میں نے اس کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ بھرا کرتا ہے پیانہ ہمیشہ سرنگوں ہو کر۔'' میں جانتی تھی کہ اُس کو میری بات کی مطلق سمجھ نہیں آئی اور اس بات پر اس کے چہرے کے تاثرات بھی شاہد تھے۔

☆......☆......☆

دروازے پر دستک ہوئی میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے زری تھی۔ لیکن آج ماں کے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور کے ساتھ آئی تھی۔

''یہ میرے پاپا ہیں۔'' زری کی بات پر میں نے پلٹ کر اس شخص کو دیکھا۔

کالی رنگت پر بھدے سے نقوش والے آدمی کو زری اپنا پاپا بتا رہی تھی۔ میں نے حیرت سے اُس آدمی کو دیکھا۔

''وہ جی رفعت کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے زری کو میں خود ہی لینے آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ آدمی رُکا نہیں اور واپس چلا گیا۔

رفعت کی بجائے وہ آدمی شریف سا تھا۔ اور پھر میں حیرت کے پاتال میں تھی کہ کیا یہ وہ شخص ہے جس کے چہرے اور وجاہت کے گن گاتی رفعت تھکتی نہ تھی۔ اب مجھے وہ وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی جو رفعت کو سج سنور کر غیر مردوں کی التفات حاصل کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ شادی شدہ ہو کر ایک بچی کی ماں ہو کر شاید وہ اپنی کسی تشنگی کا مداوا کر رہی تھی۔ لو میرج کرنے کے بعد شاید پچھتا رہی تھی۔ اس کے میاں کو دیکھ کر مجھے اپنے میاں جی کا عکس آنکھوں میں لہرایا۔

ماشاء اللہ میرے میاں جی نہ صرف دل کے بے حد حسین تھے بلکہ چہرہ بھی اللہ رب العزت نے بے حد حسین دیا تھا۔ سفید دودھیا رنگت اور پیارے پیارے سے نقش، جو میرے نقش پا پر حاوی تر تھے۔ 'اُن' کے تصور سے ہی دل شاد ہو گیا۔

☆......☆......☆

''کل طبیعت خراب تھی اب کیسی ہے؟'' میں نے مروتاً رفعت سے پوچھا۔

''جی بس بخار سا تھا۔ اُداس سی ہوں اب وہ موج میلا ہی نہیں رہا۔ شبانہ کے ساتھ تو خوب گپ شپ تھی۔

آج وہ شبانہ کا ذکر کسی اور ہی رنگ میں کر رہی تھی۔ میں خاموش ہی رہی۔

''کل زری کے پاپا آئے تھے اُسے چھوڑنے، آپ بھی سوچتی ہوں گی کہ وہ کیسی شکل کے ہیں۔ مگر جب میری لو میرج ہوئی تو میں فقط سترہ سال کی تھی۔ تب کہاں اتنی سمجھ اور عقل ہوتی ہے۔ ہر کوئی جو مجھ کو دیکھتا ہے کہتا ہے کہ تم کہاں اور وہ کہاں؟''

رفعت کی بات پر میں بس اُسے دیکھتی رہ گئی۔ برسوں پہلے پنپنے والی محبت اب کملا کر مرجھا گئی تھی۔

''رفعت تم کیسی باتیں کر رہی ہو محبت تو دل کو دیکھ کر کی جاتی ہے۔ اخلاق وعادات سے کی جاتی ہے جو محبت صرف ظاہری دکھاوے سے کی جائے وہ محض کھوکھلی محبت کہلاتی ہے اور اس محبت کا زعم زدہ بت بہت جلد پاش پاش ہو کر ڈھے جایا کرتا ہے۔''

میں نے اُسے کہا تو وہ کچھ سمجھی اور ناسمجھی کے عالم میں سر ہلا کر رہ گئی سچ تو یہ تھا کہ اُسے بھی تو محض ظاہری دولت نے متوجہ کیا تھا۔

اور پھر اُس عمر میں واقعی انسان ناسمجھ ہوتا ہے اور خود کو دنیا کا عقل مند ترین انسان تصور کرتا ہے۔

☆......☆......☆

اگلے دن شبانہ اور رفعت دونوں ہاتھ تھامے ہنستی مسکراتی ہوئی میرے گھر میں داخل ہوئیں تو میں حیرت زدہ سی ہو کر یہ نیا منظر دیکھنے لگی۔

ساتھ ہی مٹھائی کا ڈبہ تھامے شبانہ تھی۔

''لو جی مٹھائی کھالیں، ہم نے تو پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کی ہے۔ ہماری دوستی ہو جانے کی خوشی میں۔ آپ بھی منہ میٹھا کریں۔''

''نہیں شکریہ!'' میں نے بے دلی سے کہا۔

کل تب ایک دوسرے کی چغلی اور غیبت کرنے والیاں آج ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے یوں سر جوڑے محبت بھرے مظاہرے کر رہی تھیں کہ حیرت ہوتی تھی۔

''ہائے کیا بتاؤں شبانہ تمہارے بغیر تو ایک ایک پل کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ تو بھی تو اتنی سنگدل نکلی۔ ذرا سا ڈانٹ کیا دیا واپس پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔'' رفعت شکوہ کناں تھی۔

'' اور تم نے بھی تو میری خبر گیری نہ کی دوبارہ۔ میں بہانے بہانے سے تیرے پاس آتی

تھی اور تو منہ پھیر لیتی تھی۔ بہت بے مروت ہے قسم سے۔''

شبانہ اور رفعت ماضی کی باتیں، گلے شکوے بیان کر کے دل صاف کر رہی تھیں۔

''چلو اب دوسرے گھروں میں بھی تو مٹھائی کھلانی ہے اور اس نسرین کو تو خاص طور پر کھلانی ہے کتنا خوش تھی ہماری لڑائی پر، چل ذرا اس کا دل جلا کر آتے ہیں۔ اور پھر حمیدہ کے گھر بھی تو جانا ہے اُس کی نئی بہو آئی ہے۔ ذرا اس کا جائزہ لیں کیسی ہے؟'' شبانہ بولتی جاتی تھی۔

''رہنے دو آج نہیں آج تو تُو میرے ساتھ چل بازار سے اپنی چپل بدلوا کر لانی ہے۔ وہاں ایک نیا ٹھیلا بھی لگا ہے سستی چیزوں کا۔'' وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی باہر گیٹ پار کر گئیں اور مجھے سوچوں کے جال میں اُلجھا ایک نئے گرداب میں پھنسا گئیں۔

''کیا واقعی ایسی ہوتی ہے دوستی۔ جب دل چاہا اوڑھ لی اور جب دل چاہا سر سے اُتار پھینکی۔ قصور تو شاید اُن کا بھی نہیں۔ آج معاشرہ جس طرح غیبت چغلی لڑائی فتنہ اور بے راہ روی کی چال چال رہا ہے تو یہ سب تو ہونا ہی ہے۔ مگر ایک جلتا دیا اب بھی باقی تھا کچھ لوگ جو فہم وادراک کے انمول موتیوں سے مالا مال ہیں۔ ان کی تصحیح اور اصلاح کر سکتے ہیں۔

میں نے سوچا اور بچوں کی جانب پلٹ گئی۔ جو کل کی قوم کا معمار ہیں۔ یہیں سے شروعات کرنی چاہیے۔

بچوں آج کا ٹاپک ہے اخلاص، اخلاص ہر شے میں، ہر رشتے میں۔'' میں شروع ہو چکی تھی اور بچے ہمہ تن گوش تھے۔

☆......☆......☆

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ناولٹ

زرافشاں فرحین

مشعلِ راہ

''یقیناً اسٹڈی کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے کوئی بھی علم میں کامل نہیں ہوتا۔ مس دیا آپ ضرور اسٹڈی کیجیے گا۔ لیکن چند پوائنٹس آپ ابھی نوٹ کرلیں۔ سوشلزم ہو یا مارکسزم یا پھر کمیونزم، کوئی بھی دنیا کا نظام اگر دنیا والوں کا خود تراشہ ہوا نظام ہے تو......

''دیا...... دیا...... جلدی کرو بھئی تمہاری گاڑی کا ٹائم ہو رہا ہے اور تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔'' دیپک ناراضگی چلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

دیا کو جلدی جلدی بیگ میں کپڑے ٹھونستے ہوئے دیکھ کر بری طرح جھلا گیا۔

''یہ بیگ اب تیار ہو رہا ہے' پہلے سے تیاری نہیں ہو سکتی تھی تمہاری۔''

''افوہ...... دیپک تم میرے ہاتھ پیر مت پھلاؤ۔ بس دیکھو میں تیار ہوں۔'' تیزی سے بیگ کی زپ بند کر کے اس نے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر کیچر میں قید کرتے ہوئے ساتھ ساتھ پیروں میں سینڈلیں بھی ڈال لیں۔

''چلیں...... آئی ایم ریڈی......'' اُس کی مسکراہٹ دیپک کو مزید سلگا گئی۔

''چلو......'' وہ دانت کچکچا کر بولا تو وہ جلدی سے باہر بھاگی۔

ہاسٹل وارڈن کو چابی دیتے اور باہر نکلتے

مزید 10 منٹ لگ گئے آج تو گاڑی نکل ہی جاتی اگر دیپک ٹیکسی والے کو سارے راستے جلدی چلانے کی تنبیہہ نہ کرتا رہتا اس دوران وہ خونخوار نظروں سے اسے بھی گھورتا رہا اور وہ بے فکری سے ببل چباتی باہر کے نظاروں میں گم رہی۔ جانتی تھی گھر پہنچتے پہنچتے دیپک سب بھلا دے گا ایسا ہی تھا وہ ہمیشہ یونہی ہوتا تھا۔

عمرکوٹ جانے والی کوچ تیار تھی روانگی کے لیے اُن کی آمد کے ساتھ دروازے بند کر دیے گئے۔

سیٹوں پر پہنچنے تک وہ کئی بار ڈگمگائی دیپک کی جھنجلاہٹ ہنوز موجود تھی۔ جب تک وہ لوگ اپنی مطلوبہ سیٹوں پر بیٹھ نہ گئے اب کراچی سے عمرکوٹ تک 11' 12 گھنٹے کی طویل مسافت تھی اور دیپک کو علم تھا کہ وہ یہ سارا سفر پڑھتے ہوئے گزارے گی۔ اس لیے وہ بھی سکھ کا سانس لے کر آنکھیں موندھے سیٹ سے پشت لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

''اگر آج گاڑی نکل جاتی نا!'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

''اس سے پہلے کبھی نکلی ہے۔'' وہ بھی دھیمے سے گویا گنگنائی ہو۔

یہ سلسلہ گزشتہ ایک سال سے جاری تھا ہر ماہ وہ اپنے آبائی شہر 3'4 چھٹیاں منانے ضرور جاتی۔ دیپک اُس کا چچازاد ہی ہمیشہ اسے لینے آیا کرتا تھا دونوں میں بچپن سے ایسا ہی دوستانہ تھا۔ تقریباً ہم عمر تھے۔

مگر دیپک مرد ہونے کے ناطے بڑا پن جھاڑنا ضروری سمجھتا۔ اور وہ بھی لڑکپن کی حدود چھوڑتے ہی اُسے بڑا تسلیم کرنے لگی تھی یہ دوستی کب چاہت میں تبدیل ہوئی انہیں معلوم بھی نہ ہوا۔

دونوں ہی ایک دوسرے پر استحقاق جتانا ضروری سمجھتے تھے۔ دونوں نے ہی ابتدائی تعلیم عمر کوٹ میں ہی حاصل کی تھی پھر مزید تعلیم کے حصول کے لیے جب دیپک نے کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تو دیا بھی والدین کے آگے بضد ہوگئی بڑی مشکل سے دیپک اور اُس کے اصرار پر اسے اجازت ملی تھی اب وہ پولیٹکل سائنس ڈیپارٹمنٹ میں پریوس کی طالبہ تھی تو دیپک اپنا فارمیسی مکمل کرنے کی تگ و دو میں مصروف...... دونوں ہی ہاسٹلز میں مقیم تھے۔

دیپک اپنے دوستوں کے ساتھ بوائز ہاسٹل میں اور دیا گرلز ہاسٹل میں تقریباً روز ہی ملتے...... وہ ہر جگہ اسی کے ساتھ آتی جاتی اُن کے حلقہ احباب میں سب ہی اُن کی اس دوستی سے بخوبی واقف تھے۔ آج بھی دونوں ساتھ ہی عمر کوٹ روانہ ہوئے تھے جہاں اُن کے والدین اُن کے منتظر تھے۔

''نمستے ماتا جی...... نمستے باؤ جی......'' گھر میں داخل ہوتے ہی دیا نے نعرہ لگایا۔

''میری رانی...... بٹیا آگئی...... جیتے رہو بیٹا......خوش رہو۔''

''لیں سنبھالیں اس چڑیل کو، میں بحفاظت لے آیا ہوں اور اب اس گھر پر بھگوان ہی کرپا کرے۔'' دیپک اسے چھیڑنے کے لیے رویا دیوی اور کرشن نارائن کی دعاؤں کے جواب میں چہکا۔

''ہاں......تم مجھے لائے ہو یا میں تمہیں لائی ہوں سارے راستے تو سوتے ہو تمہاری اور سامان کی حفاظت میں کرتی رہی ہوں۔'' وہ اُسے زبان چڑا کر بولی۔

''ارے ارے آتے ہی لڑنا شروع کردیا نہ جانے تم لوگ وہاں کیسے امن سے رہتے ہو۔ چلو جاؤ ہاتھ منہ دھولو میں کھانا لگالوں۔'' رویا دیوی نے پیار سے دونوں کو گھر کی دی۔ کرشن نارائن حسبِ عادت سنجیدگی سے اپنی پوجا میں مصروف رہے وہ عموماً کم ہی گویا ہوتے دونوں بچے اُن کا لحاظ بھی کرتے تھے۔

دیپک کے والد منوہر کم سنی میں ہی اسے یتیمی دے گئے تھے۔ کرشن نارائن نے ہی دیپک اور اُس کی ماں کو سہارا دیا تھا۔ بھتیجے سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ رویا دیوی بھی فطری طور پر بیٹا نہ ہونے کی کمی دیپک کی شکل میں ہی دور کرتی تھیں اور اُسے بھرپور ممتا دیتیں تھیں۔

دیپک بھی پہلے اپنی ماتا جی کے پاس جانے کے بجائے چچا اور چچی کے حضور حاضری دینا زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ اسی لیے اب رویا دیوی اور کرشن نارائن کے آشیر باد لے کر فوراً اپنے گھر ہولیا۔

''بیٹا اتنی جلدی سے گزر جاتا ہے آخر کب تیری تعلیم ختم ہوگی۔ تیرے آنے کا تو مجھے پتہ ہی نہیں چلتا مگر تیرے بن ایک ایک پل صدیوں کے برابر لگتا ہے۔''

رویا دیوی بڑی اُداسی سے کہہ رہی تھیں۔ اور دیا جو رات ہی سے اپنی پیکنگ شروع کرچکی تھی۔ سب چھوڑ چھاڑ اُن کے پاس آبیٹھی۔

''ماں...... اُداس تو نہ ہوں میں ہر ماہ آ بھی تو جاتی ہوں نا! تُو خود ہی تو کہتی ہے کچھ کھونے کے لیے کچھ پانا بھی پڑتا ہے۔''

انتہائی سنجیدگی سے کہے ہوئے اس جملے پر رویا دیوی اور گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیپک کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا تو وہ بری طرح جھینپ گئی۔

''کیا مطلب ہے...... یہ آپ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں۔'' ہونق سی ہوکر بولی۔

''جھلی نہ ہو تو...... کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔'' رویا دیوی ہنستے ہوئے بولیں۔

تو وہ بھی اپنے جملے کی ترتیب پر غور کرتے ہوئے بجائے شرمندہ ہونے کے زور زور سے ہنسنے لگی۔

''جہاں تمہارے قدم پہنچیں وہاں ہر شے الٹی ہوجاتی ہے۔ ابھی سے کیوں چلے آئے روانگی تو صبح ہے ہماری۔'' وہ فوراً دیپک کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''تمہیں وارن کرنے...... ابھی سے تیاری کرلو۔ صبح ہڑبونگ مچاؤ گی یاد ہے پچھلی دفعہ سارے راستے ماں جی کے ہاتھ کا اچار اور پراٹھے یاد کرتی رہیں تھیں۔''

پچھلی بار وہ جلدی میں دوپہر کے لیے رویا دیوی کا بنایا ہوا کھانا گھر ہی بھول گئے تھے اور سارے راستے بسکٹ کھاتے ہوئے وہ پراٹھے اور اُچار یاد کرتی رہی تھی۔

''میری تیاری مکمل ہے تم اپنی کہو......'' وہ مطمئن ہوکر بولی۔

''میری کیا تیاری...... دو پینٹ...... دو شرٹس تمہاری طرح ہر روز کا ایک نیا جوڑا، کاسمیٹکس، جیولری، سینڈلز اور نہ جانے کیا کیا الا بلا......'' وہ اُس کا بڑا سا بیگ دیکھ کر بولا۔

''تو تم کیوں جلتے ہو تم بھی رکھ لو یہ سب کچھ......'' وہ بھی ایک ڈھیٹ تھی۔

''چلو بس بحث ختم جلدی سو جانا تاکہ صبح فریش اٹھو اس وقت۔'' دیپک نے ہی ہتھیار ڈال دیے۔

یونیورسٹی آکر دوبارہ وہی مصروفیات شروع ہوگئیں تھیں اسی دوران دیا کے ڈپارٹمنٹ میں نئے پروفیسر کی آمد کی دھوم مچ گئی۔ پروفیسر طلال عباسی حال ہی میں PHD کرکے امریکہ سے لوٹے تھے۔ اکثریت اس آمد پر حیران تھی کہ وہ اتنا پڑھنے کے بعد واپس اپنے ملک میں آکر معمولی سے لیکچرار بننے پر کیوں ترجیح دے رہے تھے۔

اُن کی پرسنالٹی کے متعلق بھی اُن کی آمد سے قبل چہ مگوئیاں جاری تھیں۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ بوڑھے سے بدمزاج سے سخت گیر ٹیچر ہوں گے تو کوئی اُن کی شاندار گریس فل پرسنالٹی کے گن گا رہا تھا۔ ہر ایک اسٹوڈنٹ ایکسائیٹڈ تھا۔ لاشعوری طور پر دیا بھی اُن کی آمد کی منتظر اس روز جلد ہی کلاس میں موجود تھی ورنہ اپنی لااُبالی طبیعت کے سبب اکثر وہ لیٹ ہی آتی تھی۔

عموماً اُس کی فرینڈز بھی لڑکیاں کم لڑکے زیادہ تھے۔ لڑکیاں خود بھی غیر مسلم ہونے کے

سبب اکثر اس سے کترائی سی رہتیں اور لڑکے غالباً اُس کے سحر انگیز حسن، معصوم شخصیت اور بے تکلف گھل مل جانے والی عادت سے خوب مستفید ہوتے۔

اگلی نشست پر براجمان وہ ہمہ تن منتظر تھی۔ تب ہی سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔

''سر آگئے...... سر آگئے۔'' پروفیسر طلال عباسی گرے سوٹ میں ملبوس، بھوری روشن آنکھوں، گہرے براؤن بالوں اور سرخ و سپید رنگت پر ہلکی ہلکی داڑھی کے ساتھ انتہائی شاندار شخصیت کے حامل نظر آئے۔

''اونہو......اونہو...... السلام علیکم ورحمتہ اللہ......'' اُن کے کھنکھارنے پر یکلخت خاموشی اور پھر غیر متوقع طور پر انداز تخاطب نے سب کو بوکھلا دیا۔ دھیمے دھیمے وعلیکم السلام کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

''آج میری آپ کے ساتھ پہلی کلاس ہے۔ لہٰذا لیکچر کل پر اُدھار رکھتے ہیں۔ کچھ تعارف ہو جائے تو کیسا رہے گا؟''

اُن کی شگفتگی سے بھرپور آواز گونجی تو ایک بار پھر سب حیران رہ گئے۔ ان سب کا یقینی خیال تھا کہ اب دھواں دھار قسم کی انگلش شروع ہوگی اور دیا جیسی اردو میڈیم سے پڑھنے والی لڑکیاں تو خاصی پریشان بھی تھیں مگر انتہائی شائستگی سے اُردو میں مخاطب ہو کر انہوں نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

باری باری ہر اسٹوڈنٹ نے تعارف کروایا۔

''دیا نارائن......''

اُس کا نام سن کر نہ جانے کیوں وہ چونک سے گئے تھے۔ وہ اکیلی غیر مسلم لڑکی تھی۔ اس کلاس میں اور اُس کے نام سے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی پہلی بار دیا کو بھی اسی احساس نے آ گھیرا۔ لیکن پھر وہ اُن کی سحر انگیز گفتگو میں گم ہوگئی۔

''مجھے دوستانہ ماحول میں پڑھانا پسند ہے۔ آپ لوگ بلا تکلف مجھ سے کوئی بھی سوال کر سکتے ہیں اور ایک بات اور میں آپ کو پولیٹکل سائنس کا بہت اہم سبجیکٹ ہی نہیں عام طور پر ہر انسان اور سوسائٹی کو پیش اہم ایشو پر لیکچر دیا کروں گا۔ میرے لیکچر ہمیشہ کمپریٹو ہوتے ہیں۔ نظامِ سیاسیات جو عالمی سطح پر رونما ہو چکے ہیں اُن کا تقابلی مطالعہ ہمیں وہ شعور عطا کرتا ہے جس سے ہم اپنے مقصدِ حیات تک کو سمجھ سکتے ہیں۔

ساری کلاس دم بخود اُن کی گفتگو سن رہی تھی۔ دیا کو بھی اچنبھا سا ہوا۔

''مقصدِ حیات...... وہ کیسے؟ اور یہ کیسے؟ کا سوال اُسے ہر روز پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ سر طلال کی جانب راغب کرتا گیا۔

آج ہم عالمی سطح پر ابھرنے اور پھر اپنی موت آپ مر جانے والے نظاموں کا کچھ تنقیدی جائزہ لیں گے۔ سوشلزم، کمیونزم، سیکولرازم، مارکسزم، کیپٹلزم کئی روز سے وہ اِن ازم...... ازم کے گرد گھوم رہے تھے۔

آج تو تقریباً ساری کلاس ہی بور سی بیٹھی تھی۔ دیا سمیت سب تبدیلی کے خواہاں تھے۔ شاید سر طلال اُن کی نفسیات سمجھنے لگے تھے تب ہی آج مختلف اسٹائل میں نظر آ رہے تھے۔

''ہاں تو مس دیا! مس دیا نارائن آپ کے خیال میں اِن سب نظاموں میں کیا خامیاں محسوس ہوتی ہیں۔'' اچانک براہِ راست اُسے مخاطب کر کے وہ تو ہمہ تن گوش تھے جبکہ دیا جو اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھی ہراساں سی کھڑی ہوگئی۔

''جی...... سر...... وہ...... میرا خیال ہے سر مجھے مزید اسٹڈی کی ضرورت ہے۔'' شرمندگی کے ساتھ جواب آیا۔

''یقیناً اسٹڈی کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے کوئی بھی علم میں کامل نہیں ہوتا مس دیا آپ ضرور اسٹڈی کیجیے گا۔ لیکن چند پوائنٹس آپ ابھی نوٹ کرلیں۔ سوشلزم ہو یا مارکسزم یا پھر کمیونزم ...... کوئی بھی دنیا کا نظام اگر دنیا والوں کا خود تراشتہ ہوا نظام ہے تو وہ قطعی خامیوں سے مبرا نہیں ہوسکتا چاہے اسے دین کا ہی درجہ کیوں نہ حاصل ہو۔ نظام زندگی وہی بہترین' کامل اور جامع ہوگا جسے خالقِ کائنات نے خود ترتیب دیا ہو۔ کیونکہ خالقِ کائنات کا کوئی کام بھی عبث نہیں ہوتا اس لیے انسان کی تخلیق بھی ایک خاص مقصد کے تحت کی۔ کیا آپ لوگ جانتے ہیں وہ مقصد کیا تھا؟'' وہ یونہی اچانک سوال کر بیٹھے۔

''یس سر!'' اریب مودبانہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''انسان کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا یعنی اللہ کا نائب تاکہ وہ اللہ کے دیے ہوئے نظام کو دنیا میں رائج کرسکے۔''

''ایکسیلنٹ......'' سر طلال پُرجوش ہوکر بولے۔

''تم نے درست کہا یہ ہی ہماری الہامی کتاب کہتی ہے ہماری تخلیق بے مقصد نہیں۔ جب کائنات کا معمولی سے معمولی زرہ بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا تو ہم کیسے بے مقصد پیدا کیے جاتے۔ اور آپ دیکھیں کہ کائنات کی ہر شے سورج، چاند، ستارے، سمندر، جھیلیں، دریا، پہاڑ...... درخت چرند پرند...... ہر شے اللہ کے بنائے ہوئے سسٹم پر چل رہا ہے۔

خود انسان کا اپنا آپ اُس کا دل، دماغ، آنکھیں، کان، ناک، گردے، پھیپھڑے، بلڈ سرکولیشن، حتیٰ کہ پلکوں کی جنبش تک ہمارے رب کی رضا کے مطابق ہوتی ہے ہم چاہیں تو اپنی مرضی سے اپنے اختیار سے نہ کچھ کرسکتے ہیں نہ کسی سسٹم کو روک سکتے ہیں صرف اور صرف یہ نظامِ حیات ہے جو ہم نے اپنے اختیار اور اپنی خواہشِ نفس کے زیرِ اثر اپنی ہی مرضی کے تابع کر رکھے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان نظاموں میں طبقاتی کش مکش، لادنیت اور افراط وتفریط کا معاملہ محسوس ہوتا ہے۔

اُن کا ایک ایک لفظ دیا کے ذہن میں نئی روشنی کے دریچے کھولتا جارہا تھا۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ سر طلال جیسے اس سے ہی مخاطب ہوں۔

''وہ کون ہے؟ اُس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ کس کے بنائے ہوئے نظام کے تابع ہے؟''

ایسے ہی بہت سارے سوالات اُس کے ذہن میں دھماکے کررہے تھے کب کلاس آف ہوئی اور کب دیپک نے آکر اسے جھنجھوڑ ڈالا اسے علم ہی نہ ہوسکا وہ تو بس گم صم سی ہوکر رہ گئی تھی۔

''دیا...... دیا کیا ہوا ہے تمہیں...... میں کب سے تمہیں تلاش کررہا ہوں۔ تم نہ جانے کہاں گم ہو......'' دیپک کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''ہاں...... میں بھی خود کو تلاش رہی تھی۔'' وہ ہنوز دماغی طور پر غیر حاضر تھی۔

''اٹھو یار...... کینٹین چلتے ہیں بہت بھوک لگی ہے۔'' دیپک نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا تب وہ بری طرح چونکی۔

''آں...... اچھا چلو۔''

پھر اکثر وہ سر طلال کے آفس میں پائی جانے لگی۔ وہ اسے بھرپور توجہ دیتے اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی ایسا سوال کر دیتے جو اسے سوچ کی نئی راہوں کا راہی بنا دیتا۔

وہ اکیلے میں سوچتی رہتی۔ ہر قوم خود ساختہ مذاہب، ادیان اور نظام حیات اپناتی رہی اور تاریخ میں ماسوائے زوال پذیری اور ذلت و رسوائی کے کوئی تمغہ حاصل نہ کر سکی۔ رشیا اِس کی تازہ ترین مثال تو سامنے کی ہی بات ہے۔ پھر ہمارا مذہب کس طرح ترتیب پایا؟ یہ نظام حیات کس نے اور کب بنایا؟ ہماری ویدیں جنہیں ہم آوگرنتھ (اولین کلام) کہتے ہیں کس کے ذریعے ہم تک پہنچیں؟

وہ اکثر دیپک سے اسٹڈی کا بہانہ کر کے سر طلال کے پاس آجاتی۔ ایک روز اسے بھی سوجھا کہ وہ اُن سے پوچھے وہ پاکستان کیوں چلے آئے۔ ایک تابناک مستقبل چھوڑ کر۔''

''تابناک مستقبل؟ تم کیا سمجھتی ہو دیا، امریکہ میں رہنا، ڈالرز میں کھیلنا ہی تابناک مستقبل کی دلیل ہے؟''

''ظاہری بات ہے۔'' وہ ایک دم بولی۔

''نہیں دیا...... یہ مستقبل نہیں حال ہے اور حال کبھی حال نہیں رہتا کبھی نہ کبھی ضرور ماضی بن جاتا ہے مستقبل تو وہ ہے جو ہماری اس دنیا کی زندگی کے بعد ہمارے رب کے سامنے ہمیں حاضر ہونے کے بعد درپیش ہوگا اور وہ تب ہی تابناک ہوگا جب ہم نے اس کے لیے اپنے رب کو راضی کر رکھا ہو۔

اور جانتی ہو ہمارا رب ہم سے کیسے راضی ہوسکتا ہے، وہ ہم سے کہتا ہے...... ''بچاؤ خود کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر......''

''یہ ہماری کتاب قرآن مجید ہمیں بتاتی ہے کہ اگر ہم نے خود اور اپنے اہل و عیال کو دنیا کی حرص، ہوس اور طمع سے نہ روکا تو ہم ضرور جہنم کی آگ میں جا گریں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں یا میری نسل بلکہ میری پوری قوم اس تباہی کا شکار ہو بس میں اسی لیے لوٹ آیا۔''

وہ اُن کے عظیم الشان خیالات سن کر جتنی حیران ہوئی اتنی ہی گرویدہ بھی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آواگون کا نظریہ تو اُن کے ہاں بھی موجود تھا ایک کے بعد دوسرا جنم ...... لیکن اس طرح دوسرے جنم یا دوسری زندگی کی فکر کرتے اُس نے پہلی بار کسی کو دیکھا تھا۔ آپ یہاں خوش ہیں سر! وہ گویا ہوئی۔

''کیوں نہیں...... یہاں سب اپنے ہیں...... مگر یہ جو نئی جنریشن ہے نا! جو سب سے بڑا قیمتی سرمایہ ہے ہمارا بس یہی کچھ لاپرواہی ہے دل چاہتا ہے یکلخت سب کے دل و دماغ خیالات اطوار سب بدل ڈالوں۔'' وہ کسی بچے کی طرح چاند کی طلب کر رہے تھے۔

''دیا......'' بس نظر بھر کر رہ گئی۔ یہ انتہائی خوبرو، حساس اور اس قدر تعلیم یافتہ شخص اندر سے بالکل کسی شفیق ماں کی طرح تھا جو بے غرض محبت لٹائے چلی جائے۔

اُن کی صحبت اسے بھی بدلتی جا رہی تھی۔ اُس کا دل ہی نہیں دماغ بھی ...... خیالات بھی...... حتی کہ احساسات بھی سر طلال کے نام ہوتے چلے جا رہے تھے وہ اُلجھتی کبھی ...... اُن کی شخصیت سحر زدہ آواز اور کبھی اُن کے عقائد...... اُن کے خیالات ...... اُس کی سوچ کا ہر زاویہ تبدیل کیے دیتے۔ اب وہ لاپروا...... لااُبالی سی...... دیا نہیں

رہی۔ سمسٹر کی تیاری کے بہانے کمرے میں بند صرف سوچتی...... اور سوچتی چلی جاتی۔ اپنا بچپن، اپنا گھر بار، رہن سہن، پوجا پاٹ...... سب اجنبی لگنے لگا تھا۔

دل کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اسے لگتا تھا اب تک وہ غلط تھی...... غلط ہے...... مگر صحیح کیا ہے؟ یہ گرہ ابھی تک نہیں کھل سکی تھی۔ بالآخر یہ سوال بھی اس نے سر طلال عباسی کے سامنے ہی رکھ دیا۔

''سر آپ نے یہ سب ادراک کہاں سے حاصل کیا؟ خدا اور بندے کے تعلق سے متعلق......'' دھیمے دھیمے لہجے میں وہ اُسے سمجھا رہے تھے کہ وہ اچانک مجسم سوال بن گئی۔ وہ تو کب سے منتظر تھے کہ وہ یہ سوال کرے اور وہ اسے جنت کی راہوں کا پتا بتا دیں۔

یہ معصوم حسن پہلی نظر میں ہی انہیں گھائل کر گیا تھا مگر یہ ادراک کہ وہ ہندو ہے اُن کا دل چیرے ڈالتا مگر پھر انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور اسے دائرہ اسلام میں لانے کی سعی کریں گے۔ وہ تو آئے ہی اسی لیے تھے کہ اپنی نوجوان قوم کو آفاقی دین......

دینِ اسلام کی حقانیت اور افضلیت کا وہ درس دیں جو انہیں آج مغلوبیت کے غاروں سے نکال کر تاریخ کے روشن ابواب کی طرف اقوامِ عالم کا امام بنا سکے۔

بہت عرصے پہلے USA میں ہی اسلامک سرکل جوائن کرنے کے بعد انہوں نے یہ بیڑا اٹھایا تھا پھر اس کے عملی اظہار کے لیے اپنے وطن لوٹ آئے جہاں نوجوان نسل مغربیت کی اندھی تقلید میں اپنی خودی کو ناکارہ ہی نہیں برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ انہوں نے اسی وقت اپنی سائیڈ دراز کھولی اور قرآنِ حکیم معہ اُردو ترجمہ و تفسیر اُس کی جانب بڑھایا۔

''یہ زندہ کتاب ہے...... یہ انسان کی دکھتی رگ پکڑتی ہے۔ یہ دل کا چور پکڑتی ہے۔ یہ دکھی انسان کے زخم پر مرہم رکھتی ہے بس شرط یہ ہے کہ تم اس سے دوستی کر لو پھر یہ تمہارے حالات کے مطابق تمہاری دلی کیفیت کے مطابق تم سے معاملہ کرے گی، تمہیں مشورہ دے گی۔ تمہارے ہر سوال کا جواب اس میں موجود ہے دیا......!''

انہوں نے گویا دروازے کی کنجی اسے تھما دی اب دروازہ کھولنا ہے یا بند رکھنا یہ دیا کی مرضی تھی۔ پھر واقعی وہ دیوانی ہو گئی۔

کمرہ بند کیے بس قرآن ہی زیرِ مطالعہ رہتا۔ جہاں اٹکتی سر طلال کے سامنے حاضر ہو جاتی۔ وہ بھی اسے رسانیت سے سمجھاتے، نئے سوال اٹھاتے اُس کے ساتھ نئے جواب تلاشتے......

دیپک اپنی پڑھائی میں مگن اسے مصروف دیکھ کر خود بھی احتیاط برتنے لگا کہ شاید اس بار وہ سنجیدگی سے پوزیشن حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اسی دوران سر طلال دو دن تک غیر حاضر رہے یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ کلاس سے غیر حاضر تھے ورنہ اُن کے لیکچرز بہت باقاعدگی سے ہوتے اور اُن کے انداز اور محبت و شفقت کی بنا پر ہر اسٹوڈنٹ اُن کی کلاس میں حاضر ہوتا۔

جب وہ دو دن نظر نہ آئے تو دیا کے ساتھ ساتھ سب ہی بے چین ہو گئے۔ ایڈمنسٹریشن بلاک سے پتہ چلا سر طلال علیل ہیں۔ فوراً لڑکوں نے اُن کا ایڈریس حاصل کیا اور تقریباً 20'10 اسٹوڈنٹ جانے کو تیار تھے۔ دیا کو اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں جانا بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ سو اس نے کلاس فیلو حماد سے ریکویسٹ کر کے سر کا فون نمبر لے لیا۔

سیل نمبر تھا، جسے کافی دیر وہ پکڑے سوچتی رہی کہ کیا کرے۔

عجیب سا فیل ہو رہا تھا بالآخر اس نے ہمت کی اور اپنے سیل سے نمبر ملا ہی لیا۔

''السلام علیکم......!'' ہیلو کے بجائے سلام سن کر وہ لحظہ بھر کے لیے چپ سی رہ گئی۔ پھر بے ساختہ حسب عادت سوال داغ دیا۔

''یہ آپ ایک دم سلام کیوں کر ڈالتے ہیں۔'' وہ فوراً پہچان گئے تھے کب سے منتظر بھی تو تھے اس آواز کے......

''اس لیے کہ ہمارا مذہب ہے ہی سراسر سلامتی...... ہمیں سلامتی پھیلانے کی تاکید بھی کرتا ہے تو میں کیوں پیچھے رہوں اس کارِ خیر سے۔''

''اور وہ جو ساری دنیا میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کا لیبل مسلمانوں پر تھوپا جا رہا ہے اُس کا پس منظر کیا ہے؟'' وہ بالکل بھول گئی کہ اس نے فون کیوں کیا تھا۔

''یہ بھی دیا دراصل ہماری آزمائش ہے اسلام ہمیں امن واخوت کا درس دیتا ہے۔ شرپسند استعماری قوتیں اسی بات سے خائف ہیں کہ اسلام کو ماننے والے امن واخوت' باہمی خیر خواہی اور محبت فاتح عالم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر اس سے قبل کہ دنیا پر چھا جائیں انہیں اس قدر بدنام کر دیا جائے کہ لوگ اُن سے غیر شعوری طور پر خائف ہو کر بددل ہو جائیں اور ہم مسلمان بھی اگر آزمائش کی اس بھٹی میں پڑ کر صبر اور حوصلے کا پہاڑ بن جائیں تو بڑے سے بڑا طوفان بھی آ کر ٹکرا جائے لیکن وہ اپنی جگہ جمے رہیں گے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں دیا کہ فیصلہ کر ڈالو...... بغیر ڈرے...... بغیر جھجکے......''

آج وہ اس سے برملا اظہار کر رہے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی گم صم سی ہو گئی۔

''دیا...... اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان' توکل اور صبر وہ صفات ہیں جن کی مدد سے آدمی مشکل ترین حالات سے بھی بخیر و خوبی گزر جاتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات......'' آج وہ اس سے سوال کر رہے تھے۔

اُن کا لہجہ تھکا تھکا سا محسوس کر کے وہ چونک گئی۔

''اوہ سوری سر! میں نے آپ کا حال تو پوچھا ہی نہیں......''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ اس کی شرمندگی بھانپ گئے۔

''اب گھر آ کر پوچھنا او کے...... میرے کچھ گیسٹ آ گئے ہیں پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ۔'' انہوں نے بات ہی ختم کر دی۔ شاید اب وہ اُس کا فیصلہ سننے کے خواہاں تھے۔

وہ سارا دن...... ساری رات سوچتی رہی......

دو ماہ سے وہ گھر بھی نہیں گئی تھی۔ پتا جی کے مزاج کی گرمی اور ماتا جی کی ممتا کی ٹھنڈک...... دیپک کے ساتھ بچپن کی محبت اور اب دینِ اسلام کی طرف رغبت...... اپنے مقصد حیات کا ادراک اُسے ہر شے پر حاوی نظر آنے لگا تھا مگر آج وہ دل کی عدالت میں احتساب کرنے بیٹھی تھی۔

کہیں یہ رغبت محض سر طلال کی شخصیت سے مرعوبیت تو نہیں۔ کہیں وہ اُن کی محبت میں گرفتار تو نہیں ہو گئی۔ اُس کا دل ہاں اور ناں کی ملی جلی کیفیت کا شکار تھا مگر ایک بات طے تھی کہ وہ اب صحیح رستہ جان چکی ہے اور اس راہ سے لوٹنا اب ناممکن ہے پس اب اسے آزمائشوں کی اس بھٹی میں قدم رکھنا ہی تھا چاہے یہ قدم تنہا اٹھتا یا سر طلال کے ساتھ......

وہ فیصلہ کر کے مطمئن ہوگئی اور پُرسکون نیند نے اُسے آگھیرا۔

☆......☆......☆

دوسرا دن شاید تھا ہی بہت روشن یا پھر ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہت فریش محسوس کر رہی تھی تب ہی دیپک کی کال آگئی۔

''کہاں ہو یار...... کتنے دن ہو گئے تم سے بات نہیں ہو پا رہی نہ ہم نے لنچ ساتھ کیا...... اب ایسی بھی کیا پڑھائی، آج تم کلاسز بنک کرو میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔'' وہ استحقاق سے کہہ رہا تھا۔

''نہیں دیپک پلیز...... ابھی نہیں......

''آج وہ خلافِ توقع اسے انکار کر رہی تھی ورنہ تو اس سے قبل وہ اس کی کلاسز چھڑوا دیتی تھی محض اپنی آؤٹنگ کے لیے اور آج...... وہ حیران ہی تو رہ گیا۔

''کیوں دیا! تمہارا دل نہیں چاہ رہا کہیں گھومنے کے لیے......'' وہ استفسار کر رہا تھا۔

''نہیں دیپ...... آج مجھے سر طلال کے ہاں جانا ہے۔ وہ بہت بیمار ہیں کافی دن سے نہیں آئے اس لیے میں آج اور تمہیں نہیں جاؤں گی۔

''اوہ......'' وہ سر طلال کا تذکرہ اس سے پہلے بھی کئی بار کر چکی تھی اور وہ اسے عام سی بات سمجھ کر ٹال دیتا مگر آج اسے اپنی آفر رد کیا جانا ناگوار محسوس ہوا۔

''کیا یہ بہت ضروری ہے۔'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''ہاں بہت......'' وہ بھی حتمی لہجے میں بولی تو دیپک نے بغیر کچھ کہے موبائل آف کر دیا۔ یہ کھلا اظہار تھا ناراضگی کا مگر......

''سوری دیپ اب تمہیں میرے بنا ہی رہنا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر اب کوئی اختیار نہیں رہا۔ تمہاری ناراضگی تو اب ساری عمر میرے ساتھ رہے گی۔ کاش تم بھی جلد اس کے عادی ہو جاؤ۔''

وہ تفکر کی گہری لکیریں ماتھے پر سجائے سوچوں میں گم باہر چلی آئی۔

سر طلال کا گھر تو اسے معلوم نہ تھا اسی لیے اس نے انہیں دوبارہ کال کی۔ انہوں نے فوراً ہی شوفر بھیجنے کی آفر کر دی تھی اور اب وہ اُن کی گاڑی کے انتظار میں اسٹاپ پر ہی آگئی۔

کچھ ہی دیر میں باوردی شوفر مقررہ جگہ موجود تھا اور وہ اس کے ساتھ سر طلال کے ہاں رواں دواں...... سوچوں میں گم...... اچانک وہ چونک اٹھی۔ شوفر نے گاڑی میں لگا ریکارڈر پلیئر آن کر دیا تھا قرآن پاک کی سحر انگیز تلاوت جاری تھی۔ عربی تجوید کے ساتھ کوئی انتہائی خوش الحانی سے تلاوت کر رہا تھا۔

دیا کو اپنا دل و دماغ گویا کسی سحر میں جکڑتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ قاری اب تلاوت کا ترجمہ پیش کرنے لگے تھے۔

ہر ہر لفظ آگہی کے نئے در وا کر رہا تھا۔

دیا......

'یہ راستہ بہت پُر خار ہے تمہیں بہت مصائب کا سامنا ہوگا'

اس کا دل ڈروا دینے لگا۔ پتا جی تو تمہیں جان سے ہی مار ڈالیں گے۔ ماں جی کی محبت سے محروم ہو کر کہاں جاؤ گی اور دیپک......

شاید وہ بھی تمہیں کبھی معاف نہ کرے......

کوئی سہارا ہے بھی تمہارے پاس جو اتنا بڑا قدم اٹھانے چلی ہو......

''ہاں...... ہے...... خود ہی جواب بھی آ گیا ...... اللہ رب العالمین...... جس نے پیدا کیا ہے۔

میرے لیے دنیا بنائی اور جو جنت کا وعدہ بھی کر رہا ہے۔ وہ کیوں تنہا چھوڑے گا مجھے۔ اس نے تو پیدا کر کے بھی تنہا نہیں چھوڑا۔ ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنی کتاب عطا کر دی اور کتاب پر عمل کرنے والے عظیم سیرت کے حامل مسرور عالم آنحضور ﷺ کی زندگی بھی کھلی ہوئی روشن کتاب ہے۔ ایمان لانے والوں پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ دونوں کی رحمت ہوتی ہے۔''

کسی کتاب میں جو سر طلال نے اسے مہیا کی تھی پڑھے جانے والے جملے اس کے دل پر نقش تھے تب اُس کا حوصلہ کیونکر پسپا ہوتا۔ مزید تقویت پا گیا۔

''سر طلال مجھے دائرہ اسلام میں شامل ہونا ہے۔'' یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے ان سے ملتے ہی ادا کیا تھا۔

''تم نے بہت اچھی طرح سوچ لیا ہے نا!''

''جی سر......!'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

''تمہیں بہت بہت مبارک ہو کہ تم صحیح سمت قدم اٹھا رہی ہو مگر دیا! کچھ امور ایسے ہیں جن پر بات کرنا ابھی بہت ضروری ہے۔ تم یقیناً مجھے غلط نہیں سمجھو گی کیونکہ مجھے صرف اور صرف تمہاری عزت، تمہارا مفاد مطلوب ہے...... میری پوزیشن حالانکہ اتنی عجیب ہے کہ میں خود بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ تم سے کہوں یا نہیں......'' وہ عجیب مخمصے کا شکار تھے۔ اسے منزل دکھا کر وہ خود بہت بڑی آزمائش میں پڑ گئے تھے اُن کی زندگی عجیب دوراہے پر آ گئی تھی۔

لیکن یہ بات کلیئر ہونا بھی ضروری تھی ورنہ وہ ہمیشہ نادم رہتے۔ اپنے آپ سے۔

''دیا......'' وہ ہمہ تن گوش تھی۔

''کہیں تم میری وجہ سے تو یہ قدم......'' وہ ہکلائے۔

''نہیں ہرگز نہیں سر!'' وہ بے ساختہ اُن کی بات کاٹ گئی۔ وہ اُن کا مفہوم و مدعا سب سمجھ گئی تھی۔

''نہیں سر یہ فیصلہ میں نے سراسر اپنی ذات کو، اپنے رب کی معرفت تک پہنچانے کے لیے کیا ہے۔ آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لیں۔'' اُس کے لہجے کا یقین انہیں شانت کر گیا۔

''لیکن سر......'' وہ بری طرح چونک گئے۔

''لیکن...... ہی تو اصل آزمائش تھی۔''

''دراصل سر...... دیپک میرا بچپن کا منگیتر ہے بلکہ تھا۔ اب جبکہ میں تنہا رہ جاؤں گی اپنے خاندان کو چھوڑ کر مجھے لازماً کسی سہارے کی ضرورت ہوگی اور یہ سہارا مجھے......'' وہ اٹک گئی۔

''کیا آپ...... میرا مطلب ہے......'' اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اپنا مدعا کیسے بیان کرے۔

''یہی تو مسئلہ ہے...... میں چاہتے ہوئے بھی تمہیں اپنا نہیں سکتا میں اور تم استاد اور شاگرد کے ایسے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں جو بہت ساری مصلحتوں اور احتیاطوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میں اپنے پیشے کا تقدس مجروح نہیں کر سکتا اس لیے میں......''

''بس سر...... میں سمجھ گئی۔'' وہ دوبارہ اُن کی بات پوری ہونے سے قبل اُن کا مفہوم سمجھ چکی تھی۔ گو کہ اُس کے اندر بہت اندر سناٹے گونجنے لگے تھے مگر پھر بھی وہ مسکرائی۔

''میں آپ کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گی۔'' اُس کی آنکھوں میں در آئی نمی سر طلال عباسی کو دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں لے گئی۔

''کاش......'' پہلی بار انہیں اپنے منصب

سے نیچے آنے کی خواہش دل میں کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہونے لگی وہ کل سے بلکہ بہت دن سے خود اپنے نفس کے ساتھ جنگ کررہے تھے۔ وہ انہیں بہت اپنی اور دل سے قریب محسوس ہونے لگی تھی مگر وہ اپنا مشن اپنا مقصد نفسانی خواہش کے ہاتھوں فروخت نہیں کرسکتے تھے۔ وہ یہ کام کسی بھی کھوٹ اور ریا سے پاک سرانجام دینا چاہتے تھے اس لیے یہ فیصلہ بے حد ضروری تھا۔

''سنو دیا...... اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہارے لیے ایک بہت ہی اچھے شریکِ سفر کا مشورہ دے سکتا ہوں جو تمہیں ہر لحاظ سے مکمل سپورٹ دے سکے۔'' بہت پہلے وہ یہ بھی طے کرچکے تھے۔

''میرا دوست ہے شہروز...... ہم نے ساتھ ہی تعلیم حاصل کی ہے۔'' اُس کی خاموشی کو رضا مندی سمجھ کر وہ گویا ہوئے۔

''وہ بہت دیندار اور متقی انسان ہے اور......''

''سر آپ جیسا سمجھیں کریں۔ فی الحال مجھے یہ بتائیں مجھے کیا کرنا ہے کیونکہ اب میں واپسی کی ساری کشتیاں جلا آئی ہوں۔ آج میں دیا بن کر نہیں لوٹنا چاہتی۔'' وہ سر جھٹک کر گویا انہیں سارے اختیار دے رہی تھی۔

''ہاں ...... ضرور...... ٹھہرو میں اپنی والدہ سے تمہیں ملواتا ہوں۔ اُن کے ساتھ تم تیار ہوکر حافظ صاحب کے ہاں پہنچ جانا وہیں انشاء اللہ اُن کے ہاتھ پر دعوتِ اسلام قبول کرنے کے ساتھ ہی تمہارا نکاح شہروز کے ساتھ کردیتے ہیں۔ میں ابھی روانہ ہورہا ہوں تاکہ سارے انتظامات سنبھال سکوں۔ شہروز سے وہ پہلے ہی سارے معاملات طے کرچکے تھے اور حافظ صاحب سے بھی تمام امور ڈسکس کرتے رہے تھے۔ اس لیے انہیں زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ اور وہ تو اپنی زندگی کی باگیں اُن کے ہاتھ میں دے کر خود کو رب کے سپرد کیے بس توکل اللہ کی عملی تصویر بن گئی تھی۔

لحظہ بھر کے لیے اُس کا دل چاہا تھا کہ دیپک کو آگاہ کردے مگر پھر خود ہی اس نے یہ تجویز رد کردی کہ اس میں خطرہ ہی تھا۔ اب تو اسے دیپک اور گھر والوں سے دور ہونا ہی تھا تو کوئی رسک کیوں لیا جائے۔

طلال عباسی کی والدہ انہی کی طرح بہت شفیق تھیں۔ بہت محبت سے ملیں اور اسے دیر تک دعائیں دیتی رہیں۔

شام تک وہ دیا سے فاطمہ الزہرہ بن چکی تھی اور پھر شہروز کے ساتھ مناکحت کے بعد فاطمہ شہروز......

زندگی کا یہ انقلاب اچانک ہی آیا تھا۔ نہ اس نے شہروز کو دیکھا تھا اور نہ انہیں جانتی تھی بس ایک اعتماد تھا جس کی بدولت آج وہ اس کے ساتھ زندگی کا ناطہ جوڑے بیٹھی تھی۔

کھانے کے بعد تنہا کمرے میں بیٹھے ہوئے وہ شہروز کی آمد کا سن کر عجیب سی کیفیت کا شکار تھی، جب ہی اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آنے والا بہت قریب آکر بیٹھ چکا تو کھنکھار کر گویا ہوا۔

''السلام علیکم! فاطمہ...... مجھے تمہاری ہمراہی کا شرف پاکر اپنے آپ پر بہت فخر سا محسوس ہورہا ہے۔ میں کوئی فرشتہ صفت انسان نہیں مگر ایمان کی دولت پر اپنا سب کچھ قربان کرنے والی شریکِ سفر کا شوہر بننے کے بعد یہ دعویٰ ضرور کروں گا کہ ہم انشاء اللہ ایک دوسرے کے لیے بہترین شریکِ حیات ثابت ہوں گے کیونکہ ہماری نیتیں

محض اپنے رب کی رضا کے حصول کی طرف ہیں یقیناً وہ رب بھی ہمارا ضرور ساتھ دے گا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!'' شہروز کے ہاتھ کا مضبوط لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کر کے اس نے بھی نگاہ اٹھائی۔

''انشاء اللہ تعالیٰ.......'' لب دعا گو تھے اور دل میں یقین...... اُن کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔

شہروز کی والدہ انتقال کر چکی تھیں اور تین بہنیں، دو بھائی چھوٹے تھے، والد انتہائی ضعیف اور بے ضرر سے انسان تھے۔ شہروز نے اپنی تعلیم کے حصول کے لیے کافی وقت ملک سے باہر گزارا تھا۔ اس لیے بہن بھائیوں سے بے تکلفی نہ ہونے کے برابر تھی۔ شادی میں بھی یہ لوگ کچھ حیران اور کچھ بیزار سے شریک ہوئے تھے۔ شہروز نے ساری صورتِ حال سے فاطمہ کو آگاہ کر دیا تھا اور وہ مطمئن تھی کہ اپنے حسن سلوک سے ان لوگوں میں جلد ہی جگہ بنا لے گی۔

☆......☆......☆

وہ رخصت ہو کر شہروز کے بڑے سے گھر میں آئی تھی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی فی الحال منقطع کر دیا تھا اب وہ تھی اور شہروز کی رفاقت......

اس کا اکثر وقت قرآن کی تلاوت اور ترجمہ پڑھنے میں صرف ہوتا۔ شہروز اُس کا تقویٰ اور عبادت گزاری دیکھ کر رشک کیا کرتا البتہ وہ محسوس کرتی کہ شہروز کے والد اور شہروز کے علاوہ باقی لوگ نمازیں بھی پابندی سے ادا نہیں کرتے۔ شہروز کی بہنیں بھائی کے سامنے تو لحاظ کرتیں، اُس کی عدم موجودگی میں البتہ اُن کا انداز اور رویہ قدرے مختلف ہوتا۔

شہروز کے گھر میں پیسے کی کمی نہ تھی مگر شہروز نے ہر آسائش مہیا کرنے کے باوجود گھر میں T.V اور ریکارڈ پلیئر کی آلائشوں سے گھر کو دور ہی رکھا ہوا تھا۔ البتہ حال ہی میں شہروز کے بھائیوں نے کمپیوٹر خرید لیا تھا اور اب شہروز کی عدم موجودگی میں اپنے کمرے میں بند ہو کر وہ تمام بہن بھائی اسی کے گرد جمع رہتے، ایسے میں فاطمہ بہت تنہائی محسوس کرتی تھی۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ لوگ بھی اُس کے ساتھ زندگی کی خوشیاں شیئر کریں۔ ہنسیں بولیں مگر ان لوگوں نے ایک حد شروع دن سے اُس کے اور اپنے درمیان قائم رکھی تھی۔ جسے وہ چاہتے ہوئے بھی توڑ نہ پا رہی تھی۔

اس روز بھی وہ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر شہروز کا انتظار کرتے کرتے لان میں چلی آئی۔ شام کی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا انتہائی پُرلطف محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کا دل چاہا اُس کے ساتھ کوئی ہو جس سے وہ خوب ساری باتیں کرے۔ یہی کچھ سوچ کر وہ لان میں کھلنے والی اس کھڑکی کی طرف چلی آئی جو ندا، صائمہ اور صبا کے کمرے سے ملحق تھی۔ اس نے سوچا تھا ان تینوں میں سے کسی کو بلا لیتی ہوں۔ مل کر چائے ہی پی لیں گے کھڑکی اُدھ کھلی تھی۔ دھیمے دھیمے موسیقی کی آواز جلد ہی اسے چونکا گئی۔ ان کے کمرے میں ہلکے سروں میں میوزک بج رہا تھا اور کھڑکی میں سے واضح ہونے والا منظر خاصا دل دکھانے والا تھا۔ تینوں بہنیں میوزک کے ساتھ محوِ رقص تھیں ایک دوسرے کو ٹپس سمجھاتی ہوئی وہ اس بات سے قطعی بے پرواتھیں کہ فاطمہ انہیں دیکھ چکی تھی۔

فاطمہ کو رنج و ملال نے آگھیرا۔ شہروز اور وہ ہر لمحے رب سے تعلق جوڑنے میں لگے رہتے تھے اور شہروز کی بہنیں...... قطعی دنیا میں مگن تھیں۔ وہ

انہیں سمجھانے کی خاطر اُن کے کمرے میں چلی آئی۔ ہلکی سی دستک کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ وہ تینوں اُسے دیکھ کر چونک گئی تھیں۔

''آپ......'' صبا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''یہ سب......؟'' فاطمہ کی سوالیہ نگاہیں اُن کی جانب اٹھی تھیں۔

''لگتا ہے بھابی جی کو اپنا ماضی یاد آ گیا ہے...... آپ کو تو بہت اچھا رقص آتا ہوگا۔ آپ کے مذہب کا حصہ ہے نا یہ تو......''

صائمہ قدرے بدتمیزی سے ڈھٹائی کے ساتھ بولی تو فاطمہ کا مارے رنج کے دل پھٹنے لگا۔ وہ کیا تھی اور وہ لوگ کیا سمجھ رہی تھیں۔ وہ کچھ نہ بول سکی اور فوراً مڑ گئی۔

''ارے...... بھابی......'' ندا تیزی سے آگے آئی۔

''پلیز آپ برا محسوس نہ کریں...... دراصل ہماری دوست کی شادی ہے۔ کل مہندی ہے ہم اسی کے لیے ڈانس کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ صائمہ بھی بس...... آپ پلیز...... بھائی سے نہ کہیے گا۔'' وہ لجاجت سے اُس کا ہاتھ تھام کر بولی تو فاطمہ کے اٹھتے قدم تھم گئے۔

''تمہیں بھائی سے نہیں اُس سے ڈرنا چاہیے۔'' اس نے انگلی اٹھا کر اوپر اشارہ کیا اور دھیرے سے اُس کا ہاتھ چھوڑ کر چلی آئی۔ اس بات کا اس نے شہروز سے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا مگر اس روز حد ہی ہوگئی۔ اس کی طبیعت بہت گری گری سی رہنے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوشخبری سے نوازا تھا اور بہت جلد وہ اپنے قدموں تلے جنت کی آہٹ پاتی۔ وہ عشاء کی نماز بہت جلد ادا کر لیتی تھی۔ شہروز کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں اور اس کے بہن بھائیوں کی وہی روٹین تھی الگ تھلگ...... اپنے اپنے کمروں میں بند یا یونیورسٹی کالج کی مصروفیات...... شہروز کے والد تو ضعیفی اور اکثر و بیشتر آ گھیرنے والی بیماریوں کے سبب کمرے میں مقید ہی رہتے۔ اس روز بھی وہ عشاء پڑھ کر لان میں ٹہلنے نکل آئی یکلخت اس کے قدم ساکت ہوگئے۔ اس کے کانوں میں پڑنے والی آواز پگھلا ہوا سیسہ ثابت ہو رہی تھی۔

''اوم...... جے لکشمی ماتا...... اوم جے لکشمی ماتا...... تم ہو سب کے سیوک......'' اس کے کانوں میں پڑنے والی بھجن کی آواز نے اس کے قدموں میں لرزش واضح کر دی تھی مگر وہ آواز کی سمت چلی آئی۔

یہ آواز ان تینوں کے کمرے سے آ رہی تھی۔

انہوں نے کمپیوٹر کے مونیٹر پر کیبل کے لیے ریسیور لگایا ہوا تھا اور تمام چینلز بخوبی دیکھ سکتی تھیں اور اس وقت بھی وہ پڑوسی ملک سے آنے والے ڈراموں میں محو تیز آواز میں اُن کی مذہبی رسومات نہ صرف دیکھ رہی تھیں بلکہ زیرِ لب گنگنا بھی رہی تھیں۔

''اوم جے لکشمی ماتا......''

''بند کرو یہ سب......'' فاطمہ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تو وہ اُن کے کمرے میں آ کر بے طرح چلائی۔

''کیا کر رہی ہو تم لوگ...... یہ ایک مسلم گھرانہ ہے۔ یہاں قرآن کی تلاوت ہونی چاہیے۔ اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہونی چاہئیں نا کہ یہ پتھر کی مورتیاں اور ان کے آگے گائے جانے والے بھجن گونجنے چاہئیں۔'' وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

''صد افسوس...... صائمہ، ندا...... صبا...... یہ

کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو......'' وہ انہیں جھنجھوڑ رہی تھی۔

'' تم لوگ کیوں بھول گئیں کہ تم مسلمان ہو اللہ کو ماننے والے...... اس کے آگے جھکنے والے......ایک دن تمہیں اسی کے آگے حاضر ہونا ہے......کیوں بھول گئے تم لوگ کیوں......'' وہ رو رہی تھی اور اُن لوگوں کی روحوں پر تازیانے برسا رہی تھی۔ وہ جو ایک غیر مسلم تھی اسلام کی حقانیت جان کر......اور اپنے رب کو پہچان لینے کے بعد ایمان کا مزہ پا لینے والوں میں سے تھی۔ آج انہیں خود سے بہت بلند نظر آئی۔ وہ جو شعوری نہیں موروثی مسلمان تھیں آج شرم سے نظریں نہیں اٹھا پا رہی تھیں۔

'' بھابی......'' ندا کی چیخ سب کو چونکا گئی۔ فاطمہ شدید ہیجانی اور جذباتی شاک کے نتیجے میں بے ہوش ہو کر زمین پر آ گری تھی۔ وہ تینوں بری طرح بوکھلا گئیں۔ جلد از جلد اپنے بابا رفیق الملک کو اطلاع کی، انہوں نے شہروز کو فون کیا اور ایمبولینس بھی فوری منگوالی گئی ہاسٹل جانے تک وہ تینوں شدید ہراساں اور وہ مکمل طور پر بے ہوش تھی۔

ڈاکٹرز اُسے فوراً ہی ایمرجنسی میں لے گئے۔ شدید جذباتی جھٹکے نے اس کا کیس قبل از وقت ہی نہیں پیچیدہ بھی کر ڈالا تھا۔ اور اب وہ سب ہچکیوں کے ساتھ سربسجود تھے کہ خدا اس کی زندگی لوٹا دے کہ ایسی ایمان افروز زندگیاں مشعل راہِ ہوتی ہیں۔ پھر صبر آزما انتظار کے بعد پیارے سے بیٹے کی پیدائش اور اس کی زندگی کی نوید ان سب کے لیے گویا حیات افزا پیغام لائی تھی۔ شہروز تو خوشی کے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے اُس کا ہاتھ تھامے مسلسل رب سبحان کی حمد میں مصروف تھا اور وہ سب معصوم، حسین اور گل گوتھنے سے بھتیجے کے گرد دیوانہ وار قربان ہو رہے تھے۔

رفتہ رفتہ اسے ہوش آنے لگا۔ حواس مجتمع ہوئے تو آنکھوں کے سامنے نظر آنے والا منظر بہت ہی خوش کن تھا۔ رفیق الملک وہیل چیئر پر بیٹھے تھے' گود میں اُس کا بیٹا لیے اور ان کے گرد اس کی ساری نندیں اور دیور آنکھوں میں خوشی اور ندامت کے آنسو لیے بہت محبت سے اسے تک رہے تھے۔ اس کے ہوش میں آتے ہی اس کے سسر رفیق الملک گویا ہوئے۔

'' بیٹا بہت مبارک ہو تمہیں......نئی زندگی اور یہ خوبصورت سا خدا کا تحفہ بھی......چلو شہروز سب سے پہلے اس کے کان میں اذان دیتے ہیں۔''

وہ اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر باآواز بلند اذان کہنے لگے۔

'' اللہ اکبر......اللہ اکبر......''

فاطمہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سب کے لب ساتھ ساتھ یہی الفاظ دہرا رہے تھے۔ اذان مکمل ہوتے ہی وہ سب اس کے پاس چلے آئے۔

'' بھابی آج سے ہمارے گھر میں صرف یہی صدا گونجے گی کوئی اور نہیں......'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر ایک ساتھ گویا ہوئیں۔

'' اور ہم اپنے بیٹے کا نام ایمان رکھیں گے تاکہ ہماری تجدید ایمان ہر لمحے ہوتی رہے کیوں فاطمہ......!''

شہروز بھرپور انداز میں مسکرائے تو وہ بھی آسودگی کے ساتھ مسکرا دی کہ اس کے رب نے اُسے مایوس نہیں کیا تھا۔ سرخروئی بالآخر اس کا مقدر ٹھہری تھی۔

☆☆......☆☆

ماہنامہ دوشیزہ کراچی ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ......پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ چوالیس (44) برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
- ......اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- ......اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ......پوری دنیا میں پھیلے' اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ......اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ......جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ......اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں' جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ......آپ کی مصنوعات کے اشتہار بالکفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ......جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: دوشیزہ

88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7۔ کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

افسانہ

احمر علی

شام ٹھہر جائے

''رضوان مجھے تم پسند ہو میں تم سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی مگر یہ سب اتنا آسان نہیں چلو مان لیا کہ تمہارے اور میرے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا مگر یہ تو بتاؤ ہمارے بچے کس مذہب پر پروان چڑھیں گے تمہارے یا میرے، میں کوئی بھی ایسا فیصلہ......

آج صبح سے سرد ہوا چل رہی تھی۔ دسمبر نے آتے ہی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور اُداسی کا راج تھا۔ ایسے میں درختوں سے جھڑتے پتے موسم کی اداسی میں مزید اضافہ کر رہے تھے اور اس اداس موسم میں رضوان بھی کافی خاموش اور اُداس دکھائی دے رہا تھا۔

وہ اپنے آپ سے بے خبر جانے کس سوچ میں گم تھا کہ اچانک مہک کی آواز پر چونکا۔

''رضوان ناراض ہو مجھ سے۔'' مہک نے ساتھ والی چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' رضوان نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''رضوان تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو میں جانتی ہوں کہ کل رات تم نے میرا بہت انتظار کیا ہوگا لیکن میں بھی کیا کرتی کل اچانک گھر پر کچھ مہمان آ گئے تھے۔ اس لیے میں تمہاری برتھ ڈے پارٹی پر نہیں آ سکی۔'' مہک نے رضوان کو اپنی مجبوری بتانے کی کوشش کی۔

''اگر تمہارے گھر پر مہمان آ گئے تھے تو تم فون بھی تو کر سکتی تھیں جبکہ تم جانتی تھی کہ مجھے تمہیں اپنی مما سے ملوانا تھا اور اب تو مما تین دن بعد امریکہ واپس جانے والی ہیں۔''

''سوری رضوان پلیز اب تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ میں پرامس کرتی ہوں کہ کل تمہاری مما سے ضرور ملوں گی۔''

''کل میں کالج سے واپسی پر ہی تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں گی۔'' مہک نے رضوان کی خفگی دور کرنے کے لیے اسے بتایا۔ اُس کی یہ بات سن کر رضوان کے چہرے پر خوشی کے رنگ جھلکنے لگے۔

☆......☆......☆

مہک کا تعلق ایک ہائی کلاس فیملی سے تھا۔ اس کے پاپا لاہور شہر کے مشہور بزنس مین تھے۔ مہک کی پیدائش نیویارک میں ہوئی کیونکہ ان دنوں اُس کے پاپا اور مما نیویارک میں سیٹل تھے۔ لیکن مہک کی پیدائش کے بعد آفاق احمد اپنی

وائف ثانیہ اور بیٹی مہک کو لے کر واپس اپنے آبائی شہر لاہور آ گئے۔ کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو مکمل مشرقی ماحول دینا چاہتے تھے۔

مہک کامرس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ مہک اور رضوان کی دوستی ابھی حال ہی میں ہوئی تھی۔ رضوان نے کچھ عرصہ قبل ہی اس کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ رضوان ایک ذہین اسٹوڈنٹ تھا یہی وجہ تھی کہ کچھ عرصہ میں ہی تمام اساتذہ اور اسٹوڈنٹ اسے بہت پسند کرنے لگے تھے۔ رضوان اور مہک کی دوستی بہت جلد ہی محبت میں تبدیل ہو گئی تھی دونوں ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے تھے۔ رضوان کے والدین امریکہ میں مقیم تھے اور رضوان یہاں اپنے دادا دادی کے ساتھ لاہور میں رہتا تھا۔

رضوان کی مما ایک وکیل تھیں اور ایک کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ انہیں جلد ہی واپس امریکہ جانا تھا اور یہی وجہ تھی کہ رضوان مہک کو اپنی مما سے ملوانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

مہک آج کالج پہنچی تو اُس کی نظر لان میں

بیٹھے رضوان پر پڑی جو اپنے فرینڈز کے درمیان بیٹھا کسی سبجیکٹ کے امپورٹنٹ ٹاپک کو ڈسکس کر رہا تھا۔

مہک کو دیکھ کر رضوان کے چہرے پر خوشی کی لہر نظر آنے لگی۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر مہک کے ساتھ کلاس روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''مہک تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا کہ تمہیں آج مما سے ملنے میرے ساتھ گھر جانا ہے۔''

''آف کورس مجھے یاد ہے کالج سے فارغ تو ہو جانے دو اور آج تو ویسے بھی فرائی ڈے ہے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔'' مہک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی سے پیار کرتے ہیں تو اس کے اظہار میں بھی دیر نہیں کرنی چاہیے ورنہ وہ پیار حالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ رضوان نے بھی ایسا ہی کیا تھا اسے جب سے یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ مہک سے پیار کرنے لگا ہے اس کے خواب دیکھنے لگا ہے تو اس نے اپنے جذبات کو مہک تک پہنچانے میں دیر نہ کی۔

دوسری طرف مہک بھی شاید یہی سب محسوس کر رہی تھی اسی لیے یہ پیار تیزی سے پروان چڑھنے لگا۔

آج رضوان خوش ہونے کے ساتھ حیران بھی تھا کہ وہ بہت جلد اپنی محبت کو پالے گا۔

☆......☆......☆

کالج سے چھٹی کے بعد مہک گیٹ سے باہر نکلی تو اُس کی نظر کار میں بیٹھے رضوان پر پڑی جو اُس کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مہک کو آتے دیکھ کر اُس نے کار کا دروازہ کھولا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مہک نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنے پہلو میں بیٹھے رضوان کو دیکھا جو بلیو جینز اور بلیک شرٹ میں کافی ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے جھلکتی خوشی واضح دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ ہی دیر کی ڈرائیونگ کے بعد ایک عالیشان گھر کے سامنے رضوان نے کار روک دی۔ یہ ایک خوبصورت گھر تھا اس کا وسیع و عریض لان اُس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ رضوان کے ساتھ چلتے ہوئے مہک نے اس خوبصورت گھر کا جائزہ لیا۔

''یہ ہے بندہ ناچیز کا غریب خانہ رضوان نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ گھر پر کوئی بھی نہیں ہے کیا مہک نے چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد پوچھا۔

کیونکہ گھر میں ہر طرف سناٹا تھا۔

''آئی تھنک مما اپنے روم میں ہوں گی اور دادی بھی شاید آرام کر رہی ہوں۔ آج کل اُن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ تم بیٹھو میں ابھی مما کو بلاتا ہوں۔''

''مما دیکھیے کون آیا ہے؟'' رضوان نے لاؤنج سے ہی آواز دی۔ اگلے ہی پل ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ بوڑھا شخص تیزی سے چلتا ہوا آیا۔

''ارے چھوٹے صاحب جی آپ آگئے آپ بیٹھیے میں آپ اور بٹیا کے لیے کچھ ٹھنڈا لے کر آتا ہوں۔'' بوڑھے شخص نے مہک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے...... یوسف چاچا آپ ٹھنڈا تو لے آئیں لیکن مما کو بھی اُن کے روم سے بھیج دیں۔''

''ہم تو آپ کو بتانا ہی بھول گئے...... کہ بیگم صاحبہ چرچ گئی ہیں اور بڑے صاحب اور مالکن جی بھی ساتھ ہی گئے ہیں۔'' یوسف چاچا نے بڑے صاحب اور مالکن کا لفظ شاید رضوان کے دادا دادی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس بوڑھے

امید کا دیا

سال رواں کے آخری سورج کی کرنیں آنکھوں میں آنسو اور دل میں تڑپ لیے الوداع ہو رہی ہیں۔ وہ دعا کرتی ہیں کہ اے خدا اس ملک کو بربادی سے بچانا، اس دھرتی کو ویرانی سے محفوظ رکھنا۔ اس سال بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں سیکڑوں معصوموں اور بے گناہ افراد نے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی۔ کیا گزرتی ہے ان والدین کے دلوں پر جب ان کے سامنے ان کے معصوموں کے جنازے آتے ہیں اور وہ جیتے جی مر جاتے ہیں۔ وہ کیسے جیتے ہوں گے، جن کے گھروں کے چراغ بجھ گئے اور دیکھتے دیکھتے آشیانے جل کر خاک میں مل گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر رات کے بعد صبح کا اجالا ہوتا ہے۔ ہر مایوسی کے بعد امید کا دیا جلتا ہے، ہر زخم بھر جاتا ہے، جب وقت مرہم بنتا ہے، اس لیے اے ہم وطنو! ہمت نہ ہارنا اور قدم سے قدم ملا کر چلنا کیوں کہ نئے سال کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ خدا کرے کہ نیا سال ہم سب کے لیے مسرت و خوشیوں سے بھرا پیغام لے کر آئے۔ ہر دن اور ہر پل دل میں نئی امنگیں اور امیدیں پیدا ہوں۔ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ نوجوان ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں، اس لیے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر ایمانداری اور محنت سے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔

حسنِ خیال: رازِ عدن۔ بحرین

ملازم کی بات سن کر مہک کو شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔

''تمہارے گھر والے چرچ کیوں گئے ہیں۔'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے رضوان سے پوچھا۔

''چرچ کس لیے جاتے ہیں کیا تم یہ بھی نہیں جانتی۔'' رضوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ رضوان کی بات سننے کے بعد مہک کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ زبان گنگ ہوگئی گویا اُسے ایک ہزار والٹ کا کرنٹ لگا ہو۔

اس نے بہت مشکل سے اپنے احساسات پر قابو پاتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔

''رضوان...... یو آر اے کرسچن؟''

''ہاں مہک کیا تم نہیں جانتی کہ میں کرسچن ہوں۔'' رضوان نے مہک کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تم نے بتایا ہی کب تھا۔'' مہک نے افسردگی سے کہا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم یہ بات جانتی ہو کیونکہ میرے سبھی فرینڈز یہ بات جانتے ہیں۔ اور اسی لیے میں نے اس ٹاپک پر بات کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اب تو تم یہ بات جان گئی ہو کیا اس حقیقت کو جاننے کے بعد ہمارے پیار پر ہمارے رشتے پر کوئی فرق پڑتا ہے۔''

''ہاں پڑتا ہے فرق...... بھلے ہی ہمارے پیار پر اس حقیقت سے فرق نہ پڑتا ہو لیکن جو رشتہ ہم مستقبل میں جوڑنا چاہتے تھے اس رشتے پر فرق پڑتا ہے۔''

''نہیں مہک ایسا کیسے ہو سکتا ہے تم بھی وہی ہو میں بھی وہی ہوں۔ ایسا کیا ہو گیا ہے میں بدل گیا ہوں یا تم...... کچھ بھی تو نہیں بدلا۔'' رضوان نے پریشان ہو کر مہک کی جانب دیکھا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو رضوان لیکن حقیقت تو یہ

ہے کہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ہم دونوں کے راستے الگ ہیں ہماری منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی اگر ایسا ہوا تو یہ بہت غلط ہوگا۔'' مہک گلوگیر آواز میں بولی اس کے لیے اپنے جذبات کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

''مہک تمہیں دنیا کا ڈر ہے کہ یہ لوگ یہ دنیا والے کیا کہیں گے۔ تمہیں دنیا کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کسی کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ لوگوں کے ذاتی معاملات کی چھان بین کرے۔ اور ویسے بھی مجھے تمہارے مسلم ہونے سے کوئی پرابلم نہیں۔ ہم اپنے اپنے مذہب میں رہتے ہوئے شادی کریں گے۔'' رضوان نے صاف گو لہجے میں کہا۔

''رضوان مجھے تم پسند ہو میں تم سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی مگر یہ سب اتنا آسان نہیں چلو مان لیا کہ تمہارے اور میرے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا مگر یہ تو بتاؤ ہمارے بچے کس مذہب پر پروان چڑھیں گے تمہارے یا میرے، میں کوئی بھی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہتی جس کے نتائج بعد میں ہمیں پچھتاوے میں مبتلا کر دیں۔'' وہ رسانیت سے بولی۔

''مہک کیا تم میرے بغیر رہ پاؤ گی؟ کیا صرف مذہب الگ ہونے کی وجہ سے ہم الگ ہو جائیں گے؟ بتاؤ مہک کیا ہمارا تعلق اتنا کمزور تھا۔'' وہ بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔

''رضوان خود کو سنبھالو پیار خود غرض نہیں ہوتا ہے سچے پیار کرنے والے بھی ایک دوسرے کو آزمائش میں نہیں ڈالتے میں نہیں چاہتی کہ تمہارا اور میرا تعلق زندگی کے کسی بھی موڑ پر پشیمانی کا باعث ہو مگر اسی محبت اور خلوص کے ساتھ الگ ہو جائیں۔ یہی بہتر ہے ضروری تو نہیں ہر وہ شے آپ کو حاصل ہو جس سے آپ کو محبت ہو بعض اوقات بچھڑ جانا ہی محبت کی معراج ہوتی ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے اور رضوان کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا وہ مہک کو قائل کرنا چاہتا تھا مگر پھر اُس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر چپ ہو گیا۔ مہک بھی خاموشی سے اُٹھ کر کار پورچ میں چلی آئی۔ رضوان نے اُس کو اس کے گھر اُتارا اور ایک حسرت بھری نگاہ ڈال کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆......☆......☆

دور تک چھائے تھے بادل اور کہیں سایہ نہ تھا
اس طرح برسات کا موسم کبھی آیا نہ تھا
سرخ آہن پر ٹپکتی بوند ہے اب ہر خوشی
زندگی نے یوں تو پہلے ہم کو ترسایا نہ تھا

آج دوپہر سے ہی کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ بادلوں نے چاروں طرف سے آسمان کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ساتھ میں ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ اچانک بادل زور سے گرجے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

ٹن ......ٹن ......ڈور بیل مسلسل بج رہی تھی۔ لیکن گھر میں کوئی بھی موجود نہیں تھا ایسے میں نماز مغرب کے بعد دعا میں محو مہک کو ہی دعا کا اختتام کرتے ہوئے اٹھنا پڑا۔

''کون ہے ......؟'' دروازہ کھولتے ہوئے مہک نے بیزاری سے پوچھا۔

لیکن دروازے پر کوئی بھی نہ تھا۔ اگلے ہی پل مہک کی نظر دروازے میں پڑے لفافے پر پڑی مہک نے اس لفافے کو اٹھایا اور دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس نے لفافہ چاک کیا۔ تو اس میں ایک کاغذ تھا جس پر لکھا تھا۔

''ڈیئر مہک! میں جانتا ہوں کہ انجانے میں ہی

سہی لیکن میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس روز کی ملاقات کے بعد تم نے کالج بھی آنا چھوڑ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔ کیونکہ تم میرا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ اور ایسا تم اس لیے نہیں کر رہی کہ تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔ بلکہ ایسا اس لیے ہے کہ تمہیں ڈر ہے کہ کہیں تم اپنے پیار کے آگے کمزور نہ پڑ جاؤ میں تمہاری مشکل کو سمجھ سکتا ہوں۔ تمہاری زندگی میں یہ مشکلیں میری وجہ سے آئی ہیں اور اسی لیے میں آج تمہاری مشکلوں کو کم کرنے کے لیے ہمیشہ کے لیے اپنے پیرنٹس کے پاس امریکہ جا رہا ہوں۔ لیکن میں جانے سے پہلے تمہیں تھینکس ضرور بولنا چاہوں گا۔ میری زندگی میں آنے کے لیے کیونکہ اگر تم میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید مجھے کبھی پیار کا احساس نہ ہوتا ہاں یہ سچ ہے کہ تم نے مجھے پیار کرنا سکھایا لیکن اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ تم نے مجھے پیار کا مطلب سکھایا۔ میرے لیے پیار صرف محبوب کی قربت کا نام تھا۔ لیکن تم نے مجھے یہ احساس دلایا کہ ہجر کے لمحے بھی بڑے حسین ہوتے ہیں یہ لمحے ہماری آنکھوں سے محبوب کا چہرہ کبھی اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ہماری سوچوں پر کسی اور کی دستک نہیں ہونے دیتے مہک اب میرے لیے یہ ہجر کے لمحے عذاب نہیں۔ کیونکہ وہ پیار ہی کیا جو عذاب لگنے لگے۔ پیار کے تو ہر روپ ہر موڑ کا الگ ہی مزہ ہے۔ میں تم سے یہ تو نہیں کہوں گا کہ تم مجھے بھول جاؤ کیونکہ ایسا کرنا ہم دونوں کے لیے ہی ناممکن ہے۔ ہاں میری تم سے ایک ریکویسٹ ہے کہ تم ہمارے پیار کو ایک خوبصورت موڑ دے کر اپنی زندگی کو اور اس کی خوشیوں کو جینے کی کوشش ضرور کرنا۔''

''میں جانتا ہوں جو لمحے ہم نے ایک ساتھ بتائے ہیں وہ حسین لمحے ہماری آخری سانسوں تک ہماری سوچ کے دریچوں میں قید رہیں گے۔ ہماری محبت ہمیشہ زندہ رہے گی ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے ہی دور دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ ہوں ہمارے دل ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے دھڑکیں گے۔''

کاغذ کے دوسری جانب ایک نظم تحریر تھی۔

شام کے اجالوں میں
اپنے نرم ہاتھوں سے
کوئی بات اچھی سی
کوئی خواب سچا سا
کوئی بولتی خوشبو
کوئی سوچتا لمحہ
جب بھی لکھنا چاہو گے
سوچ کے دریچوں سے
یاد کے حوالوں سے
میرا نام چھپ چھپ کر
تم کو یاد آئے گا
ہاتھ کانپ جائیں گے
شام ٹھہر جائے گی

ایک بار پھر بادل زور سے گرجے اور آسمان سے بارش اور تیزی سے برسنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے قدرت کا ہر منظر ان پیار کرنے والوں کی جدائی پر آنسو بہا رہا ہو۔ ہوائیں سسکنے لگیں ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ جیسے سارے لمحے ٹھہر گئے ہوں۔ مہک نے بے اختیاری کے عالم میں خط کو چوما اور اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور اپنے محبوب کے لکھے لفظوں میں جذب ہو رہے تھے۔ مہک کے لبوں نے جنبش کی۔

''آئی لو یو رضوان میں تمہیں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔''

☆☆......☆☆

مکمل ناول

سنبل

آنگن کی چڑیاں

آخری حصہ

''تم نے اس دن کہا کہ تم پر ظلم ہوا تھا۔ تو مجھ سے شادی تم پر ظلم ہے تم میرے ساتھ ناخوش ہو۔'' ایبک کریم نے اپنا تکیہ سیٹ کرتی ہوئی ورشیے سے کہا۔ ''میرے ساتھ ظلم ایبک صاحب یہ ہوا تھا کہ مجھ پر بھی الزام لگا تھا۔ میں نے بھی بڑے مان سے اپنے......

''اور شوبز کے حوالے سے بھی مجھے صرف انہی دونوں کا ساتھ کافی ہے۔''

وہ سفاکی سے بولا۔ اور احسن صاحب کو چپ لگ گئی اور یوں ارمغان بھی شادی شدوں کی فہرست میں شامل ہوگیا مگر وہ گھر داماد بنا تھا اس نے بڑی سفاکی کے ساتھ باپ سے کہا تھا۔

''ٹینا! اکلوتی اور لاڈلی ہے اور آپ کو ہے ہر بات پر اعتراض کرنے کی عادت......

بھابی کی زندگی بھی آپ نے عذاب کر رکھی ہے وہ تو بھلی عورت ہیں جو سب کچھ سہہ رہی ہیں مگر ٹینا ایک دن بھی یہ سب برداشت نہیں کرسکتی۔ لہٰذا ہمارا الگ رہنا ہی بہتر ہے۔''

''الگ ہی رہنا ہے تو اپنے زورِ بازو سے اسے گھر بنا کر دو۔

تمہیں پتہ ہے سسر کے گھر جوائی کتا۔'' احسن صاحب طنز سے بولے۔

''اپنے زورِ بازو سے کیوں اپنا حصہ لے لیتا ہوں ناں آپ سے، مگر چھوڑیں۔

ٹینا کو جیسی پر تعیش زندگی کی عادت ہے وہ اس ذرا سے حصے سے کہاں ممکن ہے اور رہ گیا کتا بننا تو اس گھر کے کتوں کے ٹھاٹ دیکھ لیں تو کتا بننے میں بھی فخر محسوس ہو۔''

وہ استہزائیہ ہنسا اور احسن صاحب کی برداشت کی حد بس یہیں تک تھی۔

''ناہنجار! ناخلف دفع ہو جا یہاں سے آئندہ شکل مت دکھانا مجھے اپنی۔''

وہ غصے سے چیخے تو انہیں پھندہ لگ گیا اور علیشے پانی کا گلاس لے کر آ گئی جسے انہوں نے ہاتھ مار کر گرا دیا۔

''جا رہا ہوں مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے اس کا بک میں رہنے کا۔''

وہ ہنستا ہوا بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا باہر نکل گیا۔

احسن صاحب نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

☆......☆......☆

کچھ دن گزرے اس کی سوچ پر مٹی پڑی گرد

جم گئی اور کدورت دھلی تو نہیں اس پر گرد کی دبیز تہہ آ گئی اور اسامہ اس سے پھر بات کرنے لگا مگر اب کی بار پرشیے کے انداز میں وہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن نہ آ سکا جو کہ پہلے ان دونوں کے درمیان رہ چکا تھا۔ اب وہ تکلفاً بات کرتی تھی اور وہ بھی جب اسامہ اس سے بات کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ اس کے کمرے میں آیا تو وہ بک سامنے رکھے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کوئی مشکل کوئی مسئلہ تو پیش نہیں آ رہا؟'' اسامہ نے پوچھا۔

''میری مدد کی ضرورت ہے؟''

''نہیں کوئی نہیں۔'' اس نے کتاب سے سر اٹھائے بغیر سنجیدگی سے کہا۔

''یہ بہر حال تمہارے ٹیکٹکس نہیں ہیں۔'' اس نے بات برائے بات کہا۔

''جی ہاں...... مگر ہو ہی جاتا ہے۔ میری ایک نیٹ فرینڈ ہے اس کے بھی ٹیکٹکس یہی ہیں وہ میری مدد کر دیتی ہے۔'' اس نے کتاب بند کر دی مگر یوں ہی سر جھکائے جواب دیا۔

''یوں بھی خدا ایک در بند کرتا ہے تو ستر کھول دیتا ہے۔'' وہ بولی۔ تو اسامہ کو شرمندگی نے آ گھیرا کتنا روڈلی اس نے کہا تھا کہ سمجھ نہیں آتا تو پڑھنا چھوڑ دو مگر میں اب تمہارے ساتھ مزید دماغ ماری نہیں کر سکتا۔

''پھر بھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو؟'' اسامہ نے شرمندگی کے احساس کے ساتھ کہا۔

''تھینکس! آپ نے میری تعلیم کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی آپ کا یہی احسان بہت ہے۔'' وہ بہت سنجیدہ تھی۔

''آئی ایم سوری! پرشیے میں اس دن کچھ زیادہ ہی روڈ ہو گیا تھا۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

''بالکل ٹھیک کیا تھا سامنے والے کو اس کی اوقات کے مطابق ٹریٹ کریں۔ ورنہ وہ خوش فہم ہو جاتا ہے۔ میں بھی خاصی خوش فہم ہو گئی تھی۔'' وہ آزردگی سے بولی تو اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''نہیں میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' اسامہ نے کہنا چاہا۔

''آپ کا جو مطلب تھا وہ مجھ پر واضح ہے آپ کے عزت مآب سر دیوتا کے درجے پر فائز ہیں جبکہ اُن کی تینوں بیٹیاں بدکردار ہیں۔ جن میں سے ایک آپ پر تھوپی گئی ہے اور اگر بھی بھی آپ کو اس کے کردار پر لگے داغ نظر آ گئے تو آپ اس کو فارغ کرنے میں منٹ بھی نہیں لگائیں گے۔ کیونکہ داغ دار چیزیں آپ بانٹ دیا کرتے ہیں اور اسی لیے آپ نے انسانوں کو بھی اس کیٹگری میں شامل کر رکھا ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولتی چلی گئی۔

''پرشیے! غصے میں انسان پتہ نہیں کیا کچھ کہہ دیتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''غصے میں ہی انسان کی پرکھ ہوتی ہے مسٹر اسامہ شیرازی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''سوری کر تو رہا ہوں۔'' وہ تپ گیا۔

''نہ کریں، مجھے اب کسی معافی تلافی کی ضرورت نہیں ہے اب میں صرف صبر سے اپنی قسمت میں لکھے کا انتظار کروں گی اور پلیز اب مجھے پڑھنے دیں۔'' کہہ کر اس نے کتاب کھول لی اور اس کے چہرے پر بڑا بڑا لکھا تھا۔

''You May Go Now''۔

☆......☆......☆

''اب کہو کیا کرنا ہے لاسٹ سمسٹر آنے والا ہے۔'' روحیل نے مانو کو دیکھا۔

''وہ دونوں تو ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں

ہلے۔'' وہ سخت چڑا ہوا تھا۔

''ہوں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔

''میرا خیال ہے آخری حربہ اختیار کرنا پڑے گا۔'' وہ بولی۔

''اور وہ آخری حربہ کیا ہے۔'' روحیل نے پوچھا۔

''آج گھر آجاؤ تو ڈسکس کرتے ہیں اور اس پر کام بھی کرنا ہوگا۔'' مانو نے کہا۔

''او کے ٹھیک ہے۔'' وہ دبے دبے جوش سے بولا۔

''اور ہمیں اگلے ہی ہفتے دھماکا کرنا ہے ایٹمی دھماکہ جو سب کو ہلا کر رکھ دے گا۔'' وہ استہزائیہ ہنسی۔

''واقعی کوئی ایسا پلان ہے جو ایٹمی دھماکہ ثابت ہوگا۔'' روحیل نے اشتیاق سے پوچھا۔

''تم دیکھتے جاؤ کہ کیا ہیروشیما اور ناگاساکی برباد ہوئے تھے جو یہ دونوں ہوں گے۔'' وہ طنزیہ بولی۔

''بس گھر آنا مت بھولنا اور جیسا میں کہتی جارہی ہوں کرتے جانا۔'' مانو نے کہا تو روحیل نے سر ہلایا۔

☆......☆......☆

''اسامہ پٹ! ہمیں بات کرنی ہے بابا تجھ سے۔'' بابا صاحب نے اسامہ سے کہا۔

''جی بابا صاحب! حکم کریں۔'' وہ ادب سے اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بات یہ ہے کہ دو سال بہت ہوتے ہیں انتظار کے لیے، اب اس حویلی کو تمہاری اولاد کی ضرورت ہے۔'' بابا صاحب نے بلاتمہید کہا۔

''اور اب ہم مزید انتظار نہیں کریں گے۔'' بابا صاحب نے مزید کہا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' اسامہ نے اُلجھے انداز میں بابا صاحب کو دیکھا۔

''میں نے کوئی فارسی میں تو بات کی نہیں ہے انتظار نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب ہم تمہاری دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ چڑ کر بولے۔

''مگر میں نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ دوٹوک بولا۔

''ہم نے تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی ہے تمہیں اپنا فیصلہ سنایا ہے۔'' بابا صاحب نے قطعیت سے کہا۔

''مگر مجھے آپ کا فیصلہ نامنظور ہے میں کوئی آپ کا اکلوتا بیٹا تو ہوں نہیں کہ میرے گھر اولاد نہ ہونے سے آپ کی نسل ختم ہوجائے گی۔'' وہ چڑ گیا۔

''درخت پھلدار اچھا لگتا ہے۔'' وہ غصے سے بولے۔

''اور آپ کو دو سال میں پتہ چل گیا کہ یہ درخت ثمر ور نہیں ہے لوگ تو ساری زندگی انتظار کر لیتے ہیں۔'' وہ بھی چڑ کر بولا۔

''بابا! ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو لمبے انتظار کریں۔ میڈیکل سائنس بھی کہتی ہے کہ دو سال اگر کنسیو نہ کر سکے تو پھر Sterility ہوتی ہے۔'' بابا صاحب بھی اتنے بے خبر نہیں تھے۔

''مگر میڈیکل سائنس یہ کب کہتی ہے کہ Sterility (بانجھ پن) ہوتی ہے تو صرف عورت میں ہوتی ہے مرد میں بھی تو ہوسکتی ہے۔'' وہ بھی انہی کا بیٹا تھا۔

''اسامہ! آج تو یہ بات کی ہے آئندہ کبھی مت کرنا۔'' وہ غصے سے دہاڑے۔

''مرد کبھی بانجھ نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے نہیں کروں گا اس وقت تک جب

تک آپ دوسری شادی کی بات نہیں کریں گے ورنہ اگر ٹیسٹ ہوئے تو دونوں کے ہوں گے۔''
وہ سکون سے بولا۔
''بابا! جادوگرنی ہے جادو کر دیا ہے اس نے تجھ پر۔'' وہ چڑے اور اسامہ نے بابا صاحب کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ اور اس کے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ بکھر گئی۔
''واقعی جادوگرنی تو ہے۔''

☆......☆......☆

''اصفہان تم دونوں کے طور اطوار اگر درست نہیں ہو رہے تو تم دونوں یہ گھر چھوڑ دو۔'' ہفتے والے دن صبح وہ دونوں شوٹ پر نکل رہے تھے تب احسن صاحب نے اخبار پڑھتے ہوئے سکون سے کہا۔
''ضرور چھوڑ دیں گے فادر اِن لاء۔'' ماریہ چبا چبا کر بولی۔
''مگر ہم ارمغان کی طرح بے وقوف نہیں ہیں آپ ہمیں ہمارا حصہ دے دیں ہم چلے جائیں گے۔'' وہ سابقہ لہجے میں بولی۔
''ہنہ! یہ تو بھول جاؤ'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔
''اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو ہمیں انگلیاں ٹیڑھی کرنی آتی ہیں۔ فادر اِن لاء۔'' وہ بھی ٹھنڈے لہجے میں بولی۔
''مطلب؟'' وہ بولے۔
''مطلب قانونی راستے کھلے ہیں ناں! میرے کئی جاننے والے لائر ہیں کوئی مسئلہ نہیں ہم آپ سے کورٹ میں بات کریں گے۔'' ماریہ نے بدلحاظی کی انتہا کر دی۔
''بصد شوق۔'' احسن صاحب نے بھی بالکل ماریہ کے انداز میں چبا کر کہا۔

''یہ میری جدی پشتی جائیداد نہیں ہے یہ میری محنت سے جمع کی ہوئی کمائی ہے اور میری مرضی ہے میں جسے دوں جسے نہ دوں اور پرسوں کے اخبار میں، میں تم دونوں بیٹوں کو عاق کرنے کا ایڈ دے رہا ہوں۔'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔
''ہاں بیٹیاں تو بغیر ایڈ دیے عاق شدہ ہیں دونوں بیٹوں کو بھی عاق کر دیں۔ اس جائیداد کو لے کر قبر میں جائیں گے کیا؟'' اصفہان نے بھی بدتمیزی سے کہا۔
''نہیں تینوں بیٹیوں اور بیوی کا حصہ نکال کر باقی سب خیرات کر دوں گا۔'' وہ سرد لہجے میں بولے اور ان کی اس بات پر چائے نکالتی علیشے اور پراٹھا پکاتی عائشہ دونوں حیرت سے احسن صاحب کو دیکھنے لگیں۔ علیشے کی چائے کپ کے بجائے ساسر میں گرنے لگی اور عائشہ کا پراٹھا جلنے لگا تو وہ دونوں چونکیں۔
''اپنا حصہ تو میں کسی طرح نہیں چھوڑوں گا۔'' اصفہان نے چڑ کر کہا۔
''کیا کرو گے کرائے کے قاتلوں سے کام تمام کرواؤ گے۔ بے فکر رہو، آج ہی تم سب کے خلاف پولیس میں پرچہ کٹواؤں گا کہ اگر مجھے میری بیوی یا میری بیٹی کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کے ذمے دار تم لوگ ہو گے۔'' وہ زور سے چیخے تو ہانپنے لگے۔ علیشے نے لا کر گرم گرم چائے اُن کے سامنے رکھی اور اُن کی کمر سہلانے لگی وہ کچھ عرصے سے دمے کے مریض ہو گئے تھے۔
''ہاں اور کر لو لیپا پوتی ایسے ہی تو محبت نہیں جاگی بڑے میاں کی۔'' ماریہ کچھ زیادہ ہی جل گئی تھی۔
''لیپا پوتی تو تم دونوں کرتے تھے دونوں بیٹے یہ تو خدمت کرتی رہیں محبت کرتی رہیں یہ تو چڑیاں

تھیں میرے آنگن کی اللہ میاں کی گائیں، میری ہر بدتمیزی ہر ظلم ہر زیادتی کو سہتی رہیں اور سہتی چلی گئیں میں ہی اندھا نادان ناسمجھ تھا جو اُن پر تم دونوں ناخلفوں کو فوقیت دیتا رہا مگر اب اور نہیں۔'' وہ آزردگی سے بولتے چلے گئے۔

''تو سوچ ہے کھا کر بلی حج کو چلی...... ہم خود کو بڑا اداکار سمجھتے ہیں مگر یہاں تمہارے گھر میں تو ہم سے بھی بڑے پڑے ہیں۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''مگر میں دیکھ لوں گی سب کو۔'' وہ غصے سے بولی۔

''دیکھ بعد میں لینا پہلے یہاں سے رختِ سفر باندھو، ورنہ کل یہ کام پولیس کرے گی اور اگر ایسا ہوا تو ایسی نامور اداکارہ کی نیوز پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر آجائے گی کتنی بدنامی ہوگی تمہاری ہے ناں!'' احسن صاحب تمسخر سے بولے اور ماریہ 'ہنہ' کرتی باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

''ہاں کیا پلان ہے تمہارا؟'' روحیل مانو کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''وہ تصویریں دکھاؤ جو میں نے ہارڈ کاپی بنوانے کو کہی تھیں۔'' مانو نے کہا تو روحیل ایک البم اٹھا لایا اور مانو تصویریں دیکھنے لگی اس میں کئی تصویریں یونیورسٹی میں مختلف تقریبات کے موقع پر کھینچی گئی تھیں فنسی ڈریس کی برائیڈل ڈریس میں تصاویر تھیں اس کے علاوہ کئی فیس بک پر اَپ لوڈ شدہ تصاویر شیئر کی گئی تھیں وہ تھیں۔

''زبردست......'' مانو نے کہا۔

''اب تم بہترین تھری پیس سوٹ میں یہ تصاویر دیکھ کر اس طرح سے تصاویر کھنچواؤ کہ ان تصاویر کو ان تصاویر سے جوڑا جائے تو کوئی یقین نہ کر سکے کہ یہ تصاویر الگ الگ لی ہیں۔''

اس نے برائیڈل ڈریس کی تصاویر الگ کیں۔

''وہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے میرا ایک دوست ہے فوٹوگرافر وہ یہ کام کر دے گا۔'' وہ بولا۔

''ہاں یہ ٹی پنک کلر کو ڈیپ ریڈ کروا دینا اور کچھ تصاویر جینز وغیرہ میں لے کر باقی تصاویر کے ساتھ لگوا دینا۔ اور بیک گراؤنڈ تو سب کا تبدیل ہوگا۔'' وہ رائے دینے لگی۔

''یہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ آئیڈیا تھا تمہارے پاس جو تم اب تک نہیں بتا رہی تھیں خاصا فلاپ آئیڈیا ہے۔ لیبارٹری ٹیسٹ پہلے ہی جھٹکے میں اِن تصاویر کی حقیقت کھول کر رکھ دے گا۔'' وہ خاصا بور ہوا تھا۔

''ابھی پورا آئیڈیا میں نے ڈسکس نہیں کیا ہے یہ آدھا حصہ ہے۔'' مانو نے کہا اور وہ باقی آدھا حصہ ڈسکس کرنے لگی جس کے ساتھ ساتھ روحیل کے چہرے کی چمک بڑھنے لگی۔

☆......☆......☆

اس کا گریجویشن کمپلیٹ ہو چکا تھا۔ اور آج کل وہ فارغ تھی۔ اس وقت بھی وہ 'خاک اور خون' پڑھ رہی تھی تو اسامہ اندر آیا اور اس نے کتاب پر نشان لگا کر اسے دیکھا۔

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' اس نے آتے ہی بلاتمہید کہا۔

''جی......'' اس نے بک مارک لگا کر کتاب رکھ دی۔ اور اسے دیکھا اسامہ اس کے سامنے بیڈ پر ٹک گیا۔

''بابا صاحب! میری دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے پرشیے کو بغور دیکھا جس نے اس کی بات سن کر اپنے نچلے لب کو بڑی بے دردی سے دانتوں تلے دبا لیا تھا۔

''اُن کا خیال ہے کہ دو سال بہت ہوتے

ہیں اولاد کے انتظار کے لیے۔'' اس کی نظریں بغور پر یشے پر ہی جمی ہوئی تھیں اس کا ہر عمل اس کی نظروں کے سامنے تھا اب اس کی اس بات پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا پتہ نہیں شرم سے یا غصے سے۔

''بات معقول ہے اولاد کے لیے دوسری شادی کی جا سکتی ہے۔'' پتہ نہیں کیوں اس کا دل اسے چھیڑنے کو چاہا اور پر یشے نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

''آپ مسلمان مرد ہیں آپ بغیر کسی ٹھوس وجہ کے بھی دوسری، تیسری بلکہ چوتھی شادی بھی کر سکتے ہیں آپ نے ناحق دو سال انتظار کیا اگر آپ کو وجہ ہی کا انتظار تھا تو یہ وجہ بڑی ٹھوس تھی کہ آپ کا دل اپنی بیوی سے نہیں ملتا ہے۔'' وہ سر اُٹھا کر بڑے ٹھوس اور غیر متزلزل لہجے میں بولی۔

''ہاں واقعی یہ وجہ بھی خاصی ٹھوس تھی۔'' وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا کر سنجیدگی سے بولا۔

''مگر میں نے بابا صاحب کو انکار کر دیا ہے۔'' وہ ڈرامائی انداز میں بولا اور پر یشے نے اسے دیکھا اس نے پوچھا تو کچھ نہیں مگر اس کے چہرے پر بڑا بڑا 'کیوں' لکھا ہوا تھا۔

''کیونکہ تمہارے کردار کا کوئی گناہ ابھی تک میرے سامنے نہیں آیا۔ سزا گناہ گار کو ملتی ہے بے گناہ کو نہیں۔'' وہ کہتے ہوئے پلٹ کر باہر چلا گیا اور پر یشے نے کرسی کی پشت سے ٹک کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

''لیزے! میں نے تمہیں حمیران سے بات کرنے کو منع کیا تھا ناں!'' روحیل نے حمیران سے بات کرتی شیلزے کے پاس آ کر کہا۔ ساتھ ہی مانو بھی تھی۔

''ایکسکیوزمی مسٹر! آپ ہوتے کون ہیں مجھے منع کرنے والے۔'' شیلزے کا تو دماغ ہی بھک سے اڑ گیا۔

''لیزے! یہ تم پوچھ رہی ہو میں کون ہوتا ہوں یہ میں ہوں تمہارا شوہر۔'' وہ ڈرامائی انداز میں سر پر ہاتھ مار کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا یا صبح ہی صبح پی کر نکلے ہو۔'' وہ غصے سے بولی۔

''خیر شیلزے! اس نکاح کی گواہ تو میں بھی ہوں۔ تم نے چھپانے کو کہا ہم نے چھپا لیا مگر اب تم اپنے شوہر کی بات نہیں مانو گی تو اسے غصہ آئے گا ہی۔'' مانو نے کہا تو شیلزے نے حیرت اور دکھ کی زیادتی سے اسے دیکھا۔

''مانو تم بھی۔'' وہ دکھ سے بولی۔

''مانو ہی نہیں یہ سب بھی......'' اس نے ایک البم نکال کر اس کے دوستوں کے گروپ کی جانب بڑھائی جو انہوں نے کھول کر دیکھنی شروع کی اور اس کے ساتھ بے یقینی سے شیلزے کو بھی دیکھا جو دم بخود یہ تصاویر دیکھ رہی تھی۔ اور اگلے ہی لمحے روحیل کے ہاتھ میں ایک نکاح نامہ تھا۔ جس میں شیلزے کے سائن بڑے واضح جگمگا رہے تھے۔ شیلزے نے آگے بڑھ کر اسے دیکھا اور چکرا گئی۔

''حمیران! یہ سب غلط ہے۔ یہ مجھے پھنسانے کی سازش ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''واہ! تصاویر غلط تمہارے سائن غلط...... الو بنانے کے لیے ایک میں ہی الو کا پٹھا ملا تھا تمہیں۔'' وہ غصے سے نکاح نامہ درمیان میں پھینکتا ہوا وہ پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اور سب نے شیلزے کے سائن دیکھ کر اسے ملامت سے دیکھا۔ اور شیلزے نے لٹے پٹے انداز میں آگے قدم

بڑھائے۔

''رک جاؤ پلیز! حمیرا ان یہ کوئی بڑی سازش ہے میرے خلاف۔'' وہ دکھ سے بولی۔ مگر وہ نہیں رُکا۔

'' اور ہاں لیزے! میں آج رات ہی تمہارے گھر آکر تمہارے بابا سے بات کروں گا کیونکہ اب میں مزید انتظار نہیں کرسکتا۔'' روحیل پیچھے سے بولا تو وہ بھاگتی ہوئی اپنی گاڑی تک آئی اور تیزی سے نکالتی ہوئی چلی گئی۔

☆......☆......☆

عائشہ نے چائے لاکر کتاب پڑھتے ہوئے احسن صاحب کے سامنے لاکر رکھی تو انہوں نے آنکھوں سے چشمہ اُتار کر ٹیبل پر رکھا۔

''علیشے کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''خدا کا شکر ہے کافی بہتر ہے۔'' عائشہ نے جواب دیا۔

'' اس کا بہت خیال رکھنا خدا مجھے معاف کرے میں نے پہلے ہی بیٹوں کے چکر میں بیٹیوں سے بہت زیادتی کی ہے کسی دن چلنا ہم ورشے کے گھر چلیں گے اور اس کے بعد پرشے کے مجھے ان دونوں سے معافی مانگنی ہے۔'' وہ دکھ سے بولے۔

'' معافی نہیں، صاحب بڑے معافی نہیں مانگتے آپ ان کے پاس چلے جائیں اُن کے دلوں سے سب۔ گلے دھل جائیں گے آپ ٹھیک کہتے ہیں ان دونوں کو اپنے گھروں میں کوئی مسئلہ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ دونوں خوش ہیں انہیں صرف آپ کے اعتبار نہ کرنے کا دکھ ہے۔'' عائشہ، احسن صاحب کو دکھی نہ دیکھ سکیں سو انہیں تسلی دینے لگیں۔

''ہاں جاؤں گا میں دونوں کے پاس۔'' وہ بولے

''علیشے کو اچھے سے کالج میں داخلہ بھی دلانا ہے اور اسے وہ اعتماد بھی دینا ہے جس سے اس کی شخصیت عاری ہے۔'' وہ آہستگی سے بولے۔

'' بڑا ظلم کیا ہے میں نے بیٹیوں کے ساتھ۔'' انہوں نے آنکھوں میں آئی نمی پونچھی۔

☆......☆......☆

شام میں ورشے حذیفہ سے باتیں کررہی تھیں مانو اور روحیل آندھی اور طوفان کی طرح اندر چلے آئے۔ اور چیخ چیخ کر شیلزے کو بلانے لگے ورشے کو سخت برا لگا۔

''مانو! یہ کیا طریقہ ہے کسی کے گھر آنے اور اس کو بلانے کا۔'' ورشے نے مانو کو سرزنش کی۔

'' ہمارا تو یہی طریقہ ہے۔'' مانو بدتمیزی سے بولی اسی وقت شیلزے اپنے کمرے سے باہر نکلی اُلجھے بال، ملگجے کپڑے اور روئی روئی آنکھوں کے ساتھ۔ ساتھ ہی اتنی تیز آوازوں پر ایبک کریم بھی نکل کر باہر آگئے۔

'' کیا مسئلہ ہے کیوں اتنا ہنگامہ مچایا ہوا ہے۔'' ایبک کریم غصے سے بولے۔

'' بتاتے ہیں بتاتے ہیں۔ صاحبزادی کو تو آجانے دیں۔'' روحیل نے طنز سے بولتے ہوئے زینہ زینہ اترتی شیلزے کو دیکھا۔ اور شیلزے کے قریب آنے پر اس نے وہ البم اور نکاح نامہ درمیان میں پھینکا۔

'' اس نکاح نامے کی رو سے لیزے میری بیوی ہے اور میں جلد از جلد رخصتی چاہتا ہوں۔'' وہ خاصے تمسخر سے بولا۔

'' شیلزے!'' ایبک حیرت و دکھ سے بولے۔

''ڈیڈ! آپ بھی آپ کو بھی مجھ پر یقین نہیں ہے۔'' وہ اُن سے زیادہ دکھ سے بولی۔

''ان سب چیزوں کی موجودگی میں بھی تم پر یقین کروں۔'' وہ غصے سے بولے اور مانو اور روحیل نے خاصے تمسخر سے اسے دیکھا۔

''ایک صاحب! آپ کو شیلزے پر یقین ہو یا نہ ہو مجھے اس پر مکمل یقین ہے کیونکہ شیلزے میں لاکھ برائیاں ہوں گی مگر وہ بدکردار اور خودسر نہیں ہے اور میں وہ ظلم اپنی بیٹی پر نہیں ہونے دوں گی جو مجھ پر ہوا تھا بداعتمادی کا ظلم، میں اس سازش کا پردہ چاک کروں گی حذیفہ تم دو گے ناں! میرا ساتھ۔'' ورشیے نے حذیفہ کو دیکھا۔

''ضرور آپی! کیونکہ میں اس شخص کو اسکول سے جانتا ہوں اور یہ کتنا کمین ہے مجھے پتہ ہے۔'' حذیفہ کے کہتے ہوئے نکاح نامہ اور البم ہاتھ میں پکڑی۔

''ان تصاویر کا سب سے پہلے لیب ٹیسٹ کرواؤ پھر نکاح نامے کو بھی دیکھیں گے۔'' ورشیے نے کہا تو روحیل نے پریشانی سے مانو کو دیکھا جو کہ خود بھی سن کھڑی تھی۔

''بلکہ شیلزے! ذرا غور سے تصاویر کو دیکھو کیا یہ فینسی ڈریس شو والا برائیڈ ڈریس نہیں ہے، تمہارا کلر کے فرق سے۔'' ورشیے نے کہا تو اس نے فوراً البم تھام لی۔

''ہاں آپی! بلکہ یہ تو پوز بھی وہی ہیں جو میں نے یونیورسٹی میں دیے تھے۔'' اس کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی۔

''پھر تو لیب ٹیسٹ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔'' حذیفہ نے کہا۔

''لیب ٹیسٹ کی ضرورت ہے حذیفہ! ان دونوں کو دھوکہ دہی کے کیس میں اندر کرانے کے لیے۔'' ورشیے سرد لہجے میں بولی۔

''یوں بھی شیلزے کے سائن نقل کرنا مشکل نہیں ہیں اسے عادت ہے جگہ جگہ اپنے سائن کرنے کی۔'' ورشیے نے سرد نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے تمام کیس ہی سلو کر دیا تھا اور دونوں سن کھڑے ہوئے تھے۔ اور ایک کریم متشکر نگاہوں سے ورشیے اور حذیفہ کو دیکھ رہے تھے۔ اور دو دن میں مانو اور روحیل گرفتار ہو گئے اور حذیفہ نے اپنے دوست کی مدد سے یہ خبر اور اُن کی گرفتاری کا فوٹیج الیکٹرانک میڈیا پر چلوا دیا۔ اور اگلے ہی دن مانو نے جعلی سائن کا اعتراف کر لیا۔ شیلزے اس الزام سے باعزت بری ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

''تم نے اس دن کہا کہ تم پر ظلم ہوا تھا۔ تو مجھ سے شادی تم پر ظلم ہے تم میرے ساتھ ناخوش ہو۔'' ایک کریم نے اپنا تکیہ سیٹ کرتی ہوئی ورشیے سے کہا۔

''میرے ساتھ ظلم ایک صاحب یہ ہوا تھا کہ مجھ پر بھی الزام لگا تھا۔ میں نے بھی بڑے مان سے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ مگر انہوں نے میرا مان توڑ دیا تھا اور یہی مان ٹوٹتا ہوا میں نے شیلزے کی آنکھوں میں دیکھا تھا اس لیے میں اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی وہاں جہاں آپ کو کھڑا ہونا تھا۔'' اس نے کہا تو ایک کریم شرمندہ ہو گئے۔

''تو تم میرے ساتھ ناخوش نہیں ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں...... میں نے بڑے گھٹن زدہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔ جہاں ہر آسائش بیٹوں کے لیے اور ناانصافی بیٹیوں کے لیے تھی میں نے یہاں آ کر کھل کر سانس لیا ہے۔ آپ نے مجھے ہر

آسائش، ہر آسانی مہیا کی۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں رکھی شک نہیں کیا اور خوشی کسے کہتے ہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرائی تو وہ بھی مسکرادیے۔

اور انہوں نے سونے کے لیے کروٹ بدل لی۔ مگر ورشے کے زخم ادھڑ گئے۔

''ہاں ایک صاحب مجھ پر ظلم ہوا تھا۔ میرے کم سن اور نوخیز جذبوں کا خون ہوا تھا۔ آپ اپنی پہلی بیوی سے بے پناہ محبت کر کے خالی ہوچکے تھے۔ اور میرے اندر بسی محبت بین کرتی تھی۔ جو میں نے اس سے پہلے کسی سے نہیں کی تھی مگر کسی سے کرنا چاہتی تھی۔ تب میں نے اس محبت کا رخ شیلزے کی طرف موڑ دیا۔ آپ زندگی کے ایسے مقام پر تھے جہاں آپ کے لیے عورت کی حیثیت ثانوی تھی۔ وہ ضرورت تھی محبت نہیں۔ آپ کو ایک آیا ایک ماسی ایک کیئر ٹیکر کی ضرورت تھی بیوی کی نہیں۔ ہاں میرے ساتھ ظلم ہوا تھا بہت ظلم...... اور یہ ظلم مجھے شیلزے پر ہوتے نہیں دیکھنا تھا۔ یہ روح کو کاٹ دینے والا ظلم اور بے روح جسم کیسے ہوتے ہیں سڑے ہوئے بدبودار...... اور مجھے شیلزے کی روح کو مارنا نہیں اسے زندہ رکھنا تھا۔ مجھے ٹین ایج میں جوان ہونے سے پہلے بڑھاپے میں داخل کر دیا گیا ہاں مجھ پر بہت بڑا ظلم ہوا تھا گئی۔ بے آواز آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گر کر تکیے میں جذب ہوگئے۔

☆......☆......☆

آج چھٹی تھی کچن میں کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ احسن صاحب نے باہر آکر دیکھا تو علیشے چائے کا پانی رکھ رہی تھی۔

''علیشے بٹیا!'' انہوں نے پکارا تو ایک دم سے چونکی۔

''جی بابا سائیں!'' اس نے ادب سے کہا۔

''بیٹا! تم صرف چائے بنالو ناشتہ باہر سے لے آتا ہوں کیا کھائے گا میرا بیٹا؟'' انہوں نے محبت سے پوچھا۔

''جو آپ کو اچھا لگے بابا!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں آج میری بٹی کی پسند کا ناشتہ آئے گا۔'' انہوں نے کہا تو باہر نکلتی عائشہ نے مسکراتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔

''تو بابا! پراٹھے یا حلوہ پوری لے آئیں۔'' وہ ہلکا سا ہنسی اور بابا اس کا پر تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل گئے اور اماں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

''بیٹا! اللہ کی اس مہربانی اور کرم پر ہر لمحے ہر ہر سانس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اللہ نے ہم پر وہاں سے کرم کیا ہے جہاں سے ہم ہر امید کھو بیٹھے تھے۔'' عائشہ نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اماں! آپ کو دونوں بھائی یاد نہیں آتے۔'' علیشے نے پوچھا۔

''آتے ہیں مگر اس طرح نہیں جس طرح ورشے اور پرشے یاد آتی ہیں تمہارے دونوں بھائیوں نے ساری زندگی آسودگی دیکھی اور آج بھی آسودہ ہیں۔ جبکہ میری بیٹیوں نے ساری زندگی دکھ اور تکلیفیں جھیلیں اور آج بھی میں اُن کے حال سے ناواقف ہوں۔'' وہ دکھ سے بولیں۔

''اماں! بھائی بابا کو نقصان تو نہیں پہنچائیں گے ناں! جیسی انہوں نے دھمکی دی تھی۔'' علیشے نے پوچھا۔

''قطعی نہیں میں روزانہ فجر میں اُن پر بلکہ

سب پر آیت الکرسی، معوذتین، بسم اللہ توکلت علی اللہ اور یا حفیظ، یا رقیب پڑھ کر پھونکتی ہوں ایسے شخص کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے کہا تبھی احسن صاحب گرما گرم حلوہ پوری کا شاپر لیے اندر داخل ہوئے۔

''میری برائیاں ہو رہی ہیں۔'' انہوں نے ماں بیٹی کو مخاطب کیا۔

''صاحب! ہم نے تو پہلے بھی کبھی آپ کی برائی نہیں کی اب تو کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔'' عائشہ نے کہا تو وہ مسکرا دیے۔

''چلو جلدی سے ناشتہ کر کے گھر سمیٹ لو آج ورشیے کے گھر چلتے ہیں۔'' انہوں نے کہا تو ان دونوں کے نوالے منہ میں لے جاتے ہاتھ رک گئے۔

''ورشیے آپی!'' علیشے کے منہ سے اور عائشہ کے منہ سے ورشیے ایک ساتھ نکلا۔

''ہاں ورشیے۔'' انہوں نے کہا اور ان دونوں کی توجہ ناشتے کی جانب مبذول کروائی۔

☆......☆......☆

ورشیے یاسی کو دوپہر کے کھانے کی ہدایت دے رہی تھی تبھی اسے چوکیدار نے انٹر کام پر کسی عائشہ احسن اور علیشے احسن کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اڑتی ہوئی باہر گیٹ پر پہنچی مگر ساتھ میں آتے احسن سلطان کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئی۔

''کیا ہوا آپی! یہ اچانک فاسٹ فارورڈ سے استاپ کیسے ہو گئیں؟'' علیشے نے شوخی سے پوچھا۔

''وہ السلام علیکم!'' اسے کچھ نہ سوجھا تو اس نے سلام جھاڑ دیا جواب دونوں کی طرف سے آیا مگر احسن صاحب نے اس کے سر پر بھی ہاتھ رکھا۔

''آئیں آپ لوگ اندر تو آئیں۔'' اس نے آنکھوں کی نمی کو اندر اتارا تو وہ سب اندر چل دیے۔

''آپ لوگ ایسے اچانک مجھے فون کر دیتے تو میں ایک صاحب کو بھی روک لیتی۔'' وہ چھٹی کی وجہ سے اپنے دوست کی طرف چلے گئے ہیں۔

وہ بے ربط و بے تکا سا بول رہی تھی۔

''سرپرائز مائی ڈیئر آپی سرپرائز...... اگر بتا دیتے تو سرپرائز تو نہ ہوتا ناں!'' علیشے نے شوخی سے کہا تو ورشیے نے اس کے شوخ انداز کو حیرت سے دیکھا۔

''اور مجھے اپنی بیٹی کو بھی تو منانا تھا آخر ناراض ہے وہ مجھ سے۔'' احسن صاحب نے کہا تو ورشیے کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''نہیں ناراضگی کیسی؟'' اس نے خود کو کمپوز کیا۔

''میں نے ظلم کیا تھا تمہارے ساتھ اتنی کم سنی میں خود سے بھی بڑے شخص کے حرم میں دے دیا تمہیں۔'' وہ شرمندگی سے بولے۔

''نہیں بابا! یہ ظلم نہیں تھا میرے ساتھ، میرے نصیب میں ایک کریم ہی تھے وہ مجھے مل گئے ظلم تو میرے ساتھ یہ تھا کہ میں بے اعتبار ٹھہری۔ میرا مان ٹوٹا، میں اس گناہ کی معتوب ٹھہرائی گئی جو میں نے کیا ہی نہیں۔'' وہ بے اختیار رو پڑی۔

''مجھے معاف کر دو بیٹا۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑے اور ورشیے نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں بابا بے معافی نہیں مانگتے میں نے دل سے آپ کو معاف کیا میرا خدا بھی آپ کو معاف کرے۔'' اس نے کہا۔

تو احسن صاحب نے آنکھوں کی نمی پونچھی تھوڑی دیر بعد بڑھے اور انہیں گلے سے لگا لیا۔ پھر ایک کریم بھی آ گئے۔

''ارے میرا یار آیا ہے۔'' کا نعرہ لگاتے آ گئے اور دوپہر کا کھانا خاصے اچھے ماحول میں کھایا گیا۔

☆......☆......☆

شیلزے اس واقعے کے بعد سے ایک ہفتے یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ اور آج ورشیے نے زبردستی اسے بھیجا تھا۔ اس کے تمام فرینڈز اس سے آ کر ملے تھے۔ علی، شرمین اور مصطفیٰ سب نے اس سے سوری کہا تھا کہ وہ ان شواہد سے دھوکا کھا گئے جو انہیں دکھائے گئے تھے اور اس نے انہیں معاف کر دیا۔ اور اس وقت وہ لائبریری سے کتاب ایشو کروا کر نکلی تھی کہ اس کے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا اور وہ بغیر دیکھے بھی جانتی تھی کہ یہ حمیران ہے۔

''میرے کندھے سے ہاتھ ہٹاؤ۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''شیلزے! میری بات سنو۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی اور نہ آئندہ میں تمہیں اپنے آس پاس دیکھنا چاہوں گی۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔

''شیلزے! میں مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی ہے مگر سارے شواہد تمہارے خلاف تھے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''اور یہاں تو بات ہی صرف اعتبار کی تھی۔ مسٹر حمیران علوی...... ساری دنیا میرے خلاف ہوتی میں جھیل جاتی مجھے صرف دو لوگ اپنے پاس چاہیے تھے ایک حمیران علوی اور دوسرا اپنا باپ ایک کریم، لیکن کتنے شرم اور ڈوب مرنے کا مقام ہے میرے لیے کہ یہی دونوں لوگ مخالف کیمپ میں کھڑے تھے اور جو دو لوگ میرے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے تھے۔ میری ہر بات کا اعتبار کر رہے تھے انہیں میں نے کبھی کسی قابل ہی نہیں سمجھا میری Step Mother ورشیے آپی اور ان کا کزن حذیفہ احمر جو میرے لیے لڑ رہے تھے اور لڑے اور جیت گئے۔ اور انہوں نے مجھے دنیا کے سامنے سرخرو کر دیا کہ آج میں سر اٹھا کر یہاں آ سکی ہوں۔'' اس نے آنکھوں کی نمی پونچھی۔

''شیلزے! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' حمیران جلدی سے بولا۔

''حمیران! اب کوئی آئندہ آئے گا ہی نہیں ہمارے درمیان، تم کنزرویٹو تھے پوزیسو تھے میں نے تمہاری ہر خامی برداشت کی کیونکہ مجھے تم سے محبت تھی۔ اب کس برتے پر اب تو وہ محبت ہی نہیں رہی۔'' وہ سنگدلی سے بولی۔

''ایسا مت کہو شیلزے! محبت کو فنا نہیں ہے میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکوں گا۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''یہ اس وقت نہیں سوچا تھا جب مجھے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ میں نے تو تمہاری ہر بات سن کر اس کا جواب بھی دیا ہے تم نے تو میری کوئی بات سننا بھی گوارا نہیں کی تھی۔ تم جانتے تھے کہ تمہارا کزن سازشی ہے اور میں بار بار کہہ رہی تھی کہ میں کسی سازش کا شکار ہوئی ہوں مگر تم نے تو مجھے سننا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اینڈ آئی ایم سوری ٹو سے دیٹ کہ میں اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو کہ آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتبار نہ کرتا ہو یقین نہ کرتا ہو۔'' وہ

سرد لہجے میں بولی۔

''میں کروں گا۔'' حمیران بولا۔

''تم ثابت کر چکے ہو۔'' وہ تمسخر سے بولی۔

'And Good By Forever' آئندہ میرے آس پاس نظر نہ آنا کیونکہ اب میں تم سے اتنی تمیز سے بات نہیں کروں گی اور انسان کی اپنی عزت اس کے اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر شیلزے پلٹی اور اس نے ہاتھ میں پکڑے گاگلز آنکھوں سے لگا کر امڈ آنے والی نمی کو چھپایا اور آگے چل دی اور حمیران ہارے ہوئے جواری کی طرح وہیں بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

شیلزے ٹی وی لاؤنج میں چینل سرچ کر رہی تھی وہیں ورشیے بھی بیٹھی مڈ ویک میگزین دیکھ رہی تھی آخر کار شیلزے نے اُکتا کر ٹی وی ریموٹ میز پر پٹخا کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا اُسے۔

''کسی ایک چینل پر بھی ایک بھی اچھی چیز نہیں آ رہی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''اور ایسا پتہ ہے کب ہوتا ہے؟'' ورشیے نے پوچھا۔

''کب؟'' اس نے بھی سوال کیا۔

''جب ہم اُلجھے ہوئے ہوں تو ہمیں کچھ اچھا نہیں لگتا ہے ایسا تمہارے ساتھ تب سے ہے جب سے میں نے تمہیں حذیفہ کے پروپوزل کے بارے میں بتایا ہے۔ شیلزے الجھو مت دماغ کو آزاد چھوڑ دو اور جو فیصلہ اس کا ہے اسے قبول کر لو۔'' اس کے بعد وہ خاموش ہو کر سوچنے لگی تو شیلزے نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا میں نے تو دل و دماغ دونوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اور دماغ کا فیصلہ حذیفہ کے حق میں ہے اور دل حمیران کے لیے دہائیاں دیتا ہے۔

''میں جانتی ہوں تمہیں حمیران سے محبت ہے تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے اگر تم حمیران کو ہمسفر بنانا چاہتی ہو تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' ورشیے نے دوبارہ کہا۔

''وہ بھی اچھا ہے ویل آف فیملی سے ہے۔''

''نہیں آپی!'' وہ سخت کھردرے لہجے میں بولی۔

''محبت ہے نہیں محبت تھی۔ اس لمحے تک جب تک اس پر آزمائش نہیں آئی تھی۔ آزمائش نے اسے بے نقاب کر دیا۔ اس نے اعتبار، یقین اور مان کی دھجیاں اڑا دیں۔ میرے وجود کو بے یقینی اور بے اعتباری کے خار دار تاروں میں لپیٹ کر شک کی سنگلاخ زمین پر بے پیرہن گھسیٹا ہے۔ اور محبت نے اسی وقت اس کی جانب سے پلو سمیٹ لیا تھا۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولی۔

''پھر بھی سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔'' ورشیے نے محبت سے کہا۔

''فیصلہ تو میں کر چکی ہوں۔'' وہ بے لچک لہجے میں بولی۔

''ایک بار پھر نظر ثانی کر لو۔ مجھے تمہاری آنکھوں میں محبت گڑگڑاتی ہوئی نظر آتی ہے۔'' ورشیے نے اسے سمجھایا۔

''آپی! ابھی کچھ دن لگیں گے دل ایسے شہر کی بربادی کا منظر بھول جانے میں، اور آپی! اب اگر حمیران علوی سونے کا بھی بن کر آ گیا ناں! تو میرے لیے ناقابل قبول ہوگا۔ کیونکہ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں، جب وہ مجھے ادب و احترام ہی نہ دے سکا تو محبت کیا کرے گا۔'' وہ سنگدلی سے بولی۔

''شیلزے! حمیران تم سے محبت کرتا ہے اسے معاف کر دو۔'' ورشیے نے سمجھایا۔

''نہیں آپی! معافی کا لفظ اس کے لیے میری

ڈکشنری میں نہیں ہے اب شاید ساری زندگی وہ میرا اعتبار کرے مگر میں وہ اعتبار کہاں سے لاؤں۔

''میرا مان ٹوٹ چکا ہے جس نے توڑا میں اس کا ساتھ کیوں دوں مجھے جس پر مان نہیں تھا اس نے میرا ساتھ دیا میں اس کا ساتھ کیوں نہ دوں۔'' شیلزے نے قطعی لہجے میں کہا۔

''تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔'' ورشیے نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

''جی بالکل آخری۔'' کہتے ہوئے اس نے ریموٹ اُٹھا کر HBO لگالیا اور اس کے انہماک بتارہا تھا کہ الجھن سولو ہو چکی ہے۔ اور ورشیے نے طمانیت سے سر صوفے کی بیک سے ٹکالیا۔

☆......☆......☆

آج احسن سلطان اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ پرشیے کے سسرال آئے تھے احسن صاحب کے ساتھ بابا صاحب اور اسامہ کے دونوں بھائی اور چچا صاحب بیٹھ گئے تھے اور علیشے اور عائشہ کو زنان خانے میں بھجوادیا گیا تھا جہاں اُن کی خالصتاً سندھی مہمان نواز انداز میں مہمان نوازی کی گئی اور پھر اماں صاحب نے خالہ چچی کے منہ بنانے کے باوجود اُن دونوں کو پرشیے کے ساتھ بھیج دیا۔

''جی جی! کیا ضرورت تھی ان لوگوں کو پرشیے کے ساتھ بھیجنے کی نجانے کیا کیا لگائے گی۔'' خالہ چچی نے جل کر کہا۔

''بری بات ہے فاطمی ما! ایک زمانے بعد وہ ماں بہن سے مل رہی ہے سو دکھ درد ہوتے ہیں جو اولاد صرف ماں کو بتاتی ہے اور اس سے اس کا یہ حق چھیننا ناانصافی ہے اور کسی کو سمجھنے کے لیے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے اور پری تو تمہارے ساتھ دو سالوں سے ہے وہ الگ مزاج کی بچی ہے۔'' اماں صاحب نے سمجھایا۔

''جی جی! آپ کو تو ایک میں ہی غلط لگتی ہوں باقی تو سب فرشتے ہیں۔'' وہ غصے سے کہہ کر اُٹھ گئیں اور باہر نکل گئیں اور اماں صاحب مسکرانے لگیں۔

پرشیے ان دونوں کو لے کر کمرے میں آئی اسامہ ابھی ابھی نہا کر فارغ ہوا تھا اسے باتھ روم میں محسوس ہوا کہ اس کے کمرے سے گزر کے کوئی پرشیے کے کمرے میں گیا ہے اور یہ تعداد ایک سے زیادہ ہے وہ سر صاف کرتا ہوا باہر نکلا پرشیے کے کمرے کا دروازہ معمولی سا کھلا ہوا تھا اور اندر کی آوازیں باہر آرہی تھیں۔

''واہ! آنے! آپ کے اور آپی کے تو مزے ہیں کیا شاندار محلوں کی شہزادیاں ہیں آپ دونوں۔'' علیشے کی چہکتی آواز آئی تو اسامہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تو ابھی تک تم خوابوں کی دنیا سے باہر نہیں آئیں۔'' پرشیے پھیکی سی ہنسی ہنسی۔

''کیا برا ہے آنے! کبھی کبھی خوابوں کو خوبصورت تعبیر مل جاتی ہے۔'' علیشے نے پُراعتماد لہجے میں کہا تو پرشیے نے اسے اور ماں کو حیرت سے دیکھا جو کہ خود بھی مسکرا رہی تھیں۔

''ارے! آنے! آپ کو ابھی تک مطالعے کا شوق ہے آپ کے پاس اور بکس ہیں۔'' وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں یہ سائیڈ میں ایک چھوٹا سا روم بنا ہوا ہے وہاں کتابوں کا ذخیرہ ہے لائبریری کی صورت میں یہاں ٹیرس میں سے ہو کر چلی جاؤ۔'' پری کے کہنے پر وہ سر ہلاتی ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اسامہ بھی تیار ہو چکا تھا اس نے اندر آنے

کے لیے قدم بڑھائے تبھی اندر سے آواز آئی۔
''پری! بیٹے تم اپنے بابا کو معاف کردو وہ بہت بدل گئے ہیں۔'' عائشہ کی آواز آئی اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔
''کیوں کیوں معاف کردوں میں انہیں، نہیں معاف کروں گی میں انہیں، انہوں نے میری زندگی کو مذاق بنا کر رکھ دیا ہے آپ کو پتہ ہے یہ میرا بیڈ روم ہے اور برابر والا اسامہ کا، اسامہ آج تک مجھے میرا مقام نہیں دے سکے۔ وہ اس زبردستی کی شادی پر میرے کردار کے بارے میں مشکوک ہو چکے ہیں اور میں اس سلسلے میں انہیں قصور وار نہیں سمجھتی یوں زبردستی مسلط کی جانے والی لڑکی مشکوک ہی ہوتی ہے۔'' وہ نم آنکھوں سے بولی۔
''مگر بیٹا! تمہیں اس سلسلے میں اس سے بات کرنی چاہیے تھی۔ اپنی صفائی دینی چاہیے تھی۔'' عائشہ نے دکھ سے بیٹی کو دیکھا۔
''کیوں کیوں دیتی میں کوئی صفائی کوئی گواہی، صفائی گناہ گار دیتے ہیں بے گناہ نہیں۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔
''بیٹا! اپنے رویے کی شدت پسندی کو کم کرو یہ معاملہ تو گفتگو سے حل ہو سکتا تھا تم نے اسے پیچیدہ بنا دیا۔'' وہ آزردگی سے بولیں۔
''پیچیدہ میں نے نہیں بابا نے بنایا ہے اور پتہ ہے ان کا پلان کیا تھا کہ یہاں تو عورت کو گائے بکریوں کی طرح ٹریٹ کیا جاتا ہے میرے ساتھ بھی یہی ہوگا مگر میرا رب بہت بڑا اور بہت مہربان ہے اسامہ پڑھے لکھے ہیں انہوں نے ہمیشہ مجھے ڈیفینڈ ہی کیا ہے کبھی بے جا سختی نہیں کی میری تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کروایا اُن کے بہت سے احسانات ہیں مجھ پر۔'' وہ ہولے سے دکھی سی ہنسی ہنسی۔
''وہ اتنا اچھا ہے تو بات کرنے میں کیا حرج ہے پری!'' عائشہ نے اسے دیکھا۔
'بات ہے اماں میری سیلف ریسپیکٹ کی اس سے میری سیلف ریسپیکٹ مجروح ہوتی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔
''اچھا اللہ بہتر کرے اپنے بابا کو تو معاف کردو۔'' عائشہ نے پھر التجا کی۔
''نہیں اماں! بابا نے اسلام کے نام پر اپنی بیٹیوں کا استحصال کیا ہے جبکہ وہ اسلام ہی تھا جس نے عورت کو اس کا جائز مقام دیا اس سے پہلے عورت کیا تھی۔ ایک غلام ایک لونڈی۔ مگر اسلام نے اسے عزت و توقیر عطا کی۔ اس کو جائیداد میں سے حق دلوایا۔ اور بابا...... بابا نے تو عورت کو ہر روپ میں گالی سمجھا وہ بیٹی جس کے ہونے پر آقائے دو جہاں حضرت محمد ﷺ کا سلام آتا ہے اسے انہوں نے زحمت بنا دیا۔ میرے آقائے دو جہاں میرے رب کے محبوب نبی ﷺ اگر اللہ چاہتا تو اُن کے لیے بیٹوں کے ڈھیر لگا دیتا مگر اس نے انہیں زندہ اولادوں میں چاروں بیٹیاں دیں اور وہ بیٹیاں میرے نبی ﷺ کے دل کا ٹکڑا تھیں عرب کی شہزادیاں تھیں وہ، وہ بیٹیاں کہ عثمانؓ کے نصیب میں دو آتی ہیں تو عثمانؓ ذوالنورین بن جاتے ہیں یعنی دونوں آنکھوں کا نور وہ بیٹیاں بابا کے لیے ساری زندگی سب سے نچلے سب سے کمتر درجے پر رہیں۔ نہیں معاف کیا جاتا مجھ سے بابا کو۔'' وہ رونے لگی۔
''پھر بھی بیٹا! ایک بار دل بڑا کرلو۔'' وہ بھی رونے لگیں۔
''نہیں اماں! پتہ ہے اسامہ کی بدگمانی کی ایک بڑی وجہ بابا کا دوغلا پن تھا ایک طرف تو وہ

اسامہ کو عورت کی عزت کا درس دیتے تھے اور دوسری طرف اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتے تھے وہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہے کہ بابا نے ہمارے ساتھ کبھی کچھ برا کیا ہے یا کر سکتے ہیں۔'' وہ آزردگی سے بولی۔

''پھر بھی بیٹا! ماں باپ کا رتبہ بہت بلند ہے۔'' انہوں نے ایک کوشش اور کی اسی وقت وسائی کمرے میں اجازت لے کر داخل ہوئی اور اسامہ فوراً کمرے کے سامنے سے ہٹ گیا وسائی اندر والے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''پرشیے بی بی! آپ کو تینوں کو آپ کے بابا سائیں بلا رہے ہیں۔'' اس نے آکر پیغام دیا اور عائشہ نے پرشیے کو دیکھا تو وہ تھکے تھکے قدموں سے علیشے کو بلانے کے لیے ٹیرس کی طرف چلی گئی۔

احسن سلطان نے ان تینوں کو آتے ہوئے دیکھا تو نظریں جھکالیں۔

''پروفیسر صاحب! آپ بیٹی سے بات کریں ہم چلتے ہیں۔'' بابا صاحب نے کہا تو احسن صاحب نے متشکر نگاہوں سے اُن سب کو دیکھا جو کہ ہاتھ ملا ملا کر اُن سے باہر نکل رہے تھے تب تک وہ تینوں بھی اُن کے پاس آگئیں اور احسن صاحب نے پرشیے کے آگے ہاتھ جوڑ لیے اور وہ جو سوچتی ہوئی آئی تھی کہ وہ بابا کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ چاہیں وہ کچھ کرلیں ایک دم سے تڑپ گئی اور اس نے آگے بڑھ کر اُن کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''نہیں بابا بڑے معافی نہیں مانگتے۔'' وہ رو دی۔

''مجھ سے بدنیت مانگتے ہیں۔ میں نے تمہاری شادی اسامہ سے تمہاری ضد اور اپنی بدنیتی میں کی تھی کہ تم ساری زندگی گھٹ گھٹ کر جیو۔'' وہ بھاری آواز میں بولے اور اندر آتے اسامہ نے یہ الفاظ سنے۔

''مگر ایسا ہوا نہیں پاپا! آپ نے میری شادی دنیا کے بہترین انسانوں میں سے ایک انسان سے کی ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''تم خوش ہو۔'' انہوں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''جی بابا! بہت زیادہ۔'' اس نے سر جھکالیا۔

''سچ نظریں جھکا کر نہیں نظریں ملا کر بولے جاتے ہیں۔'' وہ شک میں مبتلا تھے۔

''مگر بابا! اب کیا شوہر کی تعریفوں والے سچ بھی میں باپ سے نظریں ملا کر بولوں۔'' اس نے سر جھکا کر ہی کہا تو وہ مسکرا دیے اور انہوں نے سر اپنے سینے سے لگالیا۔

''بس اب بہت گلے شکوے ہوگئے اب سب اچھی اچھی باتیں کریں گے۔'' اسامہ نے بلند آواز سے کہا اور آکر اُن سب کے پاس کھڑا ہوگیا تو سب ہنس دیے۔

''اگر تمہاری اجازت ہو تو میں اپنی بیٹی کو کچھ دنوں کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں۔'' احسن صاحب نے پوچھا۔

''بابا! آج تو نہیں میں اسی ہفتے پرشیے کے ساتھ آپ کی طرف آؤں گا۔'' اس نے مودب لہجے میں کہا۔

''چلو جیسے تمہاری مرضی۔'' انہوں نے کہا۔

پھر ان لوگوں نے رات کے کھانے تک کے لیے ان تینوں کو روک لیا۔ واپسی پر تینوں کو اجرک، سوٹ، خشک میوے اور موسمی پھل اُن کے ساتھ کردیے۔

''یہ بہت زیادہ ہے۔'' احسن صاحب احتجاج کرتے رہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''یہ ہمارے ہاں کی روایت ہے۔'' بابا صاحب نے خوشدلی سے کہا ان لوگوں کے آنے سے ان سب کے دلوں میں ان سب کی طرف سے جو کڑواہٹ تھی وہ ختم ہوگئی تھی۔ اور یوں یہ قافلہ کراچی روانہ ہوا۔

☆......☆......☆

''تم یہ سب مجھے نہیں بتا سکتی تھیں۔'' وہ بڑے مگن سے انداز میں اپنی الماری سے کپڑے سیٹ کر رہی تھی کہ اسامہ کی آواز پر چونکی۔

''کیا نہیں بتا سکتی تھی؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''وہی سب جو اماں جان اور بابا سائیں سے کہا تھا۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''وہ میرے والدین ہیں میں اُن سے جو کچھ کہہ سکتی ہوں وہ سب آپ سے نہیں کہہ سکتی۔''

''کم ٹو دا پوائنٹ مس پرشیے اسامہ۔'' اس نے پری کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دے کر اپنے مقابل کھڑا کر کے اتنے استحقاق سے کہا کہ پرشیے بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور اسامہ دو قدم آگے۔

''میں گناہ گار نہیں تھی۔ جو اپنی صفائی دیتی۔'' وہ بھڑک کر بولی۔

''بعض اوقات بے گناہوں کو بھی صفائی دینی پڑتی ہے بی بی مریمؑ کو بھی دینی پڑی تھی۔'' وہ بولا۔

''بی بی مریمؑ کے پاس عیسیٰؑ تھے۔ میرے کردار کی گواہی کون دیتا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''تم مجھ سے کہتی ہو۔'' وہ بولا۔

''پھر کیا ہوتا؟''

''مجھے لہجوں کی پہچان ہے میں جھوٹ اور سچ کو Judge کر سکتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''اسامہ! سچائی بذات خود ایک بہت بڑی طاقت ہے اگر اسے آپ اپنے ساتھ رہنے والے شخص میں کھوج نہیں سکے تو وہ شخص اپنے الفاظ کیوں ضائع کرے۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''بعض اوقات ہمیں خود کو جسٹی فائی کرنا پڑتا ہے۔''

''بہت رائٹ ہو پری تم بہت دفعہ ہمیں درست ہوتے ہوئے بھی خود کو درست ثابت کرنا پڑتا ہے اور رہ گئی سچائی کھوجنے کی بات تو میم آپ کی سچائی پر دل تو پہلے ہی ایمان لا چکا تھا۔ بس دماغ تاویلیں پیش کرتا تھا۔'' وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

''مجھے معلوم ہے اسامہ! آپ بہت تیزی سے مجھ تک آتے تھے اور پھر اپنے گرد دیواریں کھڑی کر کے قلعہ بند ہو جاتے تھے۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

تب تک وہ پیچھے ہٹ ہٹ کر دیوار سے جا لگی تھی اور اسامہ اب بھی اس کے مدمقابل تھا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟'' وہ پوچھ بیٹھا۔

''عورت اپنی جانب اٹھنے والی ہر نظر معنی و مطالب کے ساتھ جانتی ہے۔'' وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔

''اچھا جی......!'' اسامہ نے کہا تو وہ مزید سرخ ہوگئی۔

''اس نے دیوار سے لگے اس کے وجود کو دیکھ کر اس کے دونوں اطراف میں اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی راہیں مسدود کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی تم نے خود کو جسٹی فائی نہیں کیا۔''

''اسامہ تھوڑی بہت انا مجھ میں بھی ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''میم! آپ میں تھوڑی بہت نہیں اچھی خاصی انا ہے۔ ویسے اب کہاں جاؤ گی۔'' اس نے پری کے دیوار سے لگے وجود اور دیوار پر

دونوں جانب رکھے اپنے ہاتھوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''دیوار توڑ کر نکل جاؤں گی۔'' وہ شرارت سے بولی۔
''تو پھر میم! اب آپ دیوار توڑنے کی تیاری کریں۔'' کہتے ہوئے اسامہ نے اس کی جانب پیش قدمی کی۔

☆......☆......☆

ورشیے شیلزے کے ساتھ پورا دن رُکنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اور پرشیے کو اسامہ جمعہ کی رات کو چھوڑ گیا تھا۔
''اتنے دنوں بعد آئی ہوں پورا ہفتہ رکوں گی۔'' اس نے اسامہ سے کہا تھا۔
''قطعی نہیں اتوار کی شام کو لینے آؤں گا اور کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔'' وہ پُرشوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
''آپ بہت ظالم ہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔
''محترمہ مگر آپ سے بہت کم، بلاوجہ دو سال ضائع کروادیے۔'' وہ بھی منہ بنا کر بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی مگر اس کے اگلے ہی جملے پر سرخ ہو کر اندر بھاگ گئی۔
''ورنہ کم از کم دو بچوں کے ابا جان بن چکے ہوتے اب تک۔'' اس نے کہا اور پھر اس کے بھاگنے پر کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔
اب وہ تینوں بیٹھی شیلزے کی منگنی میں پہننے والے کپڑے ڈسکس کیے جارہی تھیں اور شیلزے ایک فیشن میگزین سے اپنے لیے منگنی کے ڈریس کا کلر اور ڈیزائن دیکھنے میں مصروف تھی کیونکہ حذیفہ کے گھر والوں نے منگنی کے ڈریس کے پیسے بھجوادیے تھے۔اور پسند شیلزے پر چھوڑ دی تھی۔
''آنے! سنا ہے اصفہان بھائی بولی وڈ کی کسی فلم میں کام کررہے ہیں۔'' علیشے نے جذباتی لہجے میں کہا۔
''کرنے دو بولی وڈ میں کریں لالی وڈ میں یا ہالی وڈ میں ہمیں کیا۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔
''آپ کو بھائی یاد نہیں آتے آنے!'' اس نے پرشیے کو دیکھا۔
''مجھے آج تک ان سے منسوب کوئی خوشگوار یاد نہیں آئی تکلیف دہ یادیں بہت ہیں اور میں ہر تکلیف دہ بات کو بھول جانا چاہتی ہوں۔'' وہ آزردگی سے بولی۔
''سنا ہے ارمغان بھائی کو اُن کے سسر نے گھر سے نکال دیا ہے۔ آج کل وہ بھائی بھابی کے ساتھ رہ رہے ہیں۔'' علیشے نے پھر کہا۔
''تو دوسروں کو اذیت دینے والے خود سکون سے کب رہتے ہیں۔'' جواب ورشیے کی طرف سے آیا اور باہر سے اندر آتی عائشہ نے سوچا۔
''اے اللہ وہ میرے بچے ہیں اُن کو بھی کامیابیاں ذہنی سکون عطا کر اپنا شکر گزار اور ہمارا فرمانبردار بنا آمین۔''
تبھی احسن صاحب بھی اندر داخل ہوئے۔
''آج میری بیٹیوں کا کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' انہوں نے پوچھا۔
''بابا! ہم کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔'' تینوں یک زبان ہو کر کہا۔
''قطعی نہیں آج میری تین بیٹیاں (شیلزے) میرے گھر آئی ہوئی ہیں میرا داماد گھر آئیں گے آج تو کچھ اسپشل ہونا چاہیے۔'' انہوں نے کہا۔
''تو پھر کیا کریں بابا!'' پری نے پوچھا۔
''میں جا کر چکن اور روکھا قیمہ لے آتا ہوں باربی کیو کریں گے۔'' احسن صاحب نے تجویز دی۔

''جی بابا! بالکل۔'' علیشے خوشی سے اچھلی۔
''مگر بابا! ساتھ میں پودینے کی گڑ والی چٹنی اور آلو بخارے کی چٹنی بھی ہونا چاہیے۔'' پری نے کہا۔
''ہاں تو آلو بخارے اور گڑ بھی لا دوں گا'' انہوں نے فراخدلی سے کہا۔
''رائتے کے لیے دہی۔'' ورشیے نے کہا۔
''اور پراٹھے گھر میں بنائیں گے سلاد کا بابا کو بتادو۔'' ورشیے نے دوبارہ کہا۔
''سب کی لسٹ بنادو میں لے آؤں گا اور پراٹھے گھر میں بنانے کی ضرورت نہیں ہے وہ رات میں آجائیں گے۔'' انہوں نے پیار سے بیٹی کو دیکھا۔
''اور بابا کولڈ ڈرنک کے بغیر تو باربی کیو کا مزہ ہی نہیں ہے۔'' شیلزے نے کہا تو سب نے 'بالکل بالکل' کا نعرہ لگایا تو احسن صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائے۔
''اور میٹھے میں خوبانی کا گودا پکا کر فریز کیا ہوا ہے میں نے بادام بھی نکال کر رکھے ہیں میٹھے میں خوبانی کا میٹھا بنالیتے ہیں۔'' اور یوں مینیو ترتیب پایا اور لسٹ بن گئی جسے لینے احسن صاحب چلے گئے اور عائشہ نے طمانیت سے سر بیڈ کی پشت سے لگالیا۔
اور علیشے نے سوچا وہ 'ہوم سوئٹ ہوم' جو اس کا خواب تھا اور خواب دیکھنا کچھ ایسا برا ابھی ثابت نہیں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

اور احسن صاحب نے ان سب کے مطمئن چہروں کو دیکھ کر سوچا۔
''میں نے ہمیشہ بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دی۔ حالانکہ میں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہوئی تھی اسلامک ہسٹری میں، اور میں جانتا تھا اسلام میں عورت کو کیا اہمیت حاصل ہے ہر روپ میں ماں، بہن، بیٹی، بیوی ہر روپ میں اسلام وہ پہلا مذہب تھا جس نے عورت کو ذلت کی پستیوں سے اُٹھا کر اس کے سر پر دوپٹہ رکھا اور اسے چادر اور چار دیواری کا تحفظ عطا کر کے ہمیں اس سے عزت سے پیش آنے اور اس سے نرمی اور محبت سے پیش آنے کا درس دیا۔
صرف درس ہی نہیں دیا۔ نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ نے اس کا عملی ثبوت دیا۔ امہات المومنین کے ساتھ اُن کا سلوک اور اپنی چاروں بیٹیوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ رہتی دنیا تک عالمِ اسلام کے لیے ایک مثال ہے۔
مگر ہم لوگ بیٹوں کے مقابلے میں بیٹوں کو اس لیے فوقیت دیتے ہیں کہ ہم اُن کو اپنا بازو سمجھتے ہیں اور بیٹیوں کو بوجھ جن کی شادی اور جہیز ہمارے ذمے ہوتا ہے۔ سو ہم انہیں بوجھ کی طرح ہی پالتے ہیں اُن کی ہر آسائش سلب کر لیتے ہیں۔ حالانکہ خدا نے تو وعدہ کیا ہے کہ بیٹی کے باپ کا بازو وہ خود ہے یہ حال تھا مجھ پی ایچ ڈی اِن اسلامک ہسٹری یعنی چراغ تلے اندھیرا۔ اور جنہیں میں نے بازو سمجھا وہ دونوں مجھے چھوڑ کر چل دیے اور میری بیٹیاں میرے پاس ہیں اور یہ مجھ گناہ گار پر خدا کا احسان ہے۔
دونوں بڑی بیٹیوں نے والد سے حصہ لینے سے انکار کیا اور بھائیوں کو دینے کا کہا تھا کہ قیامت میں اُن کی پکڑ نہ ہو اور انہوں نے اس شرط کے ساتھ یہ بات مان لی تھی کہ پرشیے اور ورشیے ان دونوں کو بھی اُن کا جائز حق دیں گے اور اپنی بیوی کو بھی وہ کچھ ازالہ کر چکے تھے اور باقی ساری زندگی کرنا چاہتے تھے۔

☆☆......☆☆

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد......
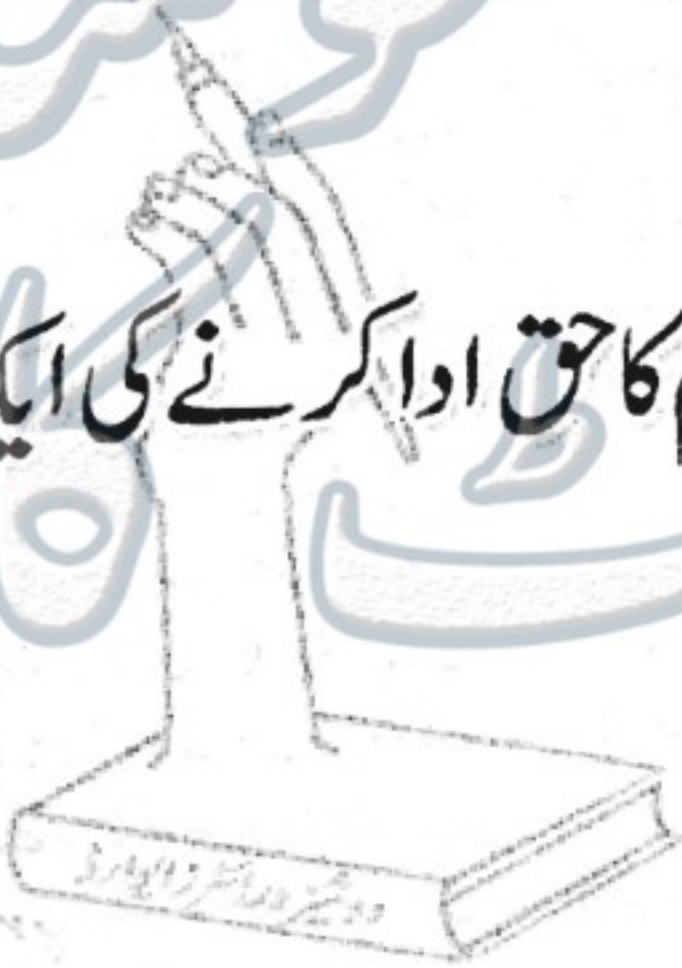
اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

افسانہ

خولہ عرفان

آڑے میاں

آخر ایکدن خبر گرم ہوئی کہ آڑے میاں کی شادی ہو رہی ہے لیکن بہت سادگی کے ساتھ محلے والوں کے گانے بجانے اور ہنگامہ کرنے کے ارمانوں پر پانی سا پھر گیا۔ جو رشتہ داروں سے میل ملاقات کے بہانے دو چار نئے انکشافات سے مہینہ بھر کی......

اصل نام تو بہت کم لوگ جانتے تھے مگر محلے بھر میں وہ آڑے میاں کے نام سے مشہور تھے۔ عید تہوار پر بھی آڑے میاں کے پہناوے میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔

نیا ہو یا پرانا لیکن لباس آڑا پاجامہ، اونچا سا کرتا اور سر پر سفید رنگ کی کاٹن کی سادہ ٹوپی ہی ہوتی تھی۔ عید کی چاند کی طرح سال میں ایک آدھ بار ہی وہ نظر آتے تھے اور وہ بھی ہمیشہ اپنے گھر کے باہر موجود برگد کے درخت کے نیچے ہوائی چپل پہن کر اکڑوں بیٹھے عالمِ استغراق میں......

قد و جسامت اور عمر سب درمیانے درجے کا تھا۔ مراد صاحب کے گھر کا یہی واحد چشم و چراغ تھے۔ محلے والوں کا ان کے گھر انا جانا بہت کم تھا۔ کبھی کوئی نسوانی صورت نظر ہی نہیں آئی۔

سنا تھا کہ مراد صاحب کی بیگم بچوں کی کم عمری میں ہی اُن کو داغِ مفارقت دے گئی تھیں اور انہوں نے تنِ تنہا اپنے بچوں کی پرورش کی تھی۔

اس محلے میں آئے یوں تو انہیں دو تین سال ہونے کو آئے تھے مگر اُن کے گھر میں مدد کی طرح پر پھیلائے اونچے سے کھجور کے درخت اور سناٹے نے گھر کا ماحول ایسا پُر تجسس بنا رکھا تھا کہ بچے جاتے گھبراتے تھے۔

پھر ایک دن تجسس کے مارے اُن کے پڑوسی عقیل صاحب نے کڑھی پکوائی اور اپنے بچے کے ہاتھ بھجوا کر حقِ ہمسائیگی نبھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ مراد صاحب اور اُن کے نورِ نظر کے علاوہ ایک بیوہ بیٹی بھی اُن کے گھر میں بسی خاموشی کا حصہ ہے۔

آہستہ آہستہ دوسرے محلے والوں نے بھی عقیل صاحب کی دیکھا دیکھی مراد صاحب کے گھرانے سے راہ و رسم بڑھانے کی جستجو شروع کی۔

زبیر صاحب نے اپنی بیگم کو شبِ برأت پر پکائی گئی کھیر خود دے کر آنے کو کہا تو بیگم نے یہ راز افشاں کیا کہ مراد صاحب کے پڑوس میں جو رضیہ

باجی ہیں وہ دراصل اُن کی بڑی بیٹی ہیں۔ افسری آپا نے بچی کے پاس ہونے کی مٹھائی بھجوائی۔ اتفاق سے مراد صاحب کا دروازہ اندر سے ایسا لاک ہوا کہ کھلا ہی نہیں۔

اُن کی بیوہ بیٹی نے بچے سے کہا کہ اِس دروازے سے برابر میں رضیہ باجی کے گھر چلے جاؤ وہاں سے باہر نکل جانا تو پتہ چلا کہ بظاہر دو الگ الگ نظر آنے والے گھروں میں اندر میل ملاقات کا راستہ بھی ہے۔

جبھی نہ رضیہ باجی اور نہ اُن کی بیوہ بہن رقیہ کبھی دروازے پر جھولتی نظر آئیں۔ ورنہ باقی محلے میں پورا وقت ہی کوئی نہ کوئی اپنے دروازے پر جھول کر جیمز بانڈ کے فرائض سرانجام دیتا نظر آتا تھا۔ محلے والوں کے اختلافات گھروں کے دروازے توڑ کر دیسے تو اکثر جھگڑوں کی صورت میں گلی میں نظر آتے تھے۔

لیکن ٹوہ لینے کی حد تک سب میں بے پناہ اتحاد و اتفاق تھا۔ یہاں بات زباں سے نکلی نہیں وہاں کوٹھوں چڑھی نہیں۔

مراد صاحب سے متعلق ہونے والے پیٹ

کے درد میں جب محلے والوں کے کچھ افاقہ ہوا تو انہوں نے آتے جاتے مراد صاحب کو آڑے میاں کی شادی کے مشوروں سے بھی نوازنا شروع کردیا۔ انہوں نے بھی عجز و انکساری کی تصویر بنے اس سوال کے جواب کا بوجھ اُلٹا مشورہ دینے والوں کے کاندھوں پر ڈال دیا۔

بالکل بالکل جناب آپ کی نظر میں بھی اگر کوئی اچھی بچی ہو تو بتایئے گا اور جیسے ہی محلے والوں کو بات خود پر آتی محسوس ہوئی انہوں نے وہیں سے کنی کترانی شروع کردی۔ کیونکہ آڑے میاں کی تعلیمی قابلیت اور عہدہ دونوں اُن کے حلیے سے میل نہ کھاتے تھے۔

گریڈ سترہ کے واٹر بورڈ کا آفیسر اور آدم بیزاری کا یہ عالم کہ کسی سے ہوں ہاں کے علاوہ کوئی بات ہی نہیں۔ سب ہی حیران تھے کہ بنا سفارش و رشوت و شاطر دماغ اور چلتر زبان سے کورے آڑے میاں کو افسری مل کیسے گئی۔ محلے والے تو اُن کو اپنی طرح ہی چھوٹا سمجھتے لیکن آفس کی طرف سے دی گئی کار جو اُن کے گھر کے سامنے اکثر کھڑی رہتی تھی۔ محلے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی تھی۔

آخر ایکدن خبر گرم ہوئی کہ آڑے میاں کی شادی ہو رہی ہے لیکن بہت سادگی کے ساتھ محلے والوں کے گانے بجانے اور ہنگامہ کرنے کے ارمانوں پر پانی سا پھر گیا۔ جو رشتہ داروں سے میل ملاقات کے بہانے دو چار نئے انکشافات سے مہینہ بھر کی باتوں کا راشن بھر جانے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

رات میں مراد صاحب اپنے بیٹے اور بیٹیوں کے ساتھ گئے اور دلہن رخصت کرا کے لے آئے۔

صبح کام سے فارغ ہو کر جب محلے والے یکے بعد دیگرے شادی کی مبارکباد دینے پہنچے تو پتا چلا کہ دلہن میکے جا چکی ہے۔

لیکن رقیہ نے بڑے تپاک سے سب کا خیر مقدم کیا اور چائے بسکٹ سے تواضع کی۔ ویسے کے انتظار میں محلے والے سوکھنے لگے تو چہ مگوئیاں بھی شروع ہو گئیں۔

چلو شادی میں نہیں بلایا مگر ہمارے مذہب میں ولیمہ کرنا سنت ہے۔ پیٹ کے درد کے سب سے بڑے مریض عقیل صاحب نے اسلامی نقطۂ نظر میں لپیٹ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

لیکن کچھ دن میں ہی یہ عقدہ کھل گیا کہ آڑے میاں نے دلہن کو اپنے گھر بٹھا دیا ہے۔

ارے گھر بٹھا دیا ہے یا وہ خود ان پوستی مارے لوگوں کو چھوڑ کر چلی گئی افسری آپا نے آگ لگانے والے انداز میں دروازے پر لٹکتے ہوئے سامنے دروازے پر براجمان زبیر صاحب کی بیگم سے اپنے جلے ہوئے خیالات کا اظہار کیا۔

اے بہن ایسے کنجوس لوگوں کا یہی حشر ہونا چاہیے۔ کھانے کی شوقین مسز زبیر نے بھی اپنی بددعا کو پیشن گوئی کا رنگ دیتے ہوئے ناک سکیڑ کر کہا۔ پھر باقی اہلِ محلّہ کی طرح ہمدردی کے بہانے سُن گُن لینے مراد صاحب کے یہاں پہنچ گئیں۔

رقیہ نے اُداس لہجے میں بس اتنا ہی بتایا کہ وہ الگ گھر میں رہنا چاہتی تھی بس بھائی میاں کو پہلے ہی دن دلہن کی یہ بیبا کی پسند نہیں آئی اور انہوں نے کہا کہ دلہنیں اور مل جائیں گی ابا بہن نہیں ملیں گے اس لیے نکاح کے دو بول پڑھنے کے بعد مزید تین بول ادا کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ مراد

صاحب کے گھر کی خاموشی میں اب اُداسی نے بھی اپنا حصہ ڈال دیا تھا۔

ایک ڈیڑھ مہینے بعد پھر شور اُٹھا کہ آڑے میاں کی نئی دلہن لینے مراد صاحب جا رہے ہیں۔ آڑے میاں جن کے غیر شادی شدہ ہونے پر لڑکیاں ملنی محال تھیں اور شادی شدہ ہونے پر تو مراد صاحب سمجھ بیٹھے تھے کہ اُن کے لختِ جگر پر خوشیوں کے سارے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ اب وہ اپنے لال کے لیے طلاقہ یافتہ خاتون کو بھی خوشی خوشی لانے کے لیے تیار تھے۔

آڑے میاں کی طرف سے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس دفعہ بھی محلے والوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ کب اُن کی دوسری شادی ہوئی اور کب دلہن آ گئی۔

وہ تو ایک رات عقیل صاحب نے عادت سے مجبور ہو کر چھت سے پڑوس میں جھانکا تو رقیہ کے ساتھ دوسری خاتون کو دیکھ کر نیچے اُترے اور بیگم کو لشتم پشتم تیار کر کے پڑوسیوں کے احوال معلوم کرنے بھیجا۔ رات کو مہمانوں کی اچانک آمد اور چائے کی پتی کی کمی اچھا بہانہ بن گئی۔ رقیہ جتنی دیر میں کچن سے چائے کی پتی لائیں۔ بیگم عقیل نے آڑے میاں کے کمرے سے نسوانی آواز اور چوڑیوں کی جھنکار سن لی۔ فوراً پوچھ بیٹھیں۔

''ارے کیا عاشر میاں کی دلہن لے آئیں۔''
رقیہ نے جھینپ کر کہا۔

''جی بس بھائی کو ڈھول دھمکو والی شادیاں پسند نہیں۔''

''خیر یہ تو اچھی بات ہے۔'' عقیل صاحب کی بیگم نے بات کو طول دیتے ہوئے کہا۔

''بھئی اب کچھ بھی ہے، ہم پر دلہن کو منہ دکھائی دینے کا حق بنتا ہے۔ ذرا ہم کو بھی ملواؤ دلہن بیگم سے، لیکن اسی وقت آڑے میاں دلہن کے ساتھ باہر جاتے نظر آئے۔

دلہن کے چہرے پر موجود نقاب نے اُن کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ انہوں نے رقیہ کے چہرے کو بشاشت سے تھپتھپایا اور صبح آنے کا کہہ کر چلی آئیں۔ مگر انتظار و انتظار ہی رہا۔ نہ آڑے میاں نظر آئے اس دن کے بعد نہ اُن کی دلہن......

محلے والوں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ عقیل صاحب اور ان کی بیگم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔ ویسے ہی پڑوسی عقیل صاحب کے حواسوں پر سوار رہتے ہیں۔

کچھ دن بعد افسری آپا رضیہ باجی کے بچے کی عیادت کو گئیں تو خبر باہر آ گئی کہ آڑے میاں نے دوسری دلہن کو بھی فارغ کر دیا ہے کیونکہ اُسے بیوہ بہن برداشت نہیں۔

محلے والوں میں مرد حضرات کے سینے پر سانپ لوٹ گئے کہ ہماری تو ایک ہی جان کو ایسی چپکی ہے کہ اُس نے اپنی جیسی چار چھ فوٹو اسٹیٹس بچوں کی صورت میں اور جان سے لگا دی ہیں اور آڑے میاں کے دیکھو مزے آ گئے ہیں۔

ایک چھوڑی دوسری پکڑی اور دوسری چھوڑی تو......اس واقعے کے بعد محلے والوں میں اِس مسٹری ہاؤس سے بیزاری پیدا ہو گئی۔ کبھی کبھار مراد صاحب سے مسجد آتے جاتے دعا سلام ہو جاتی تو ہو جاتی اور جب تیسری دفعہ آڑے میاں کی شادی کی خبر گرم ہوئی تو کسی نے بھی زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

ارے بیگم کوئی بے اولادی بیوہ کو بیاہ کر لا رہے ہیں مراد صاحب آڑے میاں کے لیے سنا

ہے بیچاری کی شادی کو دو چار سال ہی ہوئے تھے۔ عقیل صاحب نے کافی فکرمندانہ انداز میں بیگم کو اطلاع فراہم کی۔

بیگم نے مشکوک نظروں سے پہلے دل پھینک عقیل صاحب کو سر سے پیر تک گھور کر دیکھا پھر جلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تو میں کیا کروں...... دوسروں کے غم میں ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے گھر کے مسائل کم ہیں کیا اور جہاں تک لڑکی کے بے اولادی اور بیوہ ہونے کا تعلق ہے تو آڑے میاں بھی دو بیویوں کو فارغ کر کے نیم رنڈوا ہی لگتے ہیں۔

اُن پر کوئی بن بیاہی، صحت مند اولاد تو وارنے سے رہا۔

بیگم کی جل ککڑی باتیں سن کر عقیل صاحب کی مزید گوہر افشانی کرنے کی متمنی زبان تالو سے چپک گئی۔ گھر میں دال نہیں گلی تو انہوں نے باہر کا رخ کیا اور حزبِ توقع انہیں دو چار لوگ آڑے میاں کی اگلی شادی کی خبر کی نشرواشاعت کے لیے مل ہی گئے۔

اب کی دفعہ مراد صاحب نے ولیمے کی دعوت بھی کی اور لوگوں نے دلہن کو دیکھا بھی، شاید مراد صاحب کو احساس ہو گیا تھا کہ گھر آباد کرنے کے لیے لوگوں کی دعائیں بھی شامل ہونی چاہئیں۔

آڑے میاں کے چہرے پر ازلی آدم بیزاری موجود تھی مسکرائے بھی تو کنجوسی سے، البتہ دلہن کی شوخ مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ آڑے میاں کے ساتھ خوش ہے۔

عمر میں کچھ بڑی لگ رہی تھی یا شاید ڈیل ڈول ایسا تھا۔

آڑے میاں تو عید کے چاند کی طرح ابھی بھی محلے اور گھر سے اکثر و بیشتر غائب ہی نظر آئے۔

البتہ مراد صاحب جن کی بیٹیوں تک کو کبھی کسی نے دروازے پر لٹکتے نہیں دیکھا تھا۔ اب اُن کی بہو کو ضرور کسی نہ کسی حیلے بہانے سے دروازے پر دعوتِ دیدار دیتے دیکھتے۔

کپڑے جسم پر اتنے تنگ ہوتے کہ ہر ریڑی والے کو اپنی سانسیں تک رُکتی محسوس ہوتیں قدم منجمد نظروں کے ساتھ ایک ہی جگہ جمے رہ جاتے یا پھر جارجٹ کے دوپٹے سے جھانکتی بڑے سے گلے کی گہرائیوں میں اُن کی بھٹکتی نگاہیں انہیں گلیوں کا رستہ بھلا دیتیں اور وہ بار بار اِسی گلی کا چکر لگاتے نظر آتے۔

محلے کا ہر مرد آفس سے آنے کے بعد تھکن اتارنے کے لیے اپنے گھر کے باہر دوزانوں مراد صاحب کے گھر کا رُخ کیے بیٹھا نظر آتا اور تو اور ایک رات جب رقیہ اور رضیہ شہر سے باہر کسی تقریب میں شرکت کے لیے گئی ہوئی تھیں اور مراد صاحب نے شدید بخار اور نیم غنودگی کی حالت میں عقیل صاحب کو بلا اپنے باپ بننے کی صلاحیت سے محرومی اور آڑے میاں کی اولاد کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو اُن کی عیادت کے ساتھ ساتھ حقِ ہمسائیگی سے انہوں نے اُن کی بہو کو بھی نوازنے سے محروم نہیں کیا تھا کہ بیچاری کے اولاد نہیں ہو سکتی تو کیا اُس کی خواہش کا احترام ہی کر لیں۔

آخر اس کے بیباکانہ انداز پر اپنے بے قابو جذبات کی تشفی کے لیے انہیں اپنے دل کو کوئی دلیل تو دینی تھی۔

پھر شاید مراد صاحب اور رقیہ نے کچھ تنبیہ کی ہوگی کہ وہ بجلیاں گراتا وجود دروازے سے ہی نہیں گھر سے بھی غائب رہنے لگا۔

محلے والوں نے بھی ولیمے کا کھانا کھانے کے بعد نمک حلالی دکھائی اور مراد صاحب کے گھر سے متعلق ٹوہ لینے کی عادت ختم کردی۔ خود سب سے بڑے جاسوس عقیل صاحب کا بھی آفس کی طرف سے دوسرے شہر ٹرانسفر ہو گیا۔

اُن کی بیگم نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ عید تہوار پر وہ کچھ دن کے لیے خود آ جاتے یا بیوی بچے اُن کے پاس چھٹیاں گزارنے چلے جاتے تھے۔

پڑوس سے متعلق کوئی بات نہ کبھی انہوں نے بیگم سے پوچھنے کی ہمت کی اور نہ خود بیگم نے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔

اس دفعہ بھی عقیل صاحب دو سال بعد اپنے گھر اور محلے والوں کے ساتھ عیدِ قرباں منانے آئے ہوئے تھے۔

باہر نکلے شام کا جھٹپٹا تھا۔ جانوروں نے گلی میں خوب رونق میلہ لگایا ہوا تھا البتہ لوگ باگ تھک ہار کر گھروں میں کچھ دیر کو آرام کرنے جا چکے تھے۔ صرف مراد صاحب کے بکرے کے پاس دو چھوٹے ہم عمر و ہم شکل بچے کھڑے گھاس پھوس کھلا رہے تھے۔

عادت سے مجبور پوچھ بیٹھے کہاں رہتے ہو، بچوں نے انگلی سے گھر کی طرف اشارہ کر دیا۔

آپ دونوں بھائی ہو اُن کو ابھی بھی تسلی نہیں ہوئی تھی اس لیے دوسرا سوال جڑ دیا۔ ایک بچہ بدستور گھاس کھلاتا رہا دوسرے نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ عقیل صاحب اور بے تکلف ہوئے۔ قربانی کا بکرا کس کا ہے؟ بچے اجنبی کے اتنے سوالات پر گھبرا کر اندر بھاگ گئے۔

مراد صاحب شاید گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید مہمان آئے ہوئے ہیں حالانکہ کبھی اِن کے یہاں کسی کو آتے جاتے تو نہیں دیکھا۔

اسی سوچ کے ساتھ اُن کی رگِ تجسس پھر پھڑکی، دائیں بائیں دور دور تک کسی کے نہ ہونے کی تسلی کرنے کے بعد ساری حسیات جمع کر کے اپنے کان اندر سے آنے والی دھیمی سرگرشیوں پر لگا دیے۔

''جاؤ اندر اماں کمرے میں ہیں۔'' یہ رقیہ کی آواز تھی جو بچوں سے مخاطب تھی شاید۔

''رقیہ میں یہاں صرف تیرے لیے آتا ہوں۔ تجھے جانے کیوں بے چینی لگی رہتی ہے۔ میرے گھر پر رہنے نہ رہنے کی۔''

آڑے میاں کی اُلجھی اُلجھی آواز وہ بخوبی پہچان گئے۔

''تو تیرے بچے کب تک ابا سنبھالیں گے تُو خود بتا۔'' رقیہ نے دھیرے سے سمجھانے والے انداز میں پوچھا۔ چند لمحے کے سناٹے کے بعد آڑے میاں کی شکست سے بوجھل آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''رقیہ غور اور تحمل سے سن اور پھر بتا اگر تو میری جگہ ہوتی تو گھر آتی یا نہیں۔ تجھے سمجھانے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں لیکن صرف اتنا کہوں گا کہ صرف عورت ہی بانجھ نہیں ہوتی رقیہ اور یہ اذیت میرے لیے کافی تھی مگر میں اُس عورت کے ساتھ کیسے رہوں جو اپنے نام کے آگے نام میرا اور اولاد کسی اور کی لگائے۔ تُو مجھے بتا سکتی ہے کہ اس باپ نما چچا کے ہوتے ہوئے یہ بچے کس کے ہیں؟''

آڑے میاں کس پر اور کیا کیا شک کر رہے تھے۔ عقیل صاحب میں کچھ کہنے اور سننے کی سکت ہی کب تھی۔

☆☆......☆☆

ناول
زمر نعیم

ابھی امکان باقی ہے

اُن کرداروں کی کہانی، جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر
جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے **قسط نمبر 5**

''اے ون فرسٹ کلاس...... اپنے بھائی پر اعتماد رکھو۔ انشاء اللہ رزلٹ سو فیصد ہو گا۔'' زہیر کے لب و لہجے میں عزم، یقین اور اللہ پر بھروسہ صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اروی نے بھی بھائی کا حوصلہ بڑھایا۔

''انشاء اللہ و آمین۔ محنت کا ثمر ضرور ملتا ہے میں آپ کی کامیابی کی دعا کرتی رہوں گی بھائی...... امی کیا کر رہی ہیں اُن سے ذرا بات کرا دیں۔''

''ہاں تم دعا کرتی رہنا...... یہ لو...... امی سے بات کرو وہ بھی سبزی چھوڑے تم سے بات کرنے کو بے چین ہیں۔ کب سے مجھے گھور رہی ہیں اور......'' زہرا نے بیٹے سے موبائل فون تقریباً جھپٹ کر پکڑا۔

''یہ لڑکا بھی ناں...... ماں کا صبر آزماتے ہیں یہ بچے...... کیسی ہو میری بچی۔''

''اسلام علیکم امی...... میں بالکل ٹھیک ٹھاک...... آپ سب کیسے ہیں۔'' اروی کی خوشی اُس کی آواز میں چھلک رہی تھی۔

''وعلیکم السلام، جیتی رہو۔ کل سے تمہیں یاد کر رہی تھی۔ وردہ بھی اُداس ہو رہی تھی ایک دو دن کے لیے رہنے ہی آ جاؤ۔''

زہرا بے اختیار ہی دل کی خواہش عیاں کر گئی۔

''امی دل تو میرا بھی چاہتا ہے مگر......'' اروی بولتے بولتے یکدم چپ ہوئی تو زہرا نے ٹھٹھک کر کریدا۔

''مگر......؟ کیا کوئی پابندی ہے تم پر...... میرا مطلب ہے کہ......'' وہ ذرا توقف کر کے پھر بولیں۔

''تمہاری ساس یا......''

''نہیں...... امی...... پابندی بالکل نہیں ہے مگر مجھے خود سے کہنا مناسب نہیں لگتا۔ ابھی تو یہاں میں ٹھیک سے سارا گھر بھی دیکھ نہیں پائی ہوں...... آپ فکر نہ کریں میں جلد ہی رہنے آؤں گی۔'' اروی نے

اپنے طور پر مطمئن کرنا چاہا۔

''آپ لوگ آجائیں نا کسی دن......''

''ہا......ں......اسی بات کی تو جھجک ہے کہ بڑے لوگ ہیں۔ مزاج بھی نازک ہوں گے۔ ورنہ کئی بار سوچا بلکہ نمرہ نے بھی کہا کہ وہ جانے سے پہلے تم سے ملتی جائے گی۔ مگر تمہارے ابو نے منع کر دیا۔'' زہرا نے برملا دل کی بات کہہ دی۔

''کیوں......! ابو نے کیوں منع کیا۔ خالہ جانی آجاتیں۔ سبھی خوش ہوتے۔'' اروی قدرے اُلجھ کر پوچھ رہی تھی۔ اُلجھن یہ تھی کہ ابو نے کیوں منع کیا۔

''بس اُن کی بھی مصلحت تھی روکنے میں۔ وہ چاہتے ہیں تم پہلے اپنے گھر میں اپنی جگہ اپنا مقام بنا لو۔ پھر ہم تمہارے گھر آیا کریں گے۔'' زہرا نے اُسے اُلجھن سے نکالا۔

''یہ کیا بات ہوئی امی آپ سبھی کا حق بنتا ہے میرے گھر آنا میری شادی ہوئی ہے یہاں......اور سبھی نے مجھے دل سے قبول کیا ہے۔ آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں۔'' اروی کو یہ مناسب نہیں لگا تھا کہ اُس کے گھر والے اُس سے صرف اس لیے ملنے سے قاصر ہیں کیونکہ اُس کے سسرال والے حیثیت میں برتر ہیں۔

''بیٹا......مجھے بھی یہی مناسب لگتا ہے۔ البتہ تم ذہن میں کوئی بات مت رکھو۔ میں اور تمہارے ابو آئیں گے کسی دن۔''

''میں انتظار کروں گی......اچھا امی......میں پھر کال کروں گی۔ ابو جان اور وردہ کو سلام کہیے گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے بیٹا مجھے بھی سبزی بنانی ہے خوش رہو۔''

''اللہ حافظ۔'' اروی سلسلہ منقطع کر کے سوچ میں بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

سبرینہ اور انعم کی آپس میں کافی بنتی تھی۔ سبرینہ کا تعلق بھی انعم کے سسرال سے تھا۔ دونوں ہی اپنے معاملات ایک دوسرے سے کہہ دیتی تھیں۔ اب بھی سبرینہ کو انعم نے فون کر رکھا تھا۔

''ہاں بھابی! نئی دلہن کی کیا پروگریس ہے۔'' اپنی باتوں کے بعد انعم خاصی دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

''پروگریس تو بہت فاسٹ ہے نئی دلہن رانی کی، بہت ایفیشنٹ ہیں محترمہ، صبح ہی بی بی جان اور بابا کے کمرے میں چائے بنا کر پہنچ گئی۔''

''اچھا......!'' سبرینہ نے جس انداز میں چٹخارہ لیا تھا۔ انعم کا حیران ہونا بجا تھا۔

''مڈل کلاس لڑکیوں کو یہی داؤ پیچ تو سکھائے جاتے ہیں کہ جاتے ہی گھر کی تجوری کی دیکھ بھال شروع کر دو۔ چابیاں آپ کو خود بخود مل جائیں گی۔'' سبرینہ نے اپنے اندر کی بھڑاس نکالی۔ اُسے بھی بابا جان کا اروی کو خصوصی اہمیت دینا پسند نہیں آ رہا تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہیں آپ بھابی......پہلے وہ بی بی جان اور بابا جان کو مٹھی میں کرے گی اور پھر سارے گھر پر حکمرانی کی تمنا کو پورا کرے گی۔ میں حیران ہوں بی بی جان پر اپنے اصول بدل کر انہوں نے کیسے اُسے سینے سے لگا لیا۔'' انعم ہنوز اروی کے لیے کدورت محسوس کرتی اُس کے لیے زہر خند ہو رہی تھی۔

''سچی بات ہے حیران تو ہم بھی ہیں مگر بڑوں کے فیصلے ماننا ہمیں سکھایا گیا ہے۔ اسی لیے مجبور ہیں،

آپس کی بات ہے اصم کا اور اروی کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان جتنا فرق ہے۔ دیکھو کتنے دن نبھتی ہے۔"

"فائق کی امی بھی ولیمے والے دن یہی کہہ رہی تھیں کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند اچھا نہیں لگتا۔" دونوں نند بھاوج شروع ہوئی تھیں تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو شمو نے آکر دروازہ بجا کر ثمن کا پیغام دیا تھا۔ وہ اُسے کچن میں بلا رہی تھی۔

☆......☆......☆

رات کے کھانے کے وقت بی بی جان اپنا فیصلہ سنا رہی تھیں۔

"اصم...... تمہارے بابا جان اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم اور اروی کچھ دنوں کے لیے کہیں گھومنے پھرنے چلے جاؤ۔" یہ کوئی حیران کن فیصلہ نہیں تھا مگر سبرینہ کھانا کھانا چھوڑ کر قدرے حیرت سے منہ اٹھائے اصم کا جواب سننے کی منتظر سی تھی۔

"ہاں بچو! تم دونوں آپس میں مشورہ کر کے بتا دو کہ کہاں جانا چاہتے ہو۔ پھر سارا انتظام ہو جائے گا۔" شریح خان نے بھی اپنا فرض نبھایا۔

"مگر بابا...... جان...... نیا پراجیکٹ شروع ہوا ہے میری Presence بھی ضروری ہے ان دنوں میں۔"

اصم نے احساسِ ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا فرض نبھایا تو شریح خان کے چہرے پر متاثر کن نرمی بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔

"بیٹا جان...... آفس کی فکر نہ کرو ہم ہیں ناں یہاں...... تم اپنے لائف پراجیکٹ کو کچھ ٹائم دے دو، اس وقت یہ بے حد ضروری ہے۔" انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی تو اصم زیر لب مسکرایا۔

"ہاں اصم بابا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں میں اور شارم ہیں ناں پراجیکٹ دیکھ لیں گے اور تم کون سا مہینوں کے لیے جاؤ گے۔ چند ہفتوں کی ہی تو بات ہے۔" ضیغم بھائی نے بھی اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ سب بڑوں کی موجودگی میں وہ جھجک رہا تھا۔

بی بی جان اور بابا جان کے اپنے کمرے میں جانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے بھائی بھابیاں اور نیلم اپنے اپنے انداز میں مشورہ دے رہے تھے۔ جبکہ اروی شرم سے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

"ہم لوگ تو تھائی لینڈ گئے تھے۔ کافی انجوائے کیا تھا۔"

ضیغم نے اپنے تجربے کا اظہار کیا تو ثمن بھی تائیداً بولی۔

"بالکل! مجھے تو شاپنگ کرنے کا زیادہ مزا آیا تھا...... کافی چیزیں اوور بجٹ ہو گئی تھیں تو پتہ ہے ضیغم نے اپنی فیورٹ رولیکس ریسٹ واچ بیچ دی تھی۔" ثمن نے بڑی چاہت سے ماضی کی خوبصورت یاد دہرائی۔

اور جانتے ہیں...... رینا نے میرے ساتھ کیا کیا تھا؟" سبھی نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"پہلے تو پیرس جانے کی ضد کی وہاں جا کر ہر قسم کا پرفیوم خریدنے کا کریز ڈیلی میری ساری سیونگ چلی گئی تھی۔ محترمہ کی فرمائش پھر بھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اُلٹا واپسی پر ناراضگی بھگتنی پڑی۔" شارم بھی جیسے

اپنی شادی کے ابتدائی خوبصورت ایام کو موجودہ وقت میں محسوس کر رہا تھا۔

''بالکل جھوٹ...... ! ناراضگی تو آپ دکھا رہے تھے کہ میں نے اتنا کچھ خرید لیا۔ حالانکہ میں نے تو اپنی کتنی کزنز کے لیے گفٹس نہیں لیے تھے اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہوگئی تھیں۔''

''اصم بھائی آپ بھی تو کچھ بولیں۔ آپ کا کیا پلان ہے۔ کہاں جائیں گے آپ لوگ۔'' نیلم نے خاصی دلچسپی سے مداخلت کی۔ بی بی جان ہوتیں تو اس وقت اُسے بھائیوں، بھابیوں کے درمیان بیٹھنے نہ دیتیں۔

''پتہ نہیں ابھی ہم نے کچھ سوچا نہیں۔ میں اروی سے مشورہ کروں گا تو......'' اُس نے قدرے فاصلے پر بیٹھی اروی کو دیکھ کر کہا۔

سبرینہ جھٹ بولی۔ ''اروی بے چاری کو کیا پتہ اُس نے تو شاید اپنے شہر سے باہر بھی کبھی وزٹ نہیں کیا ہوگا۔ تم تو ورلڈ ٹور پر جا چکے ہو...... تم خود ڈیسائیڈ کرو کہاں لے جاؤ گے۔'' سبرینہ کا انداز معمول کا سا تھا مگر نجانے کیوں اروی کو محسوس ہوا تھا کہ وہ اُسے اُس کی کمتری جتا رہی ہیں۔

''تو ٹھیک ہے اُسے پہلے سوچنے تو دو...... آخر ہمیں معلوم ہو ہی جائے گا۔ بھئی اب محفل برخاست کرو۔ ورنہ بی بی جان صبح خفا ہوں گی۔ نیلم تمہیں بھی کالج جانا ہوگا۔'' ثمن کو یکدم وقت کا احساس ہوا تھا وہ سب کو تنبیہی کرتیں اٹھ گئیں۔ پھر بھی نے ثمن کی تقلید میں اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

سبرینہ اپنے کمرے میں آتے ہی منہ بنا کر بولی۔

''بی بی جان اور بابا جان زیادہ ہی امپورٹنس نہیں دے رہے اروی کو؟ پسند کی شاپنگ...... جیولری...... اب ہنی مون کا بھی خیال رکھا جارہا ہے۔''

بستر پر بیٹھ کر نیم دراز ہوتے شارم نے قدرے چونک کر بیوی کو دیکھا۔ وہ دوپٹہ ایک طرف پھینک کر اپنے بالوں میں برش کرتی واپس آئی تھی۔

''کیا مطلب ہے؟ تمہیں اور ثمن بھابی کو بھی اسی طرح امپورٹنس ملی تھی۔ بھول گئی ہو کیا۔'' شارم بیوی کا رویہ نہ سمجھتے ہوئے ذرا سنجیدگی سے باور کرا گیا۔

''ہمارے اور اروی کے فیملی بیک گراؤنڈ مین کتنا فرق ہے۔ ہمیں جہیز کے ساتھ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں رخصت کروا کر لایا گیا تھا۔ جبکہ اُس کی شادی میں تو گھر کے لوگ بھی شامل نہیں تھے۔ ہمارا اُس کے ساتھ کوئی مقابلہ ہے؟'' سبرینہ کا لہجہ ورویہ عجیب اور تحقیر آمیز ہوگیا تھا۔ شارم یکدم اٹھ بیٹھا۔

''یہ...... تم...... کس طرح بات کر رہی ہو؟ تمہیں حقیقت اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے۔ اور پھر تمہیں یہ بھی اندازہ ہے ہمارے ہاں لین دین کی اہمیت نہیں ہے صرف شرافت اور خاندان کو دیکھا جاتا ہے۔'' شارم کے رویے سے غصہ، افسوس اور سنجیدگی واضح تھی۔ اُسے بیوی کا یہ روپ یقیناً پسند نہیں آیا تھا۔

''اونہہ...... دیکھ تو آئے ہیں اُن کا خاندان...... اور اُن کا لائف اسٹائل...... عجیب ہی لوگ ہیں۔''

سبرینہ نخوت سے بولتی بال جھٹکتی ڈریسنگ ایریا کی طرف بڑھی۔

'I Dont Understand...... تمہیں پرابلم کیا ہے۔ وہ لوگ جیسے بھی ہیں یہ بی بی جان

اور بابا جان کا مسئلہ ہے یا اصم کا...... پلیز اپنی ان باتوں سے گھر کا ماحول مت خراب کر دینا۔'' شارم نے قدرے سنجیدگی سے تنبیہ کی تو وہ منہ بنا کر دوسری طرف آ بیٹھی۔ کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھی مگر جانتی تھی شارم اور باقی دونوں بھائی بھی اپنے گھر کے بارے میں کوئی بات سننا گوارہ نہیں کرتے۔ وہ اپنا سا منہ لے کر لیٹ گئی۔ شارم نے بھی اُس سے مزید بات نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

''ہاں بھئی...... کیا پلاننگ ہے کہاں جانا چاہتی ہو۔'' اصم اُسے سامنے بیٹھائے بڑی لگاوٹ سے پوچھ رہا تھا۔

''مجھ...... میری تو کوئی پلاننگ نہیں ہے۔ مجھے بالکل بھی شوق نہیں ہے گھومنے پھرنے کا۔'' وہ ذرا جھجک کر بولتی اصم کو حیران کر گئی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے لڑکیوں نے تو بہت پروگرام بنائے ہوتے ہیں کہ شادی کے بعد گھومیں گی پھریں گی۔ ہر وہ کام کریں گی جنہیں پیرنٹس کے گھر میں کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔'' اصم نے اُسے بولنے پر اُکسایا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا اور پھر ہمارے ہاں تو ہنی مون کا نام لینے والوں کو ہی بے شرم سمجھا جاتا ہے۔'' وہ جھجک کر بتا رہی تھی اور شرمندہ ہو رہی تھی کہ اصم نجانے کیا سوچتا ہوگا۔

''اچھا......؟ اس میں بے شرمی والی کیا بات ہے۔ دو بندوں کی شادی ہوتی ہے انہیں ایک ساتھ وقت گزارنا چاہیے۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ اب دیکھو نا...... میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ ٹائم Spend کروں۔ مگر یہاں گھر والوں کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ چلتے ہیں کہیں...... اچھا لگے گا تمہیں...... بلکہ پھر تم فرمائش کیا کرو گی کہ ایسا وقت پھر گزارا جائے۔''

اصم کے رومانوی لہجے کی حدت سے اروئ کی خواہشات بھی پگھلنے لگی تھیں۔

''ٹھیک ہے...... آپ کی خواہش ہے تو...... مگر پلیز سب کے سامنے ڈسکس مت کریں۔ مجھے شرم آتی ہے۔'' وہ اُس کی جانب دیکھ کر فوراً نظریں جھکا گئی تو اصم ہنس دیا۔

''تم آج کے دور کی لڑکی نہیں لگتی ہو۔ آج کل تو شادی سے پہلے بچوں تک کی پلاننگ کر لیتے ہیں کہ کتنے بچے ہونے چاہئیں۔''

''ہا...... ں......!'' اُس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''شا...... دی سے پہلے ہی......؟'' اروئ کی حیرانی اصم کو مزید حیران کر گئی۔

''یار...... تم فلمیں ڈرامے نہیں دیکھتی ہو؟''

''دیکھتی ہوں...... مگر حقیقت کی دنیا میں ایسا کب ہوتا ہے۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے ڈیئر...... اب تو اسکول گرلز کو بھی Awareness ہوتی ہے۔ تم نے کہاں لائف گزاری ہے۔'' اصم کا انداز ہلکا پھلکا چھیڑنے والا تھا۔

''پلیز بھابیوں کے سامنے اپنی کم علمی ظاہر مت کر دینا ورنہ بہت مذاق بنے گا۔''

اروئ کو اُس کی چھیڑ چھاڑ سے بھی اچانک گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ وہ تو بالکل مختلف سوچ کی مالک لڑکی تھی اور اصم

کی توقعات...... کیا وہ اصم کی توقعات پر کبھی پورا اُتر سکے گی؟ سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ بھر آئی۔
''سوری اصم! میں نے شاید آپ کو مایوس کیا ہے۔ میں آپ کے قابل ہی نہیں ہوں۔'' وہ نہ صرف روہانسی ہوکر بول رہی تھی بلکہ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بھی برسنے لگے تھے۔ کتنا تکلیف دہ احساس تھا کہ ایک تو آپ دوسرے کی زندگی میں اَن چاہے موسم کی طرح چلے آئیں اور پھر اپنے مزاج و کم علمی سے اُسے زچ بھی کرتے ہوں۔ اروی کو لگ رہا تھا اصم اُس کی وجہ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے۔
''ارے...... یار...... Once Again Really مجھے خود سمجھ نہیں آتی کہ میں ایسا کیا کہتا ہوں جو تمہیں رُلا دیتا ہے۔'' اصم کے چہرے پر مدھم سی جھنجلاہٹ کا تاثر نمایاں ہوکر معدوم ہوا تھا۔
''مجھے دُکھ ہوتا ہے آپ کو ویسی شریکِ سفر نہیں ملی جیسی آپ چاہتے تھے۔ امی اور بابا نے تو ہماری تربیت ایسی ہی کی۔ زمانے میں کیا کیا رائج ہو چکا ہے ہمیں اُس طرف دھیان ہی نہیں دینے دیا۔'' وہ آنسو پونچھتی وضاحت سے بولی۔
''تو اچھا کیا ناں...... زمانے کا چلن دیکھ کر خود کو بدلنا سودمند نہیں ہوتا۔ اینی وے میری بھی تم سے کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے تم جیسی بھی ہو بائے گاڈ تمہیں دل و جان سے قبول کر چکا ہوں۔ کہو تو لکھ کر دے دوں۔'' سنجیدگی سے بولتے بولتے اصم نے پھر سے لگاوٹ کا اظہار کیا تو اروی مزید شرمندہ سی ہوئی۔
''ہنی مون کا معاملہ تو درمیان میں ہی رہ گیا۔ او کے میں خود ڈیسائیڈ کر لیتا ہوں کہ ہمیں کہاں جانا چاہیے۔ ہم...... ہم موریشس چلتے ہیں، بہت خوبصورت آئی لینڈ ہے۔ تمہیں بھی پسند آئے گا۔'' اصم نے فیصلہ سنایا تو اروی بھی مطمئن ہوگئی۔ اصم پھر کافی دیر تک اُسے سمجھاتا رہا۔ اپنی محبت کا احساس بخشتا رہا۔

☆......☆......☆

فائق آفس سے ابھی واپس آیا ہی تھا۔ انعم پہلے سے اپنے گھر جانے کے لیے تیار تھی۔
''فائق...... آپ نے آنے میں پھر دیر کر دی۔ آپ کو معلوم تھا ناں کہ مجھے بابا جان کے گھر جانا ہے۔'' وہ کسی کا بھی موڈ دیکھے بغیر اپنی کہنے اور منوانے کی عادی تھی۔
''سوری میں تھکا ہوا ہوں۔ آج جانا کینسل کر دو۔'' فائق نے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے سنجیدگی و بیزاری سے کہا تو انعم سمجھ کر نہ سمجھتے ہوئے تقریباً چیختی ہوئی سامنے بیٹھ گئی۔
''کیا مطلب؟ میں جانا کینسل کر دوں؟ فائق میں نے دو دن پہلے آپ سے کہہ دیا تھا کہ مجھے آج جانا ہے اور ضرور جانا ہے۔ پلیز تھکن کا بہانہ چھوڑیں اور اٹھیں۔'' انعم نے آگے ہوکر اُس کا بازو پکڑ کر متوجہ کیا تو فائق یکدم سیدھا ہوکر مزید چڑچڑاہٹ سے بولا۔
''ایک بار کہہ دیا ہے ناں آج نہیں جا سکتا میں...... تمہیں اتنا ہی جانے کا شوق ہے ناں تو ایک دفعہ ہی وہاں جا کر رہ لو...... میں روز روز یہ ڈیوٹی نہیں دے سکتا۔ او کے۔'' وہ صوفے سے اُٹھ کر چینج کرنے کے لیے بڑھ گیا۔
اپنی طرف سے اُس نے بات ختم کر دی تھی۔
''اچھا! میری ذمہ داری اب بوجھ لگنے لگی ہے۔ شادی کیوں کی تھی اگر یہ سب کرنا تھا۔ دوستوں کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے آدھی آدھی رات تک باہر رہتے ہوئے تھکن نہیں ہوتی۔ میرے آنے جانے

پر تمہیں ہمیشہ سے اعتراض ہے۔'' انعم تقریباً چیخ اٹھی تھی۔
اُس کی آواز ساس سسر کے کمرے تک بھی پہنچی تھی۔ صالحہ درانی فوراً ہی جائے نماز سے اُٹھ کر اُن کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ بلال درانی بھی عشاء کی نماز کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اُن کے آنے سے پہلے وہ چاہتی تھیں دونوں کا جھگڑا نمٹ جائے۔
''جاہل عورتوں کی طرح مجھ پر چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے بھائیوں کی طرح عورتوں کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھنے کی عادت نہیں مجھے، یہ بات میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھا دی تھی۔'' فائق خاصی ناگواری سے اُسے دیکھتا، بولتا کپڑے بدل کر نکلا تھا۔
میرے بھائیوں کو اپنی بیویوں کے حقوق پتہ ہیں۔ وہ وقت گزاری نہیں کرتے۔ پورے مان اور عزت سے اپنا رشتہ نبھا رہے ہیں اور یہ تو تربیت کی بات ہے کہ وہ گھر میں سکون تلاش کرتے ہیں۔ باہر محفلیں نہیں سجاتے۔'' اُس نے بھی دو بدو جواب دیا اُسی لمحے صالحہ درانی بھی بوکھلائی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئیں۔
''بکواس مت کرو...... اپنی تربیت کے بارے میں بہت خوش فہمی ہے تمہیں...... تمہیں شوہر سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں سکھائی گئی۔'' فائق بپھر کر دھاڑ کر اُس کی طرف جارحانہ انداز میں بڑھا ہی تھا کہ درمیان میں صالحہ درانی آ گئیں۔
''فا...... ئق...... یہ کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا......؟'' صالحہ نے بیٹے کو ڈپٹ کر احساس دلانے کی کوشش کی تو وہ مزید غصے سے بولا۔
''ہوا تو نہیں ہوں مگر یہ مجھے پاگل کر کے چھوڑے گی۔ اسے اپنے ماں باپ کے گھر رہنے کا اتنا ہی شوق تھا تو شادی کیوں کروائی تھی۔''
ساس کی آمد و مداخلت پر انعم ٹھٹک کر جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ فائق کا اٹھا ہوا ہاتھ اُسے شاک گزرا تھا۔
''مجھے پتہ ہوتا یہاں میرے ساتھ ایسا سلوک ہوگا تو میں کبھی شادی نہ کرتی۔''
انعم رونے لگی تھی۔ صالحہ درانی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پہلے بھی دونوں کے جھگڑے کی وجہ سے انعم کا مس کیرج ہو چکا تھا۔
''فائق...... انعم آخر ہوا کیا ہے۔ بیٹا آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔'' انہوں نے انعم کا بازو تھام کر نرمی سے بولتے ہوئے بیڈ پر بٹھانے کی کوشش کی تو اُس نے اُن کا ہاتھ جھٹک دیا۔
''بس رہنے دیں یہ ہمدردی...... آپ بھی اپنے بیٹے کی ہی فیور کرتی ہیں۔ آپ کا بیٹا چاہے آدھی آدھی رات تک باہر رہے کوئی پوچھتا ہی نہیں...... اور...... میرے بابا جان کے گھر جانے پر ہی سوال جواب شروع ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے آئندہ میں بھی خود ہی چلی جایا کروں گی۔ آخر میری بھی گاڑی ہے۔''
انعم بڑے غصے میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھی دراز سے اپنی جہیز میں ملی گاڑی کی چابی نکال کر پلٹی تو فائق نے اُسے دھمکایا۔
''دیکھو اگر تم اپنی مرضی سے جاؤ گی تو پھر یاد رکھنا۔ میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا۔''

''انعم...... بیٹا تمہیں اپنے گھر جانا ہے تو تمہارے ابو آتے ہیں تو وہ چھوڑ آتے ہیں۔ تمہارا اس طرح تنہا جانا مناسب نہیں ہے۔'' صالحہ نے مصلحت آمیزی سے سمجھایا تو فائق چڑ کر بولا۔

''جانے دیں امی...... اس کے بھی گھر والوں کو پتہ چلے کہ اُن کی بیٹی کس قدر خودسر اور خودغرض ہے۔ جسے شوہر کے آرام و تھکن کا خیال ہی نہیں۔''

''ہا...... ں...... انہیں یہ بھی پتہ چلے گا کہ میرا بھی کسی کو خیال نہیں ہے۔ میں اب تک خاموش تھی تو صرف اُن کی وجہ سے مگر اب نہیں...... سب کو بتاؤں گی کہ میں نے کیسے گزارا کیا ہے۔''

وہ تو بول کر کمرے سے نکل گئی۔ فائق بھی غصے اور جھنجلاہٹ میں بستر پر جا بیٹھا۔ صالحہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھیں۔ بیٹے کو اُسی کیفیت میں مخاطب کیا۔

''فا...... ئق غصے کے بجائے ذرا ہوش سے کام لو...... تم دونوں کی ناسمجھی سے پہلے بھی تمہارے بچے کا نقصان ہو چکا ہے۔ پھر بھی تم دونوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ جاؤ اُسے اِس کی ماں کے گھر چھوڑ آؤ۔''

''امی! آپ نے بھی ناعجیب مصیبت میرے گلے ڈالی ہے۔ میری اپنی کوئی پرسنل لائف ہی نہیں ہے۔ ہر وقت آپ کی بہو کے اشاروں پر نہیں چلا جاتا۔'' وہ جھلا کر بے دلی سے اُٹھ کر سینٹرل ٹیبل سے گاڑی کی چابی اپنا موبائل اور بٹوا اٹھانے لگا۔

''فا...... ئق تم ابھی تو جاؤ...... ہم اس بارے میں بات پھر کریں گے۔'' صالحہ درانی نے بڑی سنجیدگی سے باہر دھکیلا۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا لگنے میں کچھ وقت تھا۔ ثمن اور سبرینہ حسب معمول کچن میں مصروف تھیں۔ جبکہ بی بی جان کے پاس اروی بیٹھی ہوئی تھی۔ بی بی جان نے فی الحال اُسے کچن کے کام سے روک دیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں وہ موریشس سے واپس آ کر ہی کھیر پکوائی کی رسم کے بعد باقاعدہ گھر داری میں شامل ہو۔

''اروی! بیٹی تم نے سفر پر جانے کی تیاری تو کر لی ہے نا...... اپنی اور اصم کی ضروری چیزیں پیک کر لی ہیں؟''

''جی بی بی جان...... نیلم نے میری مدد کی تھی۔ اُسی کے مشورے سے میں نے ڈریسز وغیرہ رکھے ہیں۔''

''نیلی کو کیا معلوم...... کہ......'' وہ کچھ کہتے کہتے یکدم چپ کر گئیں۔ اروی انہیں ناسمجھی سے دیکھتے ہوئے سننے کی منتظر تھی۔

''میرا مطلب ہے بیٹا کہیں اُس کے مشورے سے زرق برق ملبوسات مت رکھ لینا۔ وہاں گھومنا پھرنا ہوگا اُسی حساب سے کپڑے رکھنا۔'' بی بی جان اُسے برملا نہ جتا سکیں اُن کے ذہن میں کہیں یہ بات ضرور تھی کہ اروی کا تعلق جس طبقے سے ہے، وہاں موقع کی مناسبت سے پہننے اوڑھنے کا شعور بہت کم ہوتا ہے۔

اس سے پہلے اروی کچھ کہتی نیلم اپنے کمرے سے نکل کر آ گئی وہ اُن کی بات سن چکی تھی تبھی ذرا خفگی ولاڈ سے بولی۔

''بی بی جان آپ مجھے ناسمجھ سمجھتی ہیں؟ میں بھابی کو کوئی ایسا مشورہ دے سکتی ہوں؟ اور پھر اروی بھابی

خود بھی سمجھدار ہیں، انہیں معلوم ہے کس موقع پر کیا پہننا ہے۔ ہم نے کچھ بھی غیر ضروری پیک نہیں کیا۔'' وہ وضاحت سے جواب دیتی اُن کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

''بے شک میری بچیاں سمجھدار ہیں مگر بڑوں کا سمجھانا بھی تو فرض ہے۔'' بی بی جان نے قدرے سنجیدگی ورسانیت سے کہا۔ تو اروی تائیداً بولی۔

''بالکل بی بی جان بڑوں کی رہنمائی سے ہی ہم بہت سے مسائل سے بچ جاتے ہیں۔'' بی بی جان نے اُس کے جواب پر اُسے توصیفی نظروں سے دیکھا۔ انہیں پھر سے اپنی سوچ پر ذرا سی خجالت ہوئی۔ اروی اُن کے اندازوں کو اول روز سے غلط ثابت کرتی انہیں متاثر کرتی چلی جا رہی تھی۔

یہ تو بچوں کی بھی سعادت مندی ہے کہ وہ بڑوں کی رہنمائی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اچھا بھئی کھانے کا وقت ہے جاؤ اصم کو بلا لاؤ۔ اور نیلی تم اپنے بابا جان کو کہو آ جائیں۔'' بی بی جان نے بھی سراہتے ہوئے نرمی سے مخاطب کیا۔

تو اروی 'جی اچھا' کہتی اُن کے پاس سے اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف کاریڈور میں بڑھ گئی اور نیلم بابا جان کے کمرے کی طرف......

☆......☆......☆

فائق نے زبردستی اُسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کیا تھا۔ انعم گیراج میں کھڑی اپنی جہیز میں ملنے والی گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب غصے و جھنجلاہٹ میں آ کر اُسے بازو سے پکڑ کر باہر نکالا اور تقریباً کھینچتا ہوا اُسے پورچ میں لے آیا۔

''میری بات سنو! یہاں تماشہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں تمہیں چھوڑنے...... میری طرف سے تمہیں کھلی چھوٹ ہے۔ تم بے شک ساری عمر وہیں رہو۔'' فائق نے دانت بھینچ کر جیسے اپنے اندر ابلتے غصے کو روکا تھا۔ انعم نے نخوت سے سر جھٹکا۔

''اچھا...... ٹھیک ہے۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہاری پابندیاں سہنے کا۔''

''بے فکر رہو جلد ہی تم پر سے ہر پابندی ختم کر دوں گا۔'' گاڑی سڑک پر دوڑاتے ہوئے فائق نے قہر بھری نظر اُس پر ڈالی تھی۔

''اُس دن کا میں بھی انتظار کروں گی۔ اور پھر شکر ادا کروں گی کہ...... تم جیسے انسان سے میری جان چھوٹی۔'' غصے و ضد میں انعم کو احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کیا بول رہی ہے۔

''شکر تو میں ادا کروں گا۔ جینا حرام کر رکھا ہے میرا...... جس دن سے شادی ہوئی ہے ایک دن بھی سکون سے نہیں گزرا میرا۔'' ڈرائیو کرتے ہوئے اُس نے پوری رفتار سے موڑ کاٹا تھا۔ انعم کا سر جھٹکا کھا کر ڈیش بورڈ پر لگا تھا۔ تکلیف و غصے سے وہ بلبلا اٹھی تھی۔

''میں تو بہت چین سے رہی ہوں نا تمہارے ساتھ...... تم اور تمہاری ماں......'' فائق نے بیچ سڑک پر یکدم گاری کو بریک لگائی۔

''خبردار...... خبردار......! اگر میری ماں کے بارے میں کچھ کہا۔ انہی کی وجہ سے میں تمہیں اب تک برداشت کرتا رہا ہوں ورنہ......'' فائق نے اُسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

''ورنہ...... ورنہ کیا...... بولو...... ورنہ کیا......؟ چھوڑ دیتے تبھی...... تمہیں کس نے مجبور کیا تھا۔ اسی لیے تم نے پہلے بھی میرے بچے کو قتل کیا تھا اور اب...... اب میں واپس نہیں آؤں گی۔ یاد رکھنا۔'' وہ بھی طیش میں بول رہی تھی۔

''فائق بچے کے ذکر پر قدرے سنبھل کر چپ ہو گیا تھا۔ وہ دونوں کے جھگڑے میں اپنے آنے والے بچے کو تو بھول ہی گیا تھا۔

باقی کا راستہ فائق نے خاموشی اور انعم نے روتے بڑبڑاتے اُسے زچ کرتے گزارا۔ اور پھر وہ اُسے گیٹ کے باہر ہی اُتار کر چلا گیا۔ انعم بھی جوش و غصے میں بیل بجاتی دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ اگلے ہی پل دروازہ کھلا اور وہ اندر بڑھ گئی۔

بی بی جان اروی اور نیلم کو بھیج کر خود بھی اُٹھ کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھنے ہی لگی تھیں کہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر بہت بے قراری کے ساتھ انعم بچوں کی طرح روتی بلکتی اندر آئی تھی اور پھر آنسوؤں کے ساتھ انہیں بہت کچھ سناتی انہیں حیران پریشان کرتی اُن کے گلے سے لگی کھڑی تھی۔

انعم کی اس طرح اچانک آمد اور پھر چیخ و پکار انہیں بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی۔ انعم کا رونا پیٹنا سن کر ثمن اور سبرینہ بھی کچن سے نکل کر آگئی تھیں۔ ضیغم اور شارم بھی کھانے کے لیے آئے تھے وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر کچھ فاصلے پر ششدر سے کھڑے تھے۔ بابا جان اور نیلم بھی انعم کے رونے کی آواز پر ڈائننگ روم سے پلٹ کر آئے تھے۔

اصم اور اروی بھی ٹھٹک کر کھڑے تھے۔ بی بی جان ساری صورتِ حال سے قدرے بوکھلائی جھنجلائی سی تھیں۔

انعم رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔

''وہ...... شخص دو سال سے میرے ساتھ کچھ بھی کرتا رہا مگر آپ میں سے کسی نے نہیں پوچھا...... وہ مجھے لاوارث سمجھتا ہے۔ اسی لیے تو اُس کی یہ جرأت ہو گئی۔

انعم کا رونا بلکنا اتنا شدید تھا کہ سبھی کا دل کسی انہونی کے خوف سے لرزنے لگا تھا۔

''انعم...... ہوا کیا ہے؟ آرام سے بیٹھ کر بتاؤ...... فائق کہاں ہے؟ کس کے ساتھ آئی ہو تم۔'' بمشکل بی بی جان کے حواس بحال ہوئے تھے۔ اب سے پہلے انہوں نے ایسی صورتِ حال دیکھی نہ تھی۔ انہوں نے انعم کو خود سے الگ کرتے ہوئے قریبی صوفے پر بٹھایا۔

''وہی چھوڑ کر گیا ہے۔ کہتا ہے اب ہمیشہ کے لیے 'یہیں' رہو۔'' وہ سسکی روک کر بولی۔ اُس کے تسلسل سے بہتے آنسو پریشان کن تھے۔

''کہ...... کیا...... مطلب...... تم اس سے جھگڑا کر کے آئی ہو؟'' بی بی جان کو مزید جھٹکا لگا تھا۔

''جھگڑا کر کے میں نہیں آئی...... ہمیشہ وہ میرے یہاں آنے پر جھگڑتا ہے مجھ پر پابندیاں لگاتا ہے۔ بس بی بی جان میں اب اور نہیں سہوں گی۔'' انعم نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ کسی کو بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کہے...... کیا کرے انعم خود پسند بھی تھوڑی ضدی تھی یہ بات تو سبھی جانتے تھے۔ مگر جتا نہیں سکتے تھے۔ ابھی معاملہ بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''انعم...... ابھی تم اپنے کمرے میں جاؤ...... فریش ہو کر آؤ کھانا تیار ہے۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔'' بی بی جان نے اُسے سنجیدگی سے ٹوکا تھا۔

اُن کے ذہن میں اروی کی موجودگی کا احساس مسلسل کھٹک رہا تھا۔ کچھ دنوں کی دلہن کے سامنے انعم کی اپنے شوہر کے لیے بدگمانی انہیں اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ انعم نے اُن کی سنجیدگی پر پہلے انہیں دیکھا پھر یکدم ہی وہ وہاں سے اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

''ثمن...... انعم کا کھانا اُس کے کمرے میں بھجوا دو۔'' بی بی جان کی سنجیدگی نے سبھی کو چونکا دیا تھا۔ ثمن نے سعادت مندی سے سر ہلا کر کہا۔

''جی اچھا بی بی جان......'' جبکہ سبرینہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''بی بی جان! انعم پہلے ہی پریشان آئی ہے۔ اُس سے پوچھیں تو سہی کہ مسئلہ کیا ہے؟ اس طرح کمرے میں کھانا بھجوائیں گے تو وہ مزید ہرٹ ہوگی اور......!''

''ضروری ہے کہ وہ کچھ دیر تنہا رہے...... بہر حال کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہوگا آئیں سب۔'' بی بی جان نے جس انداز میں بات کی تھی پھر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ سبھی جانتے تھے بی بی جان گھریلو معاملات کو اپنے حساب سے سنبھالتی ہیں۔

سب خاموشی سے اُن کی تقلید میں ڈائننگ روم کی طرف بڑھے۔ گھر کی فضا ایکدم بوجھل ہو گئی تھی۔ کسی نے بھی ٹھیک طرح کھانا نہیں کھایا۔ اروی بھی عجیب سی کیفیت میں تھی۔ انعم کا اس طرح رونا بلکنا اُسے تکلیف دے رہا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ انعم سے اُس کا دکھ پوچھے۔ مگر اُسے ڈر بھی تھا کہ اُس کی ہمدردی کو انعم کوئی غلط رنگ نہ دے۔

کھانا ختم ہوا تو بی بی جان سب سے پہلے اُٹھ گئیں۔ یقیناً انہیں بیٹی کی فکر بھی تھی۔ اصم اور اروی کو انہوں نے آرام کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اروی کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ انعم کے معاملے میں اُس کی موجودگی کو مناسب نہیں سمجھ رہیں۔ وہ کمرے میں آ کر بھی اسی حوالے سے سوچتی رہی۔ البتہ اصم اپنے معمول کے موڈ میں تھا۔

☆......☆......☆

صالحہ درانی پریشان سوچوں میں گھریں فائق کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ شوہر بلال درانی کو تو انہوں نے انعم کی ناراضگی و غصے کا نہیں بتایا تھا۔ انہیں ڈر تھا فائق غصے میں انعم کو کچھ اُلٹا سیدھا نہ بول دے جس کا خمیازہ بعد میں بھگتنا پڑے۔

فائق کی گاڑی کی آواز پر وہ لاؤنج سے پورچ میں چلی آئیں۔ فائق غصے میں بھرا اندر آ رہا تھا۔ ماں کو دیکھتے ہی بولا۔

''آج اُس نے اپنی ضد منوالی ہے نا...... آئندہ اُسے واپس لانے کی بات مت کیجیے گا۔''

اُسے اندر بڑھتے دیکھ کر صالحہ نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں سمجھایا۔

''آہستہ بولو...... تمہارے ابو کو تم دونوں کے جھگڑے کی خبر نہیں ہے۔''

''کب تک آپ ابو سے چھپائیں گی۔ انہیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اُن کے دوست کی بیٹی کا مزاج و

رو یہ دراصل کیا ہے۔ پتہ نہیں کہاں پھنسا دیا ہے آپ لوگوں نے مجھے۔'' دانت بھینچ کر بولنے کے باوجود اُس کی آواز اُس کا غصہ بہت نمایاں تھا۔

''ہم نے پھنسادیا ہے؟ تمہاری مرضی سے شادی کی تھی۔'' صالحہ نے بھی قدرے غصے سے بیٹے کو باور کرایا۔

''تم نے بھی تو اُسے پسند کرلیا تھا۔ سبرینہ کی شادی میں ہی تم نے تو ناک میں دم کردیا تھا کہ ہم اُس کا پروپوزل لے کر جائیں...... آج سارا الزام ہمارے سرمت رکھو۔''

''مجھے کیا پتہ تھا بظاہر خوش اخلاقی کا پیکر نظر آنے والی اس قدر برے مزاج کی ہوگی۔ تنگ آگیا ہوں میں اُسے برداشت کرتے کرتے...... اُسے تو میرا دوستوں سے ملنا جلنا پسند نہیں ہے اور خود...... اپنی ماں کی گود کے لیے ہمکتی رہتی ہے۔ بس میں نے صاف کہہ دیا ہے امی آپ کو اب رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں نہ رابطہ کروں...... زبدہ بھابی کو بتاؤں گی تو سہی کہ اُن کی بیٹی نے شوہر کے ساتھ میرا جینا بھی دوبھر کررکھا ہے۔ ایک دن بھی اُس نے جو گھر کی ذمہ داری کو سمجھا ہو۔''

''جو مرضی کیجیے مگر میرے ساتھ اُسے واپس لانے کی بات مت کیجیے گا۔'' فائق نے فیصلہ کن انداز میں بات ہی ختم کردی۔ اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ صالحہ درانی بھی فی الحال انعم سے کبیدہ تھیں۔ انہیں فائق کا غصہ جائز لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

بی بی جان، انعم، ثمن اور سبرینہ انعم کے کمرے میں بیٹھے اُس کی شکایتیں سن رہے تھے۔ جو اُسے فائق اور صالحہ سے تھیں۔ فائق کا ہر دوسرے دن میکے آنے کی فرمائش کو رد کرنا اور صالحہ کا گھر کے معاملات میں ذمہ داری کا احساس دلانا انعم کے نزدیک بہت بڑا ظلم تھا۔

''میں تمہیں پہلے بھی سمجھاتی رہی ہوں انعم کہ شوہر کا موڈ دیکھ کر بات کیا کرو۔ وہ جب کہہ رہا تھا کہ کل یہاں لے آئے گا تو تم کل آجاتیں۔'' بی بی جان نے اُس کی شکایتیں سن کر ایک بار پھر اُسے سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بی بی جان...... یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا وہ ہمیشہ ہی میرے یہاں آنے پر اسی طرح میرے ساتھ جھگڑتا ہے۔ یہ تو میں نے کسی کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔'' انعم نے ایک بار پھر آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔

''تو انعم تمہیں پہلے ہی بتانا چاہیے تھا کم از کم مجھے تو بتاتیں میں فائق سے خود پوچھتی کہ اُسے تمہارے یہاں آنے پر کیوں اعتراض ہے۔'' سبرینہ اور فائق کی والدہ میں رشتے داری تھی۔ تبھی وہ مداخلت کررہی تھی۔ کیونکہ انعم کا رشتہ اُسی کے توسط سے آیا تھا۔

''پہلے بتانے پر بھی میری بات کوئی مانتا؟'' اُس نے بی بی جان کو قدرے بدگمانی سے دیکھا جو کہ اُن کو برا لگا۔

'یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے انعم...... جس کو مسئلہ بنا کر تم نے ہنگامہ کھڑا کردیا ہے۔ مرد کو گھر سے باہر سو بکھیڑے نمٹانے ہوتے ہیں۔''

''پتہ نہیں کب وہ کس اُلجھن میں ہو۔ بیوی اُس کا مسئلہ اور تھکن کا خیال نہیں کرے گی تو کون کرے گا؟ بہر حال میں صالحہ بہن سے صبح بات کروں گی۔ وہ فائق کو سمجھائیں گی فکر نہ کرو اُس کا غصہ اُترے گا تو آ جائے گا۔'' بی بی جان نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی تھی۔

اس لیے انہوں نے اپنی نشست سے اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''بی بی جان...... وہ اگر ایا بھی تو میں اب اِس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' انعم نے جس طرح چیخ کر اپنی بات کہی تھی اُس پر بی بی جان کے پاؤں تو وہیں جم سے گئے تھے۔ ثمن اور سبرینہ بھی ششدر سی اُسے دیکھ رہی تھی۔

آج تک بی بی جان سے کسی نے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ چند لمحے بی بی جان کو خود کو سنبھالنے کے لیے لگے تھے۔

''انعم میں مسلسل تمہاری بدتمیزی برداشت کر رہی ہوں۔ تم اپنے شوہر کو بھی اسی طرح زچ کرتی ہو گی۔ خبردار آئندہ تم نے فائق کو اس لہجے میں مخاطب کیا۔''

''یاد رکھو اصم کی بیوی کے سامنے بلاوجہ کے رونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بی بی جان کو پہلی بار کسی نے اس طرح غصے میں دیکھا تھا۔ سبرینہ کا رنگ بھی متغیر ہوا تھا۔ ثمن بھی گھبرا کر اُن کی طرف بڑھی۔

''بی بی جان...... بی بی جان...... آپ چل کر آرام کریں۔ میں انعم کو سمجھاتی ہوں۔''

''ہاں اسے سمجھا دو...... ہم بیٹیوں کی بے جا حمایت کرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔'' بی بی جان تو کہہ کر نکل گئیں۔ انعم کا رونا پیٹنا...... اپنی ضد پر ڈٹے رہنے کا عزم ثمن اور سبرینہ کو فی الحال اُسے اس کے حال پر چھوڑنے پر مجبور کر گیا۔

☆......☆......☆

اصم کب سے اپنی باتیں کر رہا تھا مگر اروی ذہنی طور پر حاضر نہیں تھی۔ وہ مسلسل انعم کو سوچ رہی تھی کہ بالآخر اُس کے شوہر نے اُسے ایسا کیا کہا جو وہ رات کو اس طرح روتی بلکتی آئی تھی۔

اصم کو اچانک اروی کی عدم توجہی کا احساس ہوا تھا۔

''اروی...... کہاں گم ہو...... میں نے کچھ پوچھا تھا؟'' اروی یکدم چونک کر شرمندہ سی ہوئی۔

''کیا......؟ پو...... چھا...... تھا...... سوری میں سن نہیں پائی۔''

''میرا خیال ہے تم تو کچھ بھی نہیں سن رہی تھیں۔'' وہ قدرے خفگی سے بولا تو وہ مزید شرمندہ ہو کر پریشانی سے بولی۔

''سوری...... دراصل میں...... انعم کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ......''

''کیا سوچ رہی تھیں؟'' اصم کی سنجیدگی برقرار تھی۔

''یہی کہ فائق بھائی نے اُسے پتہ نہیں کیا کہا ہو گا جو وہ اس طرح۔''

''کچھ نہیں کہا ہو گا۔ انعم ہی کبھی کبھی بلاوجہ ضد دکھا جاتی ہے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دونوں کل ہی اپنی اپنی ناراضگی بھلا دیں گے۔'' اصم نے اپنی طرف سے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ اندر سے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھی۔

''اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ گھر کے لوگ اور شاید اصم بھی اُس پر مکمل اعتماد نہیں رکھتے تبھی اُس سے انعم کے معاملے کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔''

''ہوں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میری امی بھی یہی کہتی ہیں کہ میاں، بیوی کے درمیان ناراضگی دیر پا نہیں رہتی...... دونوں کے درمیان تعلق ہی ایسا ہوتا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔''

اروی نے اگلے ہی لمحے اپنی سوچ ظاہر کیے بغیر اصم کی تائید کی وہ بھی ہنس دیا۔

''بالکل...... یہ تو تجربے کی بات ہے۔ ہم تو ابھی سیکھنے والوں میں سے ہیں۔ او کے...... کل تم ثمن یا سبرینہ بھابی کے ساتھ بیوٹی سیلون کا وزٹ کرلو۔''

''وہ...... کس لیے۔'' اروی نے جس ناسمجھی سے پوچھا تھا۔ اصم کو قدرے جھنجلانے پر مجبور کر گیا۔

''ا...... رے...... یا...... ر! خواتین بیوٹی پارلر میں کس لیے جاتی ہیں۔ ہمارا پندرہ دن کا ہنی مون پریڈ ہوگا۔ ری فریش نیس کے لیے کچھ ٹریٹمنٹ ضروری ہیں کہ نہیں۔''

''ٹھیک ہے...... مہ...... میں چلی جاؤں گی۔ آپ خفا تو نہ ہوں۔'' اروی پھر سے شرمندہ ہوئی۔

''میں خفا نہیں ہو رہا...... بس تمہاری معصومیت کبھی کبھی کنفیوژ کر دیتی ہے۔ یار اب تو کچھ سیکھ لو۔'' اصم کو اُس کا شرمندہ ہونا بھی اچھا نہیں لگتا تھا اس لیے فوراً ہی نرمی سے سمجھانے لگا۔

''سیکھ تو رہی ہوں آپ سے...... بہت جلد آپ کی شکایت دور ہو جائے گی۔ پھر آپ ہی کہیں گے کہ 'یہ تم ہو......'' اروی نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں اُس کے موڈ کو بدلنے کی مزید کوشش کی۔

''میں اُس دن کا انتظار کروں گا......'' اصم نے بھی شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے اُسے چھیڑا۔ تو وہ چہرے کے سامنے تکیہ کر کے اُس سے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆......☆......☆

بی بی جان اپنے کمرے میں آئیں تو انہیں دیکھتے ہی شریح خان نے قدرے بے چینی سے استفسار کیا۔

''کیا ہوا؟ انعم اس قدر کیوں رو رہی تھی۔ خیریت ہے نا۔'' شریح خان کو دونوں بیٹیوں سے خاص اُنس تھا۔ وہ دونوں کو ہی اُداس و مغموم نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''ہا...... ں...... جی سب خیریت ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے وہ جس حال سے ہے۔ ایسی حالت میں پل پل طبیعت بدلتی ہے۔'' بی بی جان نے قدرے چونکتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔ پھر اُن کی تسلی کرائی تھی۔

''مگر وہ تو کہہ رہی تھی کہ فائق جھگڑ کر چھوڑ گیا ہے۔ زبدہ کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ...... میں فائق بلکہ بلال سے بات کرتا ہوں۔''

''نہیں...... نہیں ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ انعم ہی کچھ ناسمجھ ہے۔ دراصل فائق تھکا ہوا تھا اُس نے آنے سے منع کیا تو یہ جذباتی ہوگئی۔ بہر حال میں نے سمجھا دیا ہے انعم کو کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے شوہر کو تنگ نہیں کرتے...... فائق آئے گا تو میں خود معذرت کرلوں گی۔'' بی بی جان نے شوہر کو مکمل اطمینان دلایا۔ مگر انہیں پھر بھی تشویش تھی۔

''دیکھو زبدہ معاملہ سنجیدہ نہ ہو...... انعم اس طرح روتی ہوئی پہلے کبھی نہیں آئی......''

''کہہ رہی ہوں نا فکر مت کریں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور خدارا..... آپ انعم کے بے جا لاڈ اٹھانے چھوڑ دیں۔ اب وہ اپنے گھر کی ہو چکی ہے۔ اُسے بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔'' بی بی جان نے انہیں بات مکمل ہی نہیں کرنے دی تھی۔ وہ جانتی تھیں انعم کے معاملے میں وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

''کیا.....؟ کوئی شکایت آئی ہے اُدھر سے۔'' شریح خان نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بالآخر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

''ابھی تک تو نہیں..... مگر کیا خبر فائق آئے تو کیا کہے۔ یہ بھی تو ہر دو دن بعد اِدھر بھاگتی ہے۔ آخر کوئی کب تک سہے گا۔ یہ بچی تو نہیں ہے۔''

زبدہ خان بھی اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی سے چڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے شوہر کے سامنے برملا اظہار کیا۔

''تم آرام اور پیار سے سمجھاؤ سمجھ جائے گی۔''

''جی! میں تو اُسے اب سمجھاؤں گی ہی۔'' بی بی جان نے گہری سانس کھینچ کر گویا بات ختم کر دی۔ شریح خان کو بھی اطمینان ہو گیا کہ معاملہ زیادہ سنجیدہ نہیں ہے۔ دونوں کی ناراضگی جلد ہی ختم ہو جائے گی۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے پر سبھی جمع تھے سوائے انعم کے..... بی بی جان سے ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے اُس نے ناشتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

شمو نے آ کر جب بتایا تو بی بی جان کے چہرے پر سنجیدگی کے ساتھ کچھ ناگواری بھی ابھر آئی تھی۔

''کیوں انکار کیا ہے اُس نے ناشتے سے..... اُس کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' شریح خان کی فکر مندی سبھی کو متوجہ کر گئی۔ جبکہ بی بی جان کے ماتھے پر بل آ گیا۔

''ہاں جی..... وہ تو بالکل ٹھیک بیٹھی ہیں اور ٹی وی دیکھ رہی ہیں..... اور جی۔'' شمو وہیں کھڑی تھی فوراً وضاحت دینے لگی۔ بی بی جان نے اُسے گھور کر دیکھا۔

''ہاں ٹھیک ہے اُس کا دل نہیں چاہ رہا ہوگا۔ ابھی تم جاؤ اپنا کام کرو۔'' شمو نے اُن کا اشارہ سمجھتے ہوئے فوراً ہی کچن کا رخ کیا۔ اروی کو قدرے حیرت ہوئی کہ کوئی بھی انعم کی غیر موجودگی کا خاص نوٹس نہیں لے رہا۔

''بی بی جان انعم نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہاں بلا لاتی ہوں اُسے یا پھر..... اُسے کمرے میں دے آتی ہوں۔'' اروی کو لگا تھا اپنائیت ظاہر کرنے کا یہی موقع مناسب ہے اس لیے وہ بڑے خلوص سے کہہ رہی تھی۔

''نہیں..... تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

بی بی جان کا لہجہ پہلے تو سپاٹ سا تھا پھر یکدم لہجہ و بات سنبھالتے ہوئے بولیں۔

''میرا مطلب ہے اُس کا ابھی ناشتے کا موڈ نہیں ہے وہ جب چاہے گی مانگ لے گی۔ یہ اُس کا اپنا گھر ہے۔''

سبھی نے چونک کر بی بی جان کو دیکھا تھا۔ اصم بھی ٹھٹک کر سوچ رہا تھا کہ ''بی بی جان کو کیا ہوا''
''تم آرام سے ناشتہ کرواؤ پھر اپنی امی کی طرف جانے کی تیاری کرو...... اصم تمہیں ملوانے لے جائے گا۔ پرسوں تو تم لوگ جا رہے ہو۔ اُن لوگوں نے تو آنے سے معذرت کر لی تھی۔ تم دونوں کو اُن سے ملنے جانا چاہیے۔''
بی بی جان کا فیصلہ کن انداز سبھی کو حیران کر رہا تھا۔ اس اچانک فیصلے پر شریح خان بھی حیرت زدہ تھے اور اصم بھی...... کل رات تک ایسا کوئی ذکر ہی نہیں تھا کہ اُن دونوں کو جانا چاہیے۔ اروی بھی حیران تھی مگر خوش بھی تھی کہ بنا کہے اُس کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔
شریح خان اور بہو بیٹیوں کو اتنا تو اندازہ تھا کہ وہ مصلحتاً انہیں بھیج رہی ہیں۔ سو کسی نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ باقی ناشتہ خاموشی سے ختم ہوا۔ ضیغم اور شارم بابا جان کے ساتھ آفس کے لیے نکل گئے۔ نیلم اور بچے پہلے ہی کالج اور اسکول کے لیے نکل چکے تھے۔

☆......☆......☆

اصم اور اروی بھی اپنے کمرے میں چلے آئے۔ ظاہر ہے اُسے میکے جانے کے لیے خاص تیاری کرنا تھی۔ کمرے میں آتے ہی اروی نے معذرت کی۔
''سوری جناب آپ کی فرمائش تو آج پوری نہیں ہو سکتی۔''
''کون سی فر...... ما...... ئش......؟'' اصم کے ذہن سے کل رات کی بات نکل چکی تھی۔
''وہی پارلر جانے والی......'' ڈریسنگ ایریا کی طرف بڑھتے ہوئے مسکراتے ہوئے اُس نے اندر کی خوشی کو بھی عیاں کیا۔
''او...... ہاں...... یاد آیا...... آج تو......'' اصم کو بھی جیسے یاد آیا۔
''چلو کوئی بات نہیں کل چلی جانا...... آج اپنے گھر والوں سے مل لو...... پرسوں تو پھر ہمیں یہاں سے فلائی کرنا ہے۔'' اصم نے ریموٹ کنٹرول پکڑتے ہوئے ٹی وی کھولا۔
''اروی دن کی مناسبت سے ہلکے زرد رنگ کا جدید طرز کا سوٹ پہن کر آئی۔
''یہ پہن لوں اچھا لگے گا؟'' اصم اُس کی طرف متوجہ ہوا۔
''ہوں...... م...... تم پر ہر رنگ سوٹ کرتا ہے۔ ہر بار کیوں پوچھتی ہو۔ جو دل چاہتا ہے پہنا کرو۔'' لہجے میں محبت اور آنکھوں میں شوق تھا۔
''میں چاہتی ہوں میں آپ کی پسند کے رنگ میں رنگ جاؤں۔ اس لیے بار بار پوچھتی ہوں۔''
''اچھا! تو پھر میری محبت کے رنگ میں رنگ جاؤ۔'' اصم ایکدم شوخ ہو کر بیڈ سے اُٹھ کر اُس کی جانب بڑھا اور اُسے بانہوں کے گھیرے میں لے کر محبت آمیز سرگوشی میں بولا۔
''محبت پہنو...... محبت اوڑھو اور محبت تان کر سو جاؤ میرے ساتھ۔''
اصم کی شوخی و والہانہ پن پر وہ قدرے گھبرا کر کسمسائی۔
''اص...... صم پلیز...... کوئی آ جائے گا۔ ہمیں جانا ہے ناں۔'' اروی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے روکے۔

''او...... یار......'' اصم اُس کے گھبرانے پر قدرے زچ ہوا۔
''تم تو رومینس میں بھی اناڑی ہو۔'' اصم کی گرفت ڈھیلی پڑی تو وہ بھی ناسمجھی سے اُسے دیکھنے لگی۔ جیسے اُس کے موڈ کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
''او کے جاؤ...... اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ تیاری کرو...... دیر ہو جائے گی۔'' اصم نے اس بار باقاعدہ اُسے کندھوں سے تھام کر ڈریسنگ روم کی طرف دھکیلا اروئی اُس کے بدلتے موڈ کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی اندر بڑھ کر تیاری کرنے لگی۔

☆......☆......☆

بی بی جان لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں اروئی کے جانے کے بعد ہی وہ انعم سے بات چیت کا سلسلہ شروع کریں۔ اصم کے ساتھ اروئی تیار ہو کر آئی تو انہوں نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔
''اپنی امی کو فون کر دیا ہے؟''
''نہیں بی بی جان! ہم سرپرائز دیں گے۔'' اروئی کے بجائے اصم نے جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ بی بی جان اس بات پر کوئی نصیحت کرتیں۔ انعم اپنے کمرے سے نکل کر وہاں آ گئی۔
''کسے سرپرائز دے رہے ہیں آپ اصم بھائی؟'' انعم قدرے نارمل تھی۔ بی بی جان نے دونوں کے بولنے سے پہلے ہی وضاحت دی۔
''اصم اروئی کو اُس کے میکے لے کر جا رہا تھا۔ رات تک آ جائیں گے دونوں...... تم بتاؤ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔''
بی بی جان کو اندیشہ تھا انعم اپنے اور فائق کے جھگڑے کے بارے میں اروئی کے سامنے کچھ اُلٹا سیدھا نہ بول دے۔
''ٹھیک ہوں میں۔'' لہجے سے ناراضگی صاف عیاں تھی۔ روٹھے لہجے میں ہی وہ مزید بولتے ہوئے صوفے پر ٹک گئی۔
''یہ کیا؟ میں آپ لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے آئی ہوں اور آپ کچھ اور ہی پروگرام بنا کے بیٹھے ہیں۔ اُس دن تو بڑے دعوے کر رہی تھیں اروئی بھابی کہ بار بار میکے جانا پسند نہیں ہے' آج کیا ہوا۔''
''انعم کس انداز میں بات کر رہی ہو تم......'' بی بی جان نے اُسے گھورتے ہوئے سرزنش کی۔
''میں کیا کہہ رہی ہوں بی بی جان...... ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔ اب دیکھیں ناں...... فائق کو پتہ چلے گا کہ میں جس بھابی کی محبت میں یہاں رہنے آئی ہوں وہ تو اپنے میکے گئی ہوئی ہیں تو وہ کیا سمجھیں گے۔'' انعم نے فوراً ہی لہجے و بات کو گھما دیا تھا۔
اروئی کو بھی احساس ہوا تھا کہ ایک طرح سے ٹھیک کہہ رہی ہے۔ فوراً بولی۔
''بی بی جان...... انعم ٹھیک کہہ رہی ہے میں پھر چلی جاؤں گی آج جانا اتنا ضروری نہیں ہے۔'' اصم اس دوران بالکل خاموش کھڑا تھا۔
''نہیں...... نہیں بیٹا...... تم دونوں جاؤ...... دوسرے شہر کا معاملہ ہے۔ جلدی نکلو گے تو ٹائم سے واپس

آ ؤ گے۔ انعم ابھی یہیں ہے۔ کل کا دن بھی ہے ابھی...... اللہ کا نام لے کر نکلو...... اور ہاں جاتے جاتے اپنے گھر والوں کو بھی اطلاع کر دو۔ اس طرح اچانک جانا مناسب نہیں ہے۔'' بی بی جان نے اُٹھ کر دونوں کو باری باری گلے لگا کر ہدایت دے کر رخصت کیا۔

سبرینہ اور ثمن سے بھی اروی کچن میں جا کر ملی۔ وہ لوگ نکلے تو بی بی جان نے انعم کو سنجیدگی سے ٹوکا۔

''انعم سوچ سمجھ کر بات کیا کرو...... اروی کو آئے ابھی چند دن ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہارے سسرال والے آ کر تمہارے رویے کی شکایتیں اُس کے سامنے کریں۔''

''بی بی جا...... ن...... میری کیا شکایتیں؟ شکایتیں تو مجھے ہیں اُن سے...... کیا وہ آج آ رہے ہیں؟'' انعم جز بز ہو کر پھر سے خفگی کا اظہار کرنے لگی۔

''ہا...... ں...... شاید......!'' صالحہ بھابی کا فون آیا تھا اور میں نے انہیں شام کو چائے پر بلایا ہے۔ اور میں تمہیں پھر سے سمجھا رہی ہوں' اُن کے سامنے بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

بی بی جان نے سنجیدگی سے تنبیہی کی تو وہ مزید جلبلائی۔

''وہ سچ جھوٹ سو الزام لگاتی رہیں گی اور میں سنتی رہوں؟ یہ کہاں کا انصاف ہے بی بی جان...... انہیں تو میرے کھانے پینے تک پر اعتراض ہے...... باقی کسر فائق پوری کر دیتے ہیں۔''

''اچھا...... ! بس...... شروع شروع میں بہوؤں کو ایسا ہی لگتا ہے کہ اُن کے ہر فعل پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ بڑوں کی نصیحت میں اُن کے تجربے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ تم خواہ مخواہ چڑچڑی ہو رہی ہو۔''

''جاؤ ناشتہ کر و ایسی حالت میں زیادہ دیر بھوکا رہنا بچے کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔'' آخر میں بی بی جان نے نرمی سے سمجھایا تو وہ سر جھٹک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

☆......☆......☆

وہ دونوں گھر سے نکلے تھے تو سورج آسمان پر چمک رہا تھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ گرمیوں کی آمد تھی۔ جاتی بہار کی خوشگواری فضا میں ابھی تک رنگ بکھیرتی محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ ایسا ہی خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ اصم کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ پر اروی کا شرم سے جھینپنا اُسے مزید گلابی کر رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر سرمئی بادلوں کے ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح تیرتے موسم وفضا کو مزید دلکش بنا رہے تھے۔

''کیا ہی اچھا ہو اگر بارش ہونے لگے۔ اور ہم دونوں بھیگ جائیں۔'' بادلوں کو دیکھ کر اصم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بے ساختہ بولی۔

''ہم تو گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ ہم کیسے بھیگیں گے۔'' اروی نے مسکراتے ہوئے اُس کی جانب گردن موڑی۔

''ڈونٹ وری تمہارے ساتھ بھیگنے کے لیے میں گاڑی سائیڈ پر لگا کر سڑک پر اُتر جاؤں گا۔ اگر ہم گھر پر ہوتے تو ہم چھت پر یا ٹیرس پر بھیگتے۔''

''اچھا......'' اصم کی خواہش پر وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

''بی بی جان گھر پر بھیگنے دیتیں؟''

''کیوں؟ وہ کیوں روکتیں، میں تو اکثر دوستوں کے ساتھ بائیک لے کر ایسے موسم کو انجوائے کرنے نکل جاتا تھا۔''

''آپ مرد ہیں...... اس لیے...... لڑکیوں کو اکثر ایسی انجوائے منٹ کی پرمیشن نہیں ہوتی۔ اور ایک طرح سے صحیح بھی ہے۔ ہمارے مذہب میں مصلحتاً لڑکیوں اور عورتوں پر کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ جو کہ انہیں بہت سی قباحتوں اور گناہوں سے بچالیتی ہیں۔'' اروی قدرے مسکرا کر بولی۔

''اروی...... تمہاری سوچ بالکل بی بی جان جیسی ہے۔ تم بھی خواہشات کو لاجک کی مار مار کے دبانے کا ہنر رکھتی ہو۔'' اصم اُس کی باتیں سن کر جیسے بے مزا ہوا۔

''تو کیا؟ میں نے غلط کہا ہے۔ ایک لڑکی سڑک پر بھیگے گی تو کتنی نگاہیں اُٹھیں گی۔''

''ایک تو بندہ ذرا سی خوشی کا اظہار بھی نہیں کرسکتا۔ میں کون سا تمہیں سچ مچ سڑک کنارے لے کر بھیگنے کھڑا ہو گیا تھا۔ دل میں ایک بات آئی تھی اور میں نے کہہ دی۔'' اصم کا موڈ یکدم خراب ہوا تھا۔

''اصم پلیز...... آپ ناراض تو نہ ہوں۔ میں نے بھی بس یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ ٹھیک ہے میں کسی دن آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گی۔ ساون تو آنے دیں۔'' اروی نے اُس کے اسٹیئرنگ پر حرکت کرتے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر منانے کی کوشش کی۔

''رئیلی...... ! یاد رکھنا پھر وعدہ۔'' اصم ایکدم ہنسا تو اروی کی جان میں جان آئی۔ کبھی کبھی اصم کو سمجھنے میں دشواری ہونے لگتی تھی۔ لیکن آخر اُسے اصم کی خواہشات کے مطابق ڈھلنا ہی تھا۔

☆......☆......☆

زہرا جلدی جلدی صحن میں بندھی تار سے دھلے کپڑے اُتارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بادل ہواؤں سے اٹکھیلیاں کرتے آسمان پر اِدھر اُدھر جھومتے لہراتے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہے تھے کہ کسی بھی لمحے وہ اپنے اندر سموئے ساحلوں سے چرائے آب دانے قطرہ قطرہ بکھیرنے لگیں گے۔

پھر چاہے اُن قطروں سے کوئی بھیگے یا جلے اُن کی بلا سے۔ زہیر بھی بلبلاتا ہوا چیزیں سمیٹنے میں مدد کر رہا تھا۔

''آپ کی لاڈلی کا کالج جانا ضروری تھا؟ پتہ بھی تھا آج موسم اچھا نہیں ہوگا۔'' اُس نے کپڑوں کا ڈھیر چارپائی سے اٹھایا اور بڑبڑاتا الماری والے کمرے میں مسہری پر پھینک دیا۔

زہرا بھی اُس کے سوال جواب سے زچ سی ہوئی تھیں۔

''اُس کا ٹیسٹ تھا اور محکمہ موسمیات کی پیشن گوئیاں کونسی ہمیشہ سچ ثابت ہوتی ہیں۔ اللہ کے فضل سے سال میں ایک آدھ بارش کی اطلاع سچی ہوتی ہے۔ ابھی بھی کس کو پتہ ہے ہوا بادل اُڑا کر لے گئی تو ڈھونڈتے رہنا بارش۔'' انہوں نے جھٹکے سے چارپائی اُٹھا کر دروازے کے ساتھ دیوار سے لگائی۔

''اچھا ہے نہ آئے بارش ورنہ دو دن تک گلیوں سے پانی اور کیچڑ ہی ختم نہیں ہوگا۔ اب مجھے آوازیں مت دیجیے گا میں چھت پر پڑھنے جا رہا ہوں۔'' زہیر نے اوپر جاتی سیڑھیوں پر جیسے ہی قدم رکھا بیرونی دروازہ بجنے لگا۔

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ جنوری میں ملاحظہ فرمائیں)

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

قرآن حکیم

اپنے بندوں کی خیر خواہی کے لیے قرآن نازل کرنے والا تمام اعلیٰ صفات کا حامل اللہ اس کائنات کا خالق اور حکمران ہے۔ اللہ سے ڈرنے والے ہی اللہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی ناراضگی سے بے خوف ہو کر اُس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ اپنا برا انجام خود دیکھ لیں گے۔ (سورۃ طٰہٰ)

میرے پیارے نبیؐ

انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو کسی چیز سے اتنا خوش ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا جتنا وہ اس بات سے خوش ہوئے کہ ایک شخص نے کہا۔

''اللہ کے رسول ﷺ! آدمی ایک آدمی سے اس کے اچھے اعمال کی وجہ سے محبت کرتا ہے اور وہ خود اس جیسا عمل نہیں کر پاتا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اُس نے محبت کی ہے۔'' (سنن ابن داؤد)

رضوانہ پرنس کی ڈائری سے

دشمنوں سے محبت ہونے لگی ہے مجھے
جیسے جیسے دوستوں کو آزماتا جا رہا ہوں میں

............*

دونوں خدار تھے اتنے کہ جدائی کا سبب
اس نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں

............*

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
تو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

فیصلہ

بعض اوقات دعائیں رب کے فیصلے نہیں بدلتیں مگر آپ کا دل بدل دیتی ہیں اور رب کے فیصلے کے مطابق کر دیتی ہیں

راحیلہ۔ لاہور

ہائے عورت

عورت ہونا بہت مشکل کام ہے کیونکہ عورت کو مرد کی طرح سوچنا پڑتا ہے' عورت کی طرح برتاؤ کرنا پڑتا ہے' نظر جوان لڑکی جیسا آنا پڑتا ہے اور کام گھوڑے اور گدھے کی طرح کرنا پڑتا ہے۔

سکینہ فرخ۔ کراچی

ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا

جو لوگ کولڈ ڈرنک کو ٹھنڈی کولڈ ڈرنک
آملیٹ کو انڈے کا آملیٹ
چپس کو آلو والی چپس کہتے ہیں
سنڈے کو سنڈے والا دن بولتے ہیں
اور ہیئر اسٹائل کو بالوں کا ہیئر اسٹائل کہتے ہیں

میرا اُن کو مشورہ ہے موبائل اور کمپیوٹر کی جان چھوڑ کر کچھ پڑھائی کی طرف توجہ دیں ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔

سلمٰی۔بحرین

کراچی کا موسم

صبح 6 بجے......سخت سردی

صبح 8 بجے......سردی

10 بجے......خنکی

12 بجے......گرمی

دوپہر 2 بجے......سخت گرمی

سہ پہر 4 بجے......تپش

شام 6 بجے......عجیب سا موسم

8 بجے......خنکی

10 بجے......ٹھنڈ

رات 12 بجے......سردی

لوگ پورے سال میں جو موسم دیکھتے ہیں ہم ایک دن میں دیکھ لیتے ہیں

رمشا۔کراچی

وصیت

ایک شخص نے اپنے بیٹے سے وصیت کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا میرے مرنے کے بعد میرے پیروں میں یہ پھٹے پرانے موزے پہنا دینا' میری خواہش ہے مجھے قبر میں اسی طرح اتارا جائے۔'' باپ کا مرنا تھا غسل وکفن کی تیاری ہونے لگی چنانچہ حسب وعدہ بیٹے نے عالم دین سے وصیت کا اظہار کیا مگر عالم دین نے اجازت نہ دیتے ہوئے فرمایا۔

''ہمارے دین میں میت کو صرف کفن پہنانے کی اجازت ہے۔''

مگر لڑکے نے کافی اصرار کیا جس کی بنا پر علماء شہر ایک جگہ جمع ہوئے تاکہ کوئی نتیجہ نکل سکے۔ مگر ہونا کیا تھا۔ لفظی تکرار بڑھتی گئی اسی اثناء میں ایک شخص وارد مجلس ہوا اور بیٹے کو باپ کا خط تھما دیا' جس میں باپ کی وصیت یوں تحریر تھی۔

''میرے پیارے بیٹے' دیکھ رہے ہو کثیر مال و دولت' جاہ وچشم' باغات' گاڑی' کارخانہ اور تمام امکانات ہونے کے باوجود اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ میں ایک بوسیدہ موزہ اپنے ساتھ لے جاسکوں۔ ایک روز تمہیں بھی موت آئے گی آگاہ ہوجاؤ۔ کہ تمہیں بھی ایک کفن ہی لے کر جانا پڑے گا۔ لہٰذا کوشش کرنا کہ جو مال و دولت میں نے ورثے میں چھوڑی ہے۔ اس سے استفادہ کرنا نیک راہ میں خرچ کرنا بے سہاروں کا سہارا بننا کیونکہ جو واحد چیز قبر میں تمہارے ساتھ جائے گی وہ تمہارے اعمال ہوں گے۔''

پروین شروانی۔کراچی

خطرناک غلطیاں

☆......اپنا راز کسی کو بتا کر اُس کو پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔

☆......گناہ اس نیت سے کرنا کہ چند مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔

☆......اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرنا اور کسی خدائی عطیے کا امیدوار ہونا۔

☆......انسان کے متعلق ظاہری شکل وصورت دیکھ کر رائے قائم کرنا۔

☆اپنے والدین کی خدمت نہ کرنا اور اپنی اولاد سے خدمت کی توقع کرنا۔

☆جو کام خود سے نہ ہو سکے سب کے لیے ناممکن سمجھنا۔

☆بے کاری میں آئندہ کے لیے خیالی پلاؤ پکانا اور خوش ہونا۔

☆اپنے آپ کو سب سے عقلمند سمجھنا۔

راحیل علی۔فیصل آباد

پڑوسن کی بیٹی

پڑوسن کی بیٹی کا نام دعا ہے۔ کبھی راہ چلتے دعا سلام ہوتی ہے تو وہ پوچھتی ہیں؟

''بیٹا کیسے ہو؟''

میں بس اتنا ہی کہتا ہوں۔

''آنٹی......!بس آپ کی دعا چاہیے۔''

سلمٰی جنید۔ سکھر

یا حیرت!

سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کون سا موسم چل رہا ہے

☆......مچھر کاٹ رہے ہیں۔

☆......کمبل بھی اوڑھ رہے ہیں۔

☆......پنکھا بھی چل رہا ہے۔

☆......نہا گرم پانی سے رہے ہیں، اور......

پی ٹھنڈا پانی رہے ہیں۔

بنتِ آمنہ۔ ملتان

حل

دروازہ گھر کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں لگا تالا اس سے بھی چھوٹا اور اس تالے کو کھولنے والی چابی تو بہت مختصر ہوتی ہے مگر یہ مختصر سی چابی پورے گھر کو کھول دیتی ہے۔

اسی طرح ایک معمولی سا حل بڑی بڑی مشکلات سے نکال دیتا ہے۔

ام فرواہ۔ جہلم

پردہ اور حیا

پردہ اور حیا میں یہ فرق ہے کہ پردہ کسی کو پاس نہیں آنے دیتا اور حیا آپ کو کسی کے پاس جانے نہیں دیتی۔

رباب جعفری۔ کوہاٹ

آگ

ایک عورت نے ایک عالم سے پوچھا۔

''میں اپنے بچوں کے ساتھ ایسا کیا کروں کہ اُن کو فجر کے وقت گہری نیند سے اٹھا سکوں؟''

عالم نے کہا: ''تم اس وقت کیا کرو گی جب بچے گہری نیند سو رہے ہوں اور گھر میں آگ لگ جائے؟'' عورت نے کہا۔

''میں انہیں جگاؤں گی۔'' عالم نے پوچھا:

''اُن کی نیند گہری ہوئی اور وہ نہ اٹھے تو؟'' عوام نے کہا۔ ''اللہ کی قسم میں انہیں گردنوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے آگ سے بچا کر لے جاؤں گی۔'' تب عالم نے کہا۔

''اگر تم انہیں دنیا کی آگ سے بچانے کے لیے یہ کرو گی تو پھر انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے بھی ایسا ہی کرو۔''

فاخر شیر۔ کوہاٹ

ڈگری

ڈگری تو محض تعلیمی اخراجات کی رسید ہوتی ہے۔ علم تو انسان کی گفتگو اور عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔

کون سا تیر مار لیا

جس نے جلد بازی میں شادی کی اس نے اپنا سارا جیون بگاڑ لیا......

اور جس نے سوچ سمجھ کر شادی کی اس نے......

کون سا تیر مار لیا......

محمد عتیق۔ ریاض

اور یاور حیات مر گیا..

بالآخر بیمار کو بے وجہ قرار آ گیا۔ یاور حیات مر گیا۔ مجھے بھی قرار آ گیا کہ میں بہت دنوں سے اُس کی موت کا منتظر تھا۔ ٹیلی ویژن ڈرامہ کا آخری ستون بھی ڈھے گیا اور اچھا ہوا کہ اب ہم اس کے کھنڈروں میں کھڑے ہو کر ٹیلی ویژن کے سنہری دور کا جی بھر کے ماتم کر سکتے ہیں۔ اچھا اس لیے بھی ہوا کہ وہ ایک مدت سے فراموش شدہ

اور گمنام حالت میں بیمار پڑا تھا۔ سسک سسک کر مر رہا تھا اور کسی نے اس کی خبر نہ لی۔ ٹیلی ویژن ہیڈ کوارٹر کے اصطبل میں بندھے درجنوں ہاتھی اپنے عالی شان دفتروں میں لاکھوں روپے عوامی خزانے سے ہڑپ کرتے ہوئے اور اُن کے ہمراہ سرکار کے دربار سے مراعات شدہ گدھے اور خچر جن میں سے کچھ تو ٹیلی ویژن کی ہجے بھی درست طور پر نہیں کر سکتے مسلسل ہنہنا رہے ہیں اور انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ ٹیلی ویژن کا آخری شہزادہ یاور حیات جس نے ایک ڈاکومنٹری میں شاہ جہان کا کردار ادا کیا تھا جو فرانس کے کین فلم فیسٹیول میں نمائش کی گئی تھی اور دیکھنے والوں کا کہنا تھا کہ یہ والا شاہ جہان تو ممتاز محل والے شاہ جہان سے کہیں بڑھ کر خوش شکل اور دل نشین ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس شاہ جہان نے ٹیلی ویژن کے لیے متعدد تاج محل تخلیق کیے۔ میں اُس کی موت کا اس لیے بھی منتظر تھا کہ جیسے وہ سسک سسک کر مر رہا تھا ایسے میری اُس دور کی یادیں بھی سسک رہی تھیں۔ شکر ہے وہ مر گیا اور یوں مجھے بھی قرار آ گیا کہ میری سسکتی ہوئی یادوں نے بھی دم توڑ دیا۔ ان دونوں کو یاور اور میری یادوں کو ایک گہری قبر میں دفن کر دو تا کہ ٹیلی ویژن پر براجمان اس مردہ گھوڑے کے ماس پر پلنے والے مجاور بھی اُس کے جنازے میں شریک ہوں۔ اُس کے بارے میں تعزیتی بیان دیں اور پھر کسی نائب سے پوچھیں کہ یہ یاور حیات آخر تھا کون؟ یہ تو کبھی مجھ سے ملنے کے لیے ہیڈ کوارٹر نہیں آیا اگر آتا تو میں اس کی کچھ مدد کر دیتا۔ یہ لوگ جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں گھسیٹتے ہوئے ہمارے در پر آ کر مدد کی فریاد نہیں کرتے، بھئی ہمیں اطلاع کریں گے تو ہم اُن کے لیے دوا دارو کا بندوبست کریں گے ناں...... ہمیں الہام تو نہیں ہونا کہ وہ سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ بھلا کوئی شاہ جہان بھی کاسہ لیس درباریوں سے فریاد کرتا ہے۔

غزالہ رشید۔ کراچی

فرق

محبت...... مرد کے لیے صرف ایک لمحہ ہوتی ہے۔ جبکہ...... عورت کے لیے ساری زندگی ہوتی ہے۔ مرد کی محبت دھنک کی طرح ہوتی ہے جو ہوتی تو بہت خوبصورت ہے مگر رہتی بہت کم عرصے کے لیے ہے۔ جبکہ...... عورت کی محبت بارش کی طرح ہوتی ہے جو برستی ہے تو دل و جاں کو سکون دیتی ہے برسنے کے بعد بھی دل و جاں کو اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے مرد کی محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے شدید اور سارے وجود کو اپنے آپ میں سمیٹ لینے والی...... مگر جب یہ درد ختم ہوتا ہے تو لگتا ہے کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ جبکہ...... عورت کی محبت سر درد کی طرح ہوتی ہے اور درد سارے وجود کو اذیت دیتا ہے مگر ختم ہونے کے بعد بھی جسم و جاں کو مضمحل رکھتا ہے بہت دیر تک درد کا احساس باقی رہتا ہے۔

مرد کی محبت چودھویں کے چاند کی طرح ہوتی ہے جو پوری آب و تاب سے چمکتا ہے ہر طرف روشنی کر دیتا ہے مگر پھر آہستہ آہستہ گھٹنا شروع کر دیتا ہے اور کم ہوتے ہوئے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ جبکہ...... عورت کی محبت پہلی رات کے چاند کی طرح ہوتی ہے جو شروع میں تو بہت کم ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ اُس کی روشنی اور شدت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

راحت وفا راجپوت۔ لاہور

بینگن کو ہوش آ گیا...

سبزی والا سبزی پر پانی چھڑک رہا تھا۔ کافی دیر تک ایسا کرتا رہا۔

خریدار کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بولا۔

”بھائی صاحب! اگر بینگن کو ہوش آ گیا ہو تو ایک کلو تول دیں۔“

فائزہ شیخ۔ قلات

☆☆......☆☆......☆☆

نئے لہجے نئی آوازیں

اقرارِ جرم!

سُو گر ہو سکے جاناں! تو مجھ کو معاف کر دینا
مجھے احساس ہے میں نے، تمہارا دل دُکھایا ہے
ذرا سی بات کو لے کر، تمہیں کتنا ستایا ہے
بہت غصہ کیا تم پر، تمہیں کتنا رُلایا ہے
میں بالکل مان لیتا ہوں
کہ میری اس لڑائی کی وجہ میں ہوں، فقط میں ہوں
میں سب کچھ مان لیتا ہوں کہ سارے جرم میرے ہیں
مجھے منظور ہے جو بھی سزا دے لو
مگر اِک کام بھی کر دو، کوئی تدبیر بتلا دو
کہ یہ بے چین دل میرا، تمہارے ایک پل کو بھی
ذرا سا دور ہونے پر، کسی صورت سنبھال جائے
اگر یہ بھی نہیں ہوتا، تو پھر دھڑکن ہی رک جائے
مجھے معلوم ہے جاناں! تمہارا دل دکھایا ہے
مگر میں کیا کروں بولو؟ یہ دل سُنتا نہیں میری
یہ تم سے پیار کرتا ہے، جدائی سہہ نہیں سکتا
نہ گھنٹوں کی، نہ پل بھر کی
سنو گر ہو سکے جاناں! تو مجھ کو معاف کر دینا

شاعر: عادل حسین۔ کراچی

جب تم تھے

زندگی کی بساط اتنی ہے
تم نہیں ساتھ تو بات اتنی ہے
نہ خوشی ہے، نہ سکوں پل بھر کا
بے کلی اور درد عمر بھر کا
تم جو ہوتے تھے، ساتھ ہوتے تھے
رنگ، خوشبو، ہوا، بادل
پھول، جگنو، صبا، ساگر
پیار، الفت، وفا، جیون
سارے جذبوں سے عبارت تھی
زندگی کتنی خوبصورت تھی
تم جو تھے ساتھ، تو سبھی کچھ تھا
زندگی میں ہنسی تھی رونق تھی
جب نہ جاناں تمہاری دوری کا
درد دل کو ملا تھا تب تک تو
سارے موسم ہی دل رُبا سے تھے
سارے جذبے ہی خوش نما سے تھے
تمہارے ہونے سے، ہم بھی جیتے تھے
جب تم تھے، کہاں غم تھے
سارے موسم بھی محترم سے تھے

شاعرہ: سباس گل۔ رحیم یار خان

اجنبی سا لگا...

وہ جب بھی ملا اجنبی سا لگا
دھوپ میں سایا ملا اجنبی سا لگا
میری آنکھوں میں بسا کرتے تھے تم
آج خود دیکھا عکس تیرا اجنبی سا لگا
مدتوں بعد نکلا سورج میری زمین پر
تو مجھے سایا بھی میرا اجنبی سا لگا
آنکھیں وہی، حدتِ محبت تھی ذرا کم
وہ مجھے اجنبی لگا، بڑا اجنبی سا لگا
دل کی وجہ بربادی جمودِ عشق تھا عاشا
یہ انکشاف جو ہوا اجنبی سا لگا

شاعرہ: عائشہ نور عاشا۔ گجرات

غزل

جانے کیوں دسمبر میں زرد ہوتے ہیں لمحے
سال جب بدلتا ہے سرد ہوتے ہیں لمحے
مجھ کو کوئی بتلائے، دھندلی ہے کیا دنیا
یا میری بصیرت میں گرد ہوتے ہیں لمحے
جب کوئی بچھڑتا ہے، روح کانپ اٹھتی ہے
وقت رُک سا جاتا ہے، درد ہوتے ہیں لمحے
اب وہ وقت آپہنچا، سرد ہے مرا لہجہ
آخری مہینے میں سرد ہوتے ہیں لمحے
یہ بُرے ہوں یا اچھے زندگی میں شامل ہیں
میں شمار کرتا ہوں فرد ہوتے ہیں لمحے
کھیلتے ہیں جو دل سے، جانتے نہیں شوبی
وہ یہی سمجھتے ہیں نرد ہوتے ہیں لمحے

شاعر: ابراہیم شوبی۔ کراچی

عادت

چہروں میں اک چہرہ کھوجنے کی عادت ہے
مجھ کو بھیڑ میں بیٹھ کر سوچنے کی عادت ہے
گلہ ہو بھی تو کیا اِن سے ستم گری کا کہ جنہیں
پھول، شاخوں سے نوچنے کی عادت ہے
دم گھٹنے لگا ہے اسی سبب سے کہ ہمیں
اپنے حصے کی ہواؤں کو روکنے کی عادت ہے
مت ڈھونڈا کیجیے میرے ہر لفظ کی تفسیر
میں تو پاگل ہوں، یونہی بولنے کی عادت ہے
وقت نہیں ہے دنیا کے پاس مجھے جاننے کا
اور مجھ کو بھی کب اپنا آپ کھولنے کی عادت ہے
تم شیشہ ہو تو پھر مجھ سے دور ہی رہو
میں پتھر ہوں جسے شیشہ توڑنے کی عادت ہے

شاعرہ: کرن شبیر۔ کراچی

غزل

امیدوں کے چراغ جلائے رکھے
پلکوں پہ خواب سجائے رکھے
تپتی دھوپ اور وصالِ یار
خالی کشکول اٹھائے رکھے
نہیں بدلے تو حالات نہیں بدلے
ہم دل پہ چوٹ کھائے رکھے
بساط کیا تھی جو دربدر ہوئے
لوگ آئینہ ہمیں دکھائے رکھے
زندگی کتاب سی ہوگئی ہماری
کچھ یاد رہا کچھ بھلائے رکھے
در پہ وار ہم پہ ہوتے رہے
مرتے رہے پر مسکان سجائے رکھے

شاعرہ: عابدہ طارق۔ لالہ موسیٰ

محبت سُن رہی ہو تم

دسمبر میں برف جیسی
مری جاناں کی یادیں ہیں
شرر آنکھیں بھی ہیں اُس کی
گلابی رنگ ہے اُس کا
جو کاندھے پہ وہ لہرائے
سیاہ بالوں کی چادر کو
سمجھ لو دن میں رات آئی
دسمبر میں تری یادیں
مجھے کتنا ستاتی ہیں، مجھے کتنا رُلاتی ہیں
دسمبر تم گواہ رہنا
محبت تم سے سیکھی تھی، عقیدت تم سے سیکھی تھی
برف پگھلے گی اِک دن تو
وہ دن بس عید کا ہوگا
محبت تم گواہ رہنا
دسمبر تم گواہ رہنا

شاعر: زاہد کولاچی۔ گھوٹکی

یادِرفتگاں

مغلیہ سلطنت کا آخری چراغ

ایک بھیانک تاریخ آخری بادشاہ سے آج کی بادشاہت تک

ادارہ

اور پھر ہندوستان کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو میکنن میکنزی بحری جہاز میں بٹھا دیا گیا۔

یہ جہاز 17 اکتوبر 1858ء کو رنگون پہنچ گیا۔

شاہی خاندان کے 35 مرد اور خواتین بھی تاج دارِ ہند کے ساتھ تھیں، کیپٹن نیلسن ڈیوس رنگون کا انچارج تھا۔ وہ بندرگاہ پہنچا۔ اس نے بادشاہ اور اس کے حواریوں کو وصول کیا۔ رسید لکھ کر دی اور دنیا کی تیسری بڑی سلطنت کے آخری فرمانبروا کو ساتھ لے کر اپنی رہائش گاہ پر آ گیا۔ نیلسن پریشان تھا۔

بہادر شاہ ظفر قیدی ہونے کے باوجود بادشاہ تھا اور نیلسن کا ضمیر گوارہ نہیں کر رہا تھا کہ وہ بیمار اور بوڑھے بادشاہ کو جیل میں پھینک دے مگر رنگون میں کوئی ایسا مقام نہیں تھا جہاں بہادر شاہ ظفر کو رکھا جاسکتا۔ وہ رنگون میں پہلا جلا وطن بادشاہ تھا، نیلسن ڈیوس نے چند لمحے سوچا اور مسئلے کا دلچسپ حل نکال لیا۔

نیلسن نے اپنے گھر کا گیراج خالی کرایا اور تاجدار ہند، ظلِ سبحانی اور تیموری لہو کے آخری چشم و چراغ کو اپنے گیراج میں قید کر دیا۔

بہادر شاہ ظفر 17 اکتوبر 1858ء کو اس گیراج میں پہنچا اور 7 نومبر 1862 تک چار سال وہاں رہا۔

بہادر شاہ ظفر نے اپنی مشہور زمانہ غزل......

لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

اور

کتنا بدنصیب ہے ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اسی گیراج میں لکھی تھیں۔ یہ آج 7 نومبر کا خنک دن تھا اور سن تھا 1862ء

بدنصیب بادشاہ کی خادمہ نے شدید پریشانی میں کیپٹن نیلسن ڈیوس کے دروازے پر دستک دی، اندر سے اردلی نے برمی زبان میں اس بدتمیزی کی وجہ پوچھی۔

خادمہ نے ٹوٹی پھوٹی برمی میں جواب دیا۔

''ظلِ سبحانی کا سانس اکھڑ رہا ہے۔'' اردلی نے جواب دیا۔

"صاحب کتے کو کنگھی کر رہے ہیں، میں انہیں ڈسٹرب نہیں کرسکتا۔" خادمہ نے اونچی آواز میں رونا شروع کردیا۔

اردلی اُسے چپ کرانے لگا مگر آواز نیلسن تک پہنچ گئی۔ وہ غصے میں باہر نکلا۔ خادمہ نے نیلسن کو دیکھا تو وہ اس کے پاؤں میں گرگئی، وہ مرتے ہوئے بادشاہ کے لیے گیراج کی کھڑکی کھلوانا چاہتی تھی۔ بادشاہ موت سے پہلے آزاد اور کھلی ہوا کا ایک گھونٹ بھرنا چاہتا تھا۔ نیلسن نے اپنا پسٹل اٹھایا، گارڈز کو ساتھ لیا، گیراج میں داخل ہوگیا۔

بادشاہ کی آخری آرام گاہ کے اندر بدبو، موت کا سکوت اور اندھیرا تھا۔ اردلی لیمپ لے کر بادشاہ کے سرہانے کھڑا ہوگیا۔ نیلسن آگے بڑھا۔ بادشاہ کا کمبل آدھا بستر پر تھا اور آدھا فرش پر، اُس کا ننگا سر تکیے پر تھا لیکن گردن ڈھلکی ہوئی تھی، آنکھوں کے ڈھیلے پپوٹوں کی حدوں سے باہر ابل رہے تھے۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور خشک زرد ہونٹوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ نیلسن نے زندگی میں ہزاروں چہرے دیکھے تھے لیکن اس نے کسی چہرے پر اتنی بے چارگی، اتنی غریب الوطنی نہیں دیکھی تھی۔

وہ کسی بادشاہ کا چہرہ نہیں تھا۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے بھکاری کا چہرہ تھا اور اس چہرے پر ایک آزاد سانس، جی ہاں...... صرف ایک آزاد سانس کی اپیل تحریر تھی اور یہ اپیل پرانے کنوئیں کی دیوار سے لپٹی کائی کی طرح ہر دیکھنے والی آنکھ کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ کیپٹن نیلسن نے بادشاہ کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ زندگی کے قافلے کو رگوں کے جنگل سے گزرے مدت ہوچکی تھی۔

ہندوستان کا آخری بادشاہ زندگی کی حد عبور کرچکا تھا۔ نیلسن نے لواحقین کو بلانے کا حکم دیا۔ لواحقین تھے ہی کتنے، ایک شہزادہ جوان بخت اور دوسرا اُس کا استاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی وہ دونوں آئے۔ انہوں نے بادشاہ کو غسل دیا، کفن پہنایا اور جیسے تیسے بادشاہ کی نماز جنازہ پڑھی، قبر کا مرحلہ آیا تو پورے رنگون شہر میں آخری تاجدار ہند کے لیے دو گز زمین دستیاب نہیں تھی، نیلسن نے سرکاری رہائش گاہ کے احاطے میں قبر کھدوائی اور بادشاہ کو خیرات میں ملی ہوئی مٹی میں دفن کردیا، قبر پر پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ گلاب کی پتیاں بکھیری جارہی تھیں تو استاد حافظ ابراہیم دہلوی کے خزاں رسیدہ ذہن میں 30 ستمبر 1837ء کے وہ مناظر دوڑنے بھاگنے لگے۔ جب دہلی کے لال قلعے میں 62 برس کے بہادر شاہ ظفر کو تاج پہنچایا گیا۔ ہندوستان کے نئے بادشاہ کو سلامی دینے کے لیے پورے ملک سے لاکھوں لوگ دلی آئے تھے اور بادشاہ جب لباسِ فاخرہ پہن کر تاج شاہی سر پر سجا کر اور نادر شاہی اور جہانگیری تلواریں لٹکا کر دربارِ عام میں آیا تو پورا دلی تحسین تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا۔

نقارچی نقارے بجانے لگے، گویے ہواؤں میں تانیں اڑانے لگے۔ فوجی سالار تلواریں بجانے لگے اور رقاصائیں رقص کرنے لگیں۔ استاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی کو یاد تھا بہادر شاہ ظفر کی تاج پوشی کا جشن سات دن جاری رہا اور ان سات دنوں میں دلی کے لوگوں کو شاہی محل سے کھانا کھلایا گیا مگر سات نومبر 1862ء کی اس ٹھنڈی اور بے مہر صبح بادشاہ کی قبر کو ایک خوش الحان قاری تک نصیب نہیں تھا۔

استاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے جوتے اتارے، بادشاہ کی قبر کی پائنتی میں کھڑا ہوا اور سورۃ توبہ کی تلاوت شروع کردی۔ حافظ ابراہیم دہلوی کے گلے سے سوز کے دریا بہنے لگے۔

یہ قرآن مجید کی تلاوت کا اعجاز تھا یا پھر استاد ابراہیم دہلوی کے گلے کا سوز...... کیپٹن نیلسن ڈیوس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ہاتھ اٹھایا اور اس غریب الوطن قبر کو سلیوٹ پیش کردیا اور اس آخری سلیوٹ کے ساتھ ہی مغل سلطنت کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

آپ اگر کبھی رنگون جائیں تو آپ کو ڈیگن ٹاؤن شپ کی

کچی گلیوں کی بدبودار جھگیوں میں آج بھی بہادر شاہ ظفر کی نسل کے خاندان مل جائیں گے۔ یہ آخری مغل بادشاہ کی اصل اولاد ہیں مگر یہ اولاد آج سرکار کے وظیفے پر چل رہی ہے۔ یہ کچی زمین پر سوتی ہے' ننگے پاؤں پھرتی ہے' مانگ کر کھاتی ہے اور ٹین کے کنستروں میں سرکاری نل سے پانی بھرتی ہے۔

مگر یہ لوگ اس کسمپرسی کے باوجود خود کو شہزادے اور شہزادیاں کہتے ہیں۔ یہ لوگوں کو عہد رفتہ کی داستانیں سناتے ہیں اور لوگ قہقہے لگا کر رنگون کی گلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ' یہ شہزادے اور شہزادیاں کون ہیں؟ یہ ہندوستان کے آخری بادشاہ کی سیاسی غلطیاں ہیں' بادشاہ نے اپنے گرد نااہل' خوشامدی اور کرپٹ لوگوں کا لشکر جمع کر لیا تھا۔ یہ لوگ بادشاہ کی آنکھیں بھی تھے' اُس کے کان بھی اور اس کا ضمیر بھی' بادشاہ کے دو بیٹوں نے سلطنت آپس میں تقسیم کر لی تھی۔ ایک شہزادہ داخلی امور کا مالک تھا' اور دوسرا خارجی امور کا مختار' دونوں کے درمیان لڑائی بھی چلتی رہتی تھی اور بادشاہ اُن دونوں کی ہر غلطی، ہر کوتاہی معاف کر دیتا تھا۔

عوام کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی' مہنگائی آسمان کو چھو رہی تھی۔ خوراک منڈیوں سے کٹائی کے موسموں میں غائب ہو جاتی تھی' سوداگر منہ مانگی قیمت پر لوگوں کو گندم' گڑ اور ترکاری بیچتے تھے۔ ٹیکسوں میں روز اضافہ ہوتا تھا' شہزادوں نے دلی شہر میں کبوتروں کے دانے تک پر ٹیکس لگا دیا تھا۔ طوائفوں کی کمائی تک کا ایک حصہ شہزادوں کی جیب میں چلا جاتا تھا۔ شاہی خاندان کے لوگ قتل بھی کر دیتے تھے تو کوئی اُن سے پوچھ نہیں سکتا تھا' ریاست شاہی دربار کے ہاتھ سے نکل چکی تھی' نواب' صوبیدار' امیر اور سلطان آزاد ہو چکے تھے اور یہ مغل سلطنت کو ماننے تک سے انکاری تھے' فوج تلوار کی نوک پر بادشاہ سے جو چاہتی تھی منوا لیتی تھی' عوام بادشاہ اور اس کے خاندان سے بیزار ہو چکے تھے۔ یہ گلیوں اور بازاروں میں بادشاہ کو ننگی گالیاں دیتے تھے اور کوتوال چپ چاپ اُن کے قریب سے گزر جاتے تھے جبکہ انگریز مضبوط ہوتے جا رہے تھے' یہ روز معاہدہ توڑتے تھے اور شاہی خاندان وسیع تر قومی مفاد میں انگریزوں کے ساتھ نیا معاہدہ کر لیتا تھا۔ انگریز بادشاہ کے وفاداروں کو قتل کر دیتے تھے اور شاہی خاندان جب احتجاج کرتا تھا تو انگریز بادشاہ کو یہ بتا کر حیران کر دیتا تھا۔ ظل الٰہی وہ شخص آپ کا وفادار نہیں تھا' وہ ننگ انسانیت آپ کے خلاف سازش کر رہا تھا' اور بادشاہ اس پر یقین کر لیتا تھا' بادشاہ نے طویل عرصے تک اپنی فوج بھی ٹیسٹ نہیں کی تھی چنانچہ جب لڑنے کا وقت آیا تو فوجیوں سے تلواریں تک نہ اٹھائی گئیں۔ ان حالات میں جب آزادی کی جنگ شروع ہوئی اور بادشاہ گرتا پڑتا شاہی ہاتھی پر چڑھا تو عوام نے لاتعلق رہنے کا اعلان کر دیا۔

لوگ کہتے ہیں ہمارے لیے بہادر شاہ ظفر یا الیگزینڈرا وکٹوریا دونوں برابر ہیں۔ مجاہدین جذبے سے لبریز تھے لیکن ان کے پاس قیادت نہیں تھی۔

بادشاہ ڈبل مائنڈڈ تھا یہ انگریز سے لڑنا بھی چاہتا تھا اور اپنی مدت شاہی بھی پوری کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس جنگ کا وہی نتیجہ نکلا جو ڈبل مائنڈڈ ہو کر لڑی جانے والی جنگوں کا نکلتا ہے' شاہی خاندان کو دلی میں ذبح کر دیا گیا جب کہ بادشاہ جلاوطن ہو گیا۔ بادشاہ کیپٹن نیلسن ڈیوس کے گیراج میں قید رہا' گھر کے احاطے میں دفن ہوا اور اس کی اولاد آج تک اپنی عظمت رفتہ کا ٹوکرا سر پر اٹھا کر رنگون کی گلیوں میں پھر رہی ہے۔ یہ لوگ شہر میں نکلتے ہیں تو ان کے چہروں پر صاف لکھا ہوتا ہے جو بادشاہ اپنی سلطنت، اپنے مینڈیٹ کی حفاظت نہیں کرتے' جو عوام کا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں' ان کی اولادیں اسی طرح گلیوں میں خوار ہوتی ہیں۔ یہ عبرت کا کشکول بن کر اسی طرح تاریخ کے چوک میں بھیک مانگتی ہیں لیکن ہمارے حکمرانوں کو یہ حقیقت سمجھ نہیں آتی۔ یہ خود کو بہادر شاہ ظفر سے بڑا بادشاہ سمجھتے ہیں۔

وائے ناکامی' متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں ہوتا رہا

(منقول و منتخب عارف متین انصاری)

”چٹ پٹی خبریں“

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

”یونہی شام ڈھل جائے...“

1974ء میں ریلیز ہونے والی فلم 'مٹی' نے پاکستان کو خوش گلو خوش شکل اور خوش لباس گلوکار اے

نیئر کی صورت میں دیا۔ 17 ستمبر 1950ء کو پیدا ہونے والے گلوکار کا سفر تمام ہوا 11 نومبر 2016ء کو ......اے نیئر اپنے پیچھے ماضی کی بے انتہا خوبصورت یادیں چھوڑ گئے۔ جنگل میں منگل تیرے ہی دم سے پیار تو اک دن ہونا ہی تھا' یونہی دن کٹ جائے' یونہی شام ڈھل جائے' اک لڑکی بھولی بھالی سی' بھیگا موسم تجھ کو پکارے اور ایسے بے شمار لازوال گیت دینے والے اے نیئر اب ہم میں نہیں اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ہمت مرداں

دھواں فیم عاشر عظیم نے اپنی پہلی فلم مالک کے ملک بھر میں پابندی لگنے کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور اب وہ اپنی دوسری فلم پر کام کر رہے ہیں۔ انہوں

نے کہا میں ایک معیاری فلم بناؤں گا جس میں عوامی، معاشرتی، معاشی اور دیگر مسائل کی نشاندہی کی جائے گی۔ اللہ کرے عاشر عظیم کی یہ فلم بڑے پردے پر جلد ریلیز ہو۔

سوئنگ کا ہیرو

جنون بینڈ کے سلمان احمد نے بینڈ کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک گیت ریکارڈ کیا ہے' دور بہت دور مجھے جانا ہے' اس گانے کی ویڈیو میں کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان اور سوئنگ کے ہیرو وسیم اکرم اپنی آسٹریلوی اہلیہ کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وسیم اکرم یہاں بھی اپنا جادو ضرور جگائیں گے۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب

ماضی کی نامور اداکارہ روحی بانو سے کون واقف نہیں مگر ماضی کی خوبرو اداکارہ جو اپنی بے ساختہ اور قدرتی اداکاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں آج کل کسمپرسی کا شکار ہے جواں سال بیٹے کی موت کے بعد روحی بانو بحالی کے مرکز فاؤنٹین ہاؤس میں زندگی

گزار رہی ہیں۔ پاکستانی ڈرامہ کا ایک بہت بڑا نام معاشرتی بے حسی اور سفاکی کی وجہ سے بے یارومددگار ہے۔

بڑی فنکارہ حنا دلپذیر

حنا دلپذیر جن کا نام ہی ڈراموں کی کامیابی کی

ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں بننے والی فلموں سے مطمئن ہیں اور انہیں پاکستان فلم انڈسٹری کا Revival ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ وہ کہتی ہیں جس طرح ٹی وی نے نئے فنکار دیئے اسی طرح نئے لکھنے والوں کو بھی متعارف کرایا جو یقیناً خوش آئند ہے۔ وہ بھارتی فلموں پر پاکستان میں پابندی کے حق میں ہیں اور پیمرا کے اس اقدام کو سراہتی ہیں۔ حنا جی بھی تو لوگ آپ کو بڑا فنکار مانتے ہیں اور آپ واقعی میں بڑی فنکارہ اور بہت بڑی انسان ہیں۔

سدابہار ہیرو

ایک ایسا ہیرو جس کا وقت نے کچھ نہیں بگاڑا۔ گزرتے وقت کے ساتھ صحت' جوانی اور کامیابی سب کو زوال آجاتا ہے مگر جاوید شیخ ایسا فنکار ہے جس کو گزرتے وقت نے عروج ہی عروج عطا کیا۔ ڈرامہ سیریل 'شمع' سے شوبز انڈسٹری میں قدم رکھنے والے اس ہیرو کا وقت نے کچھ نہیں بگاڑا اور اب جاوید شیخ نے مزید 3 فلمیں بنانے کا اعلان کردیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ کہانی' میوزک اور منظر نامے کو جاندار بناتے ہوئے عوام کی توقعات پر پورا اتریں گے اور پاکستانی فلم انڈسٹری کو معیاری فلمیں دیں گے۔

خربوزے کو دیکھ کر......

بہروز سبزواری کی اہلیہ اور جاوید شیخ کی بہن سفینہ بھی اب فلم میں جلوہ گر ہو رہی ہیں ہمایوں سعید کی فلم 'میں پنجاب نہیں جاؤں گی' میں مہوش حیات کی والدہ کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ اُن کی پہلی فلم ہے اُن کے شوہر اور بھائی کئی دہائیوں سے شوبز انڈسٹری سے وابستہ ہیں مگر انہوں نے ہمیشہ گھریلو زندگی کو ترجیح دی شوہر اور بھائی کے علاوہ ان کے خاندان کے دیگر افراد بھی اسی انڈسٹری سے جڑے ہوئے ہیں جن میں اُن کا بیٹا شہروز سبزواری' بہو سائرہ سبزواری' بھتیجی مومل شیخ' بھتیجا شہزاد شیخ' اور چھوٹا بھائی سلیم شیخ بھی شامل ہیں۔ جب پوری فیملی اسکرین پر اداکاری کر رہی ہے تو پھر خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ کیوں نہیں پکڑے گا۔

☆☆☆......☆☆☆

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

سنگاپوری چاول

اجزاء

چاول	ایک گلاس (ابال لیں)
اسپیگھٹی	آدھا پیکٹ (ابال لیں)
ہری پیاز	ایک پاؤ (باریک کٹی ہوئی)
نمک	حسب ذائقہ
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی)	4 عدد
اجینو موتو	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب:
ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے ہری پیاز فرائی کرلیں۔ تمام اشیاء اس میں ڈال کر اس کے بعد چاول اور اسپیگھٹی بھی اس میں ڈال دیں، بیس منٹ دم پر رہنے دیں لذیذ سنگاپوری چاول تیار ہیں، ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

چاکلیٹ فج کیک

اجزاء

میدہ	175 گرام
کوکو پاؤڈر	2 کھانے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
پسی ہوئی چینی	150 گرام
انڈے	2 عدد
تیل	3/4 کپ
دودھ (بغیر بالائی کا)	3/4 کپ

کوٹنگ اور فلنگ کے اجزاء

پھیکا مکھن	5 کھانے کے چمچے
پسی ہوئی چینی	175 گرام
کوکو پاؤڈر	3 کھانے کے چمچے
دودھ	1 کھانے کا چمچ

ترکیب:
ایک باؤل میں میدہ، بیکنگ پاؤڈر اور کوکو پاؤڈر ڈال کر ملالیں اور چھلنی میں ڈال کر ان تمام اجزا کو چھان لیں اس کے اس میں پسی ہوئی چینی شامل کر کے اچھی طرح ملالیں۔ میدے کے آمیزے میں انڈے، تیل، دودھ شامل کر کے خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ جب تک آمیزہ بالکل ہموار نہ ہوجائے۔ اس آمیزے کو مکھن یا تیل سے چکنے کیے ہوئے کیک پین میں ڈال کر پہلے سے گرم اوون میں 180° پر رکھ کر پچیس سے تیس منٹ تک بیک کریں تیار ہوجانے پر اوون سے نکال کر ٹھنڈا کرلیں۔ (اوون نہ ہونے کی صورت میں یہ کیک دیگچی میں بھی بنایا جاسکتا ہے)۔

آئسنگ کے لیے:

کسی برتن میں مکھن ڈال کر نرم ہونے تک پھینٹیں اور ساتھ ساتھ اس میں پسی ہوئی چینی اور کوکو پاؤڈر شامل کر کے مزید پھینٹیں۔ اس کے بعد اس میں تھوڑا دودھ شامل کرلیں تیار کیے ہوئے کیک کے درمیان میں سے سلائس کاٹ لیں۔ اور کیک کے سلائس پر دو چمچے دودھ کے پھیلا کر ڈال دیں۔ آئسنگ ہموار شکل اختیار کرلے تو کیک کی دونوں حصوں کو آئسنگ سے کور کردیں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

مرچوں کا حیدرآبادی سالن

اجزاء

ہری مرچیں	8 عدد
تیل	5 کھانے کے چمچ
رائی	ایک چائے کا چمچ
کلونجی	ایک چائے کا چمچ
میتھی دانہ	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
کشمیری لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
املی کا گودا	4 کھانے کے چمچ
چینی	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ضرورت
تازہ ہرا دھنیا	گارنشنگ کے لیے

گریوی بنانے کے لیے

ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچ
تل	3 کھانے کا چمچ
مونگ پھلی	3 کھانے کے چمچ
کھوپرا	60 گرام
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن	4 جوے
پیاز	ایک عدد

ترکیب:

ہری مرچوں کو لمبائی میں کاٹ لیں۔ ایک فرائنگ پین میں دو کھانے کے چمچ تیل ڈال کر گرم کریں، اس میں مرچوں کو ڈال کر تل لیں، جب وہ ہلکی سنہری ہوجائیں تو انہیں کسی پلیٹ میں نکال لیں۔ ایک فرائنگ پین میں ثابت دھنیا اور زیرہ ڈالیں، ہلکی آنچ پر انہیں بھون لیں، پھر تل ڈالیں اور ایک منٹ تک مزید بھونیں۔ پھر اس میں کھوپرا اور مونگ پھلی ڈالیں اور انہیں بھی بھون لیں۔ جب سب پر ہلکا سنہری رنگ آجائے تو انہیں چولہے سے ہٹا دیں۔ فرائنگ پین میں تیل ڈال کر سلائس کیے ہوئے پیاز ڈالیں، جب وہ سنہری ہوجائیں تو انہیں نکال لیں۔ بلینڈر میں بھنے ہوئے مسالے، تلے ہوئے پیاز اور لہسن ادرک ڈالیں، تھوڑا سا پانی ڈال کر مشین چلائیں۔ جب پیسٹ بن جائے تو اسے نکال لیں۔ کسی دیگچی میں تیل ڈال کر گرم کریں، اس میں رائی اور کلونجی ڈالیں، تھوڑی دیر بعد اس میں میتھی دانہ بھی ڈالیں، 2 سے 3 منٹ تک اسے بھونیں، پھر اس میں گریوی کے لیے بنایا جانے والا پیسٹ ڈالیں، ہلکی آنچ پر 5 سے 7 منٹ تک اسے پکائیں۔ اب اس میں سرخ مرچ پاؤڈر ڈالیں، 4 منٹ تک مزید پکائیں۔ جب تیل مسالے سے الگ ہونے لگے تو اس میں املی کا گودا ڈال دیں، ساتھ ہی تلی ہوئی مرچیں بھی شامل کردیں۔ جب مسالہ اچھی طرح مرچوں پر لگ جائے تو اس میں 100 ملی لیٹر پانی شامل کردیں۔ ہلکی آنچ پر پکائیں، جب ابال آجائے تو ڈھکن ڈھک کر مزید 5 منٹ پکائیں۔ اس کے بعد تمام مسالے چیک کرلیں۔ آخر میں تازہ ہرا دھنیا ڈالیں۔ سادے چاولوں یا روٹی کے ساتھ حیدرآبادی مرچوں کا سالن سرو کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تھائی چکن کری

اجزاء

مرغی	500 گرام
گاجر	دوعدد
بے بی کارن	100 گرام
پھول گوبھی	100 گرام
پھلی	50 گرام
مشروم	100 گرام
کوکونٹ ملک	50 گرام
دلیہ	80 گرام
دھنیا	8 پتے
چینی	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت

گریوی بنانے کے لیے

ہری مرچ	4 عدد
ہری پیاز	آدھی
ہرا دھنیا	ایک چوتھائی کپ
ادرک	دو انچ کا ٹکڑا
لہسن	5 عدد
لیمن گراس	3 شاخیں
ثابت دنیا	ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
جاوتری	ایک چوتھائی چائے کا چمچ

ترکیب:

گریوی بنانے والے تمام اجزا کو گرائنڈر میں ڈالیں، ساتھ ہی تھوڑا سا پانی ڈال کر پیس لیں۔ پیالے میں نکال لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں، اس میں تیار گریوی/کری پیسٹ ڈالیں اور چند منٹ تک پکائیں۔ پھر اس میں مرغی کے ٹکڑے ڈالیں، سب چیزوں کو مکس کرنے کے بعد اس میں آدھا کپ پانی اور نمک ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ جب مرغی کا پانی خشک ہو جائے اور وہ گل جائے تو کوکونٹ ملک، دلیہ، دو کپ پانی ڈالیں۔ پھر اس میں کٹی ہوئی سبزیاں ڈال کر پکنے دیں۔ تھوڑی دیر بعد اس میں تازہ دھنیا اور چینی ڈال کر مکس کریں۔ مسالوں کو چکھ لیں۔ اگر مرچیں یا نمک کم لگے تو حسب ضرورت ڈال دیں۔ سب چیزوں کو مکس کر کے سرونگ ڈش میں نکال لیں۔ تھائی چکن کری کو سادے چاولوں کے ساتھ تناول فرمائیں۔

ویجی ٹیبل لیمن سوپ

اجزاء

گاجر	ایک کپ
شملہ مرچ	ایک کپ
ہری پیاز	ایک کپ
زیتون	آدھا کپ
لیموں کا رس	دو کھانے کا چمچ
کالی مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
جو کا آٹا	2 کھانے کا چمچ
زیتون کا تیل	ایک کھانے کا چمچ
یخنی	2 گلاس
کڑی پتہ	4 عدد
نمک	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

کسی دیگچی میں تیل ڈال کر گرم کریں، اس میں جو کا آٹا ڈال کر ایک منٹ تک بھونیں، پھر اس میں گاجر، شملہ مرچ ڈال کر ایک منٹ تک پکائیں، اس میں چکن کی یخنی شامل کریں، ساتھ ہی لیموں کا رس، کالی مرچ اور نمک ڈالیں۔ پھر اس میں زیتون اور ہری پیاز شامل کر دیں۔ سب چیزوں کو مکس کر کے پیالے میں نکال لیں۔ ڈائٹ ویجی ٹیبل لیمن سوپ تیار ہے۔ اس سوپ کو ڈائٹنگ کرنے والی خواتین استعمال کریں۔ شیف فرح کے مطابق اس سوپ کو ایک ہفتے لگا تار پینے سے دو کلو تک وزن کم کیا جا سکتا ہے، تاہم ساتھ میں ورزش بھی ضروری ہے۔

☆☆☆......☆☆☆